مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ

ذات کا عرفان

الشیخ خواجہ شمس الدین عظیمی

نام کتاب:	ذات کا عرفان
مؤلف:	حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی صاحب
کمپوزنگ:	منور فیروز علوی پروسس (فیروز کمپوزنگ سنٹر، سمیع سنٹر اُردو بازار لاہور)
ٹائیٹل:	عدیل مسعود عظیمی
بااہتمام:	ساجد مقصود عظیمی
ناشر:	مکتبہ **عظیمیہ** اردو بازار لاہور
مطبع:	نواز پریس لاہور
قیمت:	100/ (صرف سو روپیہ)
تاریخ اشاعت:	17-10-2003

"انتساب"

اُس ذات

کے

نام

جو عرفان کے بعد

اللہ کو جانتی، پہچانتی

اور

دیکھتی ہے۔

''ترتیب وپیشکش''

اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے 1991ء میں مرشد کریم حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی مدظلہ تعالیٰ کی روحانی ڈائجسٹ میں تحریروں کوایک جگہ جمع کر کے ایک کتاب توجیہات کے نام سے آپ کی خدمت میں پیش کی۔ جو اللہ کے فضل کرم سے بہت زیادہ مقبول ہوئی اور دوستوں نے سوال جواب کے اس طریقہ کو بہت پسند کیا۔

اب پھر مرشد کریم کی تحریروں کوروحانی ڈائجسٹ سے اکٹھا کر کے آپ کے لئے کتاب ''ذات کاعرفان'' کے عنوان سے پیش خدمت ہے۔

میں اپنی اس کوشش میں کتنا کامیاب ہوا ہوں مجھے اس سے کوئی غرض نہیں میں نے شروع دن سے سلسلہ کی ترویج اور ترقی کے لئے اور انسانیت کی خدمت کے لئے اپنے آپ کو وقف کر رکھا ہے۔

مرشد کریم کی روشنی کواس روئے زمین پر پھیلانا ہے۔ اور میں یہ کام اُس وقت تک کرتا رہوں گا جب تک خود بھی اس روشنی کے اندر فنا ہو جاؤں اور آنے والی نسل مجھے خواجہ صاحب کا ایک دیوانہ قرار دے کر مجھے یاد کیا کرے گی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اور ذکر کیا کرو اپنے رب کے نام کا اور سب سے قطع تعلق کر کے اسی طرف متوجہ رہو۔

مرشد کریم حضرت خواجہ شمس الدین فرماتے ہیں کہ یہ آیت ہمیں مراقبہ کا اصول اور طریقہ بتاتی ہے۔ مراقبہ کے لئے دو باتیں بڑی واضع طور پر بتائی گئی ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا ذکر اور سب سے قطع تعلق کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو کر اُس کے ذکر میں مشغول ہو جانا۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے من عرف نفسه فقد عرفه ربه جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا۔ یہاں نفس سے مراد روح ہے۔ جو اپنی روح سے واقف ہو جاتا ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ کا عرفان حاصل ہو جاتا ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ کا عرفان حاصل ہو جاتا ہے۔ وہ اس بات سے واقف ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے سے کیا چاہتا ہے اور اس کی تخلیق کا مقصد کیا ہے ایسے بندہ کو اللہ تعالیٰ کی توجہ حاصل ہو جاتی ہے۔ بندہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اختیارات منتقل ہو جاتے ہیں۔

کائنات اس کے تابع ہو جاتی ہے اسلئے قرآن پاک میں 750 (ساڑھے سات سو) مرتبہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں تفکر کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔

جولوگ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں تفکر کرتے ہیں۔ان پر اللہ تعالیٰ کی مخفی حکمتیں منکشف ہوتی چلی جاتی ہیں۔دنیا کی تمام تر ترقی کا دارومدار اسی تفکر یعنی (Research) پر ہے۔ کائنات کے راز ان ہی لوگوں پر کھل رہے ہیں جنہوں نے تفکر کو اپنالیا ہے۔

تفکر ہی کے نتیجہ میں یہ ریل گاڑی ہوائی جہاز' موٹر کار' ٹیلی فون' ٹیلی ویژن کمپیوٹر وغیرہ وجود میں آئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا یہ قانون سب کے لیئے ہے۔جو بھی اس پر عمل کرے۔اسے فوائد حاصل ہو جائیں گے مسلم اور غیر مسلم کی اس میں تخصیص نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے مرشد کریم کے روحانی فیض سے سرفراز فرمائے۔

میں نیواں میرا مرشد خواجہ عظیمی اُچّا
تے میں سنگ اُچیاں دے ناں لائی
صدقے جاواں انہاں اُچیاں کولوں
جنہاں نیویاں نال نبھائی

میاں مشتاق احمد عظیمی
روحانی فرزند
حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی
مراقبہ ہال (جامعہ عظیمیہ)
آہلو روڈ نزد کاہنہ نولاہور
فون: 7243541

تاریخ اشاعت
17۔اکتوبر 2003ء

فہرست

باب اوّل

”ذات روح اور جسم“

سوال: من (ذات) اور روح اور جسم میں کیا فرق ہے؟

اگر جسم نہ ہو تو روح کے تقاضے کیا معنی رکھتے ہیں اور اگر روح نہ ہو تو جسم کی حیثیت صفر رہ جاتی ہے۔ یہ کہنا کہ من اور روح کا رشتہ حقیقی رشتہ اور جسم کا رشتہ فانی اور غیر حقیقی رشتہ ہے کس طرح تسلیم کی جا سکتا ہے۔ کیونکہ ہم پہلے جسم کو جانتے ہیں پھر روح سے واقف ہوتے ہیں اور روح سے جس قدر واقف ہیں اس کی حیثیت محض علمی ہے، مشاہداتی نہیں ہے جبکہ جسم کی حیثیت علمی بھی ہے اور مشاہداتی بھی۔

جواب: جسمانی وجود کا انحصار روح پر ہے۔ روح کا انحصار جسمانی وجود پر نہیں ہے اور اس کی مثال یہ ہے کہ روح کے بغیر آدمی کی حیثیت ایک لاش کے علاوہ کچھ نہیں۔ جب تک روح گوشت پوست کے وجود سے تعلق قائم رکھتی ہے گوشت پوست کے وجود میں حرکت موجود رہتی ہے۔ یہ گوشت پوست کا وجود دیکھتا بھی ہے، سنتا بھی ہے، چھوتا بھی ہے، بولتا بھی ہے تپش اور ٹھنڈک کی لہروں کو محسوس بھی کرتا ہے لیکن اگر روح اس گوشت پوست کے وجود سے اپنا رشتہ توڑ لیتی ہے تو یہ جسمانی وجود نہ سنتا ہے، نہ بولتا ہے، نہ محسوس کرتا ہے۔ روح کی عدم موجودگی میں کسی تیز دھار والے ہتھیار کی مدد سے جسم کا ایک ایک عضو کاٹ دیا جائے، الگ کر دیا جائے تو وجود کچھ بھی محسوس نہیں کرتا اور نہ اس کے اندر کوئی قوت مدافعت ہوتی ہے۔

زندگی کے اس عمل سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ انسان کی اصل روح ہے، گوشت پوست کا وجود نہیں ہے۔ اگر کوئی بندہ اپنے من، اپنی روح سے واقف ہے تو وہ اپنا دوست ہے اور اس کے برعکس اگر کوئی بندہ صرف اپنے گوشت پوست کے وجود کو سب کچھ سمجھتا ہے تو وہ اپنا دشمن ہے۔ جس شخص کے اندر روحانی زندگی کا کوئی تصور موجود نہ ہو من اس کا دشمن ہے۔ اگر کوئی بندہ من سے کوئی کثیف کام لینا چاہتا ہے تو من اس کی خدمت کرنے سے انکار نہیں

کرتا۔ وہ اسے مادیت اور ٹائم اسپیس کے جال میں جکڑ دیتا ہے اور اگر بندہ من سے روح کا سراغ چاہتا ہے تو من اسے ایک اچھے اور مخلص دوست کی طرح روحانی رشتوں سے متعارف کرا دیتا ہے اور من اسے نہ صرف بتا دیتا ہے بلکہ دکھا بھی دیتا ہے کہ روح پاک ہے۔ جسم کی ساری خوشیاں، جسم کی طرح عارضی ہیں اور روح چونکہ خود مستقل خوشی ہے اس لئے روحانی لوگ خوش رہتے ہیں۔ یہ مادی دنیا اور گوشت پوست کے جسم کی دنیا دوئی کی دنیا ہے۔ ابھی ہم سکھی ہیں اور چند لمحوں بعد ہم دکھی ہوتے ہیں۔ جو بات ہمارے لئے عزت کا باعث ہے وہی بات لمحہ بھر بعد ہمارے لئے بے عزتی بن جاتی ہے۔ دوئی کی اس مادی دنیا میں کسی چیز کو سمجھنا اسی وقت ممکن ہے جب ہم سکھ، دکھ، عزت، بے عزتی، سردی اور گرمی کے تضاد کو سمجھ لیں۔ جب تک ''میں'' مصیبت کر کے چکی کے دو پاٹوں میں نہیں پستا ''میں'' خوشی کو نہیں سمجھتا۔ اس تضاد سے گزرنے کے لئے مادی دنیا کی دوئی سے خود کو آزاد کرنا ہوگا۔ جب کوئی شخص مادی دنیا کی اس دوئی سے گزر کر خود شناسی کے علم کا طالب بن جاتا ہے تو ہر چیز کو ایک ہی نظر سے دیکھتا ہے خواہ وہ کنکر ہو، پتھر ہو یا سونا ہو۔ اور جب تک کوئی بندہ خود شناسی کے علم سے ناواقف رہتا ہے اس کا من بے چین اور بے قرار رہتا ہے۔ من کی بے چینی اور بے قراری دور کرنے کے لئے ایک مخصوص طرز فکر کو اپنانا ضروری ہے اور یہ طرز فکر آزاد طرز فکر ہے۔

یہ آزاد طرز فکر دراصل قلندر شعور ہے۔ من سے دوستی کا رشتہ مستحکم کرنے کے لئے قلندر شعور ہمیں راستہ دکھاتا ہے اور وہ راستہ یہ ہے کہ یہاں ہمارا نہ کوئی دشمن ہے نہ کوئی دوست ہے۔ ہم خود ہی اپنے دوست ہیں خود ہی اپنے دشمن ہیں۔ قلندر شعور جب حرکت میں آ جاتا ہے تو بندہ یہ دیکھتا ہے کہ ساری کائنات ایک اسٹیج ہے، ڈرامہ ہے۔ اس اسٹیج پر کوئی باپ ہے، کوئی ماں ہے، کوئی بچہ ہے، کوئی دوست ہے، کوئی دشمن ہے، کوئی گناہگار ہے، کوئی پاکباز ہے۔ جب یہ اسٹیج پر کام کرنے والے کردار اسٹیج سے اتر جاتے ہیں تو سب ایک ہو جاتے ہیں اور ان کے اوپر سے دنیا کی دوئی کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے۔

☆☆☆

''روشنی کی رفتار''

سوال: کتاب ''مراقبہ'' میں بتایا گیا ہے کہ مادی جسم میں اکثر اعمال کو ہمارا شعور محسوس نہیں کرتا اور نہ ہی ہمارا شعوری ارادہ ان کو کنٹرول کرتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ اعمال کہاں سے کنٹرول ہوتے ہیں؟ اس بات کی وضاحت بھی کر دیں کہ روشنی کی رفتار سے سفر کرنے سے کیا مراد ہے؟

جواب: تمام تجربات، مشاہدات اور محسوسات کا ماخذ ذہن ہے۔ خیالات ہمارے اختیار کے بغیر ذہن میں وارد ہوتے ہیں۔ کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرتا جب ذہن میں کوئی خیال نہ ہو۔ بھوک پیاس کا تقاضہ سونے جاگنے کا عمل، خوشی غمی اور دیگر جذبات، اولاد کی خواہش، پریشان کن وسوسے، جسمانی امراض اور نفسیاتی عوارض سب کے سب خیالات کے تابع ہیں۔

الہامی کتابیں بتاتی ہیں کہ خیالات کا ایک منبع ہے۔ خیالات کی گہرائی میں موجود نقطہ ذات منبع کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی سورس سے لاشمار اطلاعات (خیالات) ہر لمحہ، ہر آن نشر ہوتی رہتی ہیں۔ شعور ان اطلاعات کو ریسیو کرتا ہے اور معنوں کا تعین کرتا ہے۔ اور یہی اطلاعات آدمی کا علم و حافظہ بن جاتی ہیں۔

شعور کی مثال آئینہ ہے۔ روشنی آئینہ کی سطح سے ٹکرا کر منعکس ہوتی ہے لیکن اگر روشنی کی شعاعوں کے سامنے ٹرانسپرنٹ شیشہ رکھ دیا جائے تو روشنی اس میں سے گزر جاتی ہے اور انعکاس کا عمل واقع نہیں ہوتا۔ شعور اپنے علم و دلچسپی کی بدولت مخصوص روشنیوں کو جذب کرتا ہے۔ جن روشنیوں کو شعور جذب کرتا ہے وہ شعور کے پردے پر رک جاتی ہیں آدمی انہیں دیکھتا اور محسوس کرتا ہے۔ جو روشنیاں شعور کے پردے میں سے گزر جاتی ہیں آدمی ان سے لاعلم رہتا ہے۔

شعوری میکانزم کے پس پردہ ایک اور ایجنسی موجود ہے۔ شعور اسی ایجنسی کے زیر اثر کام کرتا ہے۔ زندگی ہر دور میں اس ایجنسی سے وابستہ رہتی ہے لیکن آدمی اس پر غور نہیں کرتا۔ اس لئے غور نہیں کرتا کہ زندگی ایک معمول کے تحت گزر رہی ہے۔ جذبات، خیالات اور تقاضوں کے زیر اثر ذہن ایک حالت سے دوسری حالت اور ایک کیفت سے دوسری کیفیت میں منتقل ہوتا رہتا

ہے۔خیالات کی یلغار سے انسان کو ان مقامات کا ادراک نہیں ہوتا جو اس کی اصل ہیں۔

زندگی کے مراحل اور روزمرہ کے معمولات پر غور کرنے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ایک بامعنی زندگی گزارنے کے لئے جن اجزاء کی ضرورت ہوتی ہے وہ یہیں کہیں سے فراہم ہوتے ہیں۔ مادی زندگی میں بے شمار صلاحیتیں کام کرتی ہیں لیکن آدمی صرف پانچ حواس سے واقف ہے۔ بصارت، سماعت، گفتار، شامہ اور لمس۔ ذہنی یکسوئی کے ساتھ منبع اطلاعات کی طرف متوجہ ہونے سے ایسی اطلاعات اور صلاحیتوں کا مشاہدہ ہوتا ہے جو عام طور پر حواس کی گرفت میں نہیں آتیں۔ زندگی کے بہت سے تجربات اور واقعات مادی حواس کے علاوہ آدمی کے اندر موجود ایسے ذرائع ادراک کا پتہ دیتے ہیں جن کو ماورائے ادراک حواس چھٹی حس، وجدان، ضمیر، اندرونی آواز، روحانی پرواز وغیرہ کا نام دیا جاتا ہے۔

علم روحانیت کے مطابق غیب میں لامتناہی روشنیاں موجود ہیں۔ ان ہی روشنیوں میں کہکشانی نظام، سماوی مخلوق، خلاء میں آبادیاں اور روحانی علوم و اسرار شامل ہیں۔ جب آدمی اپنے اندر متوجہ ہوتا ہے تو شعور کے آئینہ پر باطنی اطلاعات تصویریں بننے لگتی ہیں اور غیبی نقوش شعور کی گرفت میں آجاتے ہیں۔ انسان جب توجہ اور دلچسپی کے ساتھ کسی ایک نقطہ پر غور کرتا ہے تو غور وفکر اسے شعور کے پس پردہ لاشعور میں دھکیل دیتا ہے۔ اور شعوری میکانزم کے پس پردہ ایجنسی (لاشعور) سے وہ کسی حد تک واقف ہو جاتا ہے۔

ہم جو کچھ دیکھتے ہیں یا محسوس کرتے ہیں وہ ایسے عوامل کے دوش پر سفر کر رہا ہے جو بظاہر ہماری آنکھوں سے اوجھل ہیں لیکن ان کی موجودگی کے بغیر کوئی حرکت عمل میں نہیں آتی۔ موجودات کی ہر حرکت ایک دوسرے سے مربوط ہے۔ اور ہر آنے والے لمحے کی تعمیر پہلے لمحے پر قائم ہے۔ جبلی طور پر ہمارا حافظہ ہمیں کشش ثقل کا پابند رکھتا ہے۔ ہم وقت اور فاصلے کی پابندیوں میں صرف لمحہ حاضر کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ جن لمحات کا نام ماضی یا مستقبل رکھا جاتا ہے وہ ثانیہ حاضر میں شعور کی اسکرین پر جلوہ گر نہیں ہوتے۔ کائنات اور کائنات کے تمام اجزاء اور ان کے نقوش ایک ریکارڈ یا فلم کی شکل میں موجود ہیں۔ ہماری مادی نگاہ اس ریکارڈ کا

احاطہ نہیں کر سکتی لیکن ان نقوش کی موجودگی سے انکار ممکن نہیں ہے۔ رویا کی صلاحیت انسان کو مادی سطح سے ماوراء باتوں کی اطلاع فراہم کرتی ہے۔ یہ صلاحیت جب برسرِ عمل ہوتی ہے ماضی، مستقبل دوری نزدیکی بے معنی ہو جاتی ہے۔

انسان کے اندر جو صلاحیتیں کام کرتی ہیں وہ تین دائروں میں مظہر بنتی ہیں۔ اس کو اس طرح بھی کہا جا سکتا ہے آدمی کے تین جسم ہیں۔ مادی جسم، روشنی کا بنا ہوا جسم اور نور سے بنا ہوا جسم۔ یہ تینوں جسم بیک وقت متحرک رہتے ہیں۔ لیکن مادی جسم (شعور) صرف مادی حرکات کا علم رکھتا ہے۔ روشنی اور نور کے جسم کی تحریکات کو شعور محسوس نہیں کرتا۔ روشنی کے جسم کی رفتار مادی جسم سے ساٹھ ہزار گنا زیادہ ہے۔ نور کا جسم روشنی کے جسم سے ہزاروں گنا تیز سفر کرتا ہے۔

روحانی استاد کی زیرنگرانی سالک کی ذہنی استعداد میں بتدریج اضافہ ہوتا ہے اور سالک کا شعور اس قابل ہو جاتا ہے کہ روشنی کی رفتار سے متحرک جسم کی تحریکات اس کے دائرہ ادراک میں آجاتی ہیں۔ یہ بات واضح کر دینی ضروری ہے کہ یہاں روشنی سے مراد وہ روشنی نہیں ہے جو ہمیں نظر آتی ہے بلکہ یہ اس روشنی کا تذکرہ ہے جو ظاہری آنکھوں سے نظر نہیں آتی۔ اس طرح جب شعوری کیفیات نورانی دنیا میں جذب ہو جاتی ہیں تو سالک نور کے جسم اور اس کی تحریکات سے واقف ہو جاتا ہے۔

☆☆☆

”ٹیلی پیتھی کیا ہے“

سوال: آپ نے ٹیلی پیتھی کا ابتدائی تعارف بہت خوبصورت انداز میں کر دیا ہے۔ درخواست ہے کہ ٹیلی پیتھی کے قانون اور اس کی شروعات کے بارے میں بھی کچھ لکھئے۔ ماورائی علوم سیکھنے کے لئے تصور کو ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے تصور کی صحیح تعریف کیا ہے۔ کیا خود کو ترغیبات دینا کہ ہم یہ ہیں ہم وہ ہیں، ہم اس آب وگل کی دنیا میں موجود ہیں یا غیب کی دنیا میں قیام پذیر ہیں۔ ہم یہ دیکھ رہے ہیں وہ دیکھ رہے وغیرہ وغیرہ تصور ہے یا تصور سے کچھ اور مراد ہے۔ کیا غیب منکشف کرنے والے علوم کا ایک اور ایک دو کی نوح کوئی نصاب نہیں بنایا جا سکتا ان علوم میں واقعہ، سانس کی مشق ارتکاز توجہ کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے۔

اب تک ٹیلی پیتھی سے متعلق جتنی کتابیں مطالعہ میں آئی ہیں۔ ان میں ہدایت کی گئی ہے کہ مشقیں شمال کی طرف منہ کر کے کی جائیں۔ آپ ہمیں بتائیں کہ شمال رُخ بیٹھنا کیوں ضروری ہے۔

ٹیلی پیتھی (انتقال افکار و خیالات) کا علم آج کی دنیا میں ایک سائنس ٹیکنالوجی ہے۔ اس علم کے ذریعہ دوسروں کے خیالات معلوم کر لئے جاتے ہیں اور اپنے خیالات دوسروں تک پہنچا دیئے جاتے ہیں۔ اس کی مذہبی اور روحانی حیثیت کیا ہے۔

جواب: روزمرہ کا مشاہدہ یہ ہے کہ ہم جب کسی چیز کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو وہ چیز یا اس کے اندر معنویت ہمارے اوپر آشکار ہو جاتی ہے۔ کوئی چیز ہمارے سامنے ہے۔ لیکن ذہنی طور پر ہم اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے تو وہ چیز ہمارے لئے بسا اوقات کوئی حیثیت نہیں رکھتی اس کی مثال یہ ہے کہ ہم گھر سے دفتر جانے کے لئے ایک راستہ اختیار کرتے ہیں۔ جب ہم گھر سے چلتے ہیں تو ہمارے ذہن کی مرکزیت صرف دفتر ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہ ہمیں وقت مقررہ پر دفتر پہنچنا ہے اور وہاں اپنی ذمہ داریاں پوری کرنی ہیں۔ اس راستہ میں بے شمار چیزیں ہمارے سامنے آتی ہیں اور انہیں ہم دیکھتے ہیں۔ لیکن دفتر پہنچنے کے بعد اگر کوئی صاحب ہم سے سوال

کریں کہ راستہ میں آپ نے کیا کچھ دیکھا ہے تو اس بات کا ہمارے پاس ایک ہی جواب ہوگا کہ ہم نے دھیان نہیں کیا۔ حالانکہ چیزیں سب نظر کے سامنے سے گزریں۔ لیکن چونکہ کسی بھی چیز میں ذہنی مرکزئیت قائم نہیں تھی۔ اس لئے حافظہ پر اس چیز کا نقش مرتب نہیں ہوا۔ قانون یہ بنا کہ جب ہم کسی چیز کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ تو وہ چیز اور اس چیز کے اندر معنویت ہمارے اوپر منکشف ہوتی ہے ہم کوئی کتاب پڑھتے ہیں جو بہت دلچسپ ہے۔ دلچسپی کی بناء پر کئی گھنٹے گزر جاتے ہیں۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہم نے اس کتاب کا مطالعہ چار پانچ گھنٹے کیا ہے تو ہمیں یقین نہیں آتا۔ لیکن چونکہ گھڑی ہمارے سامنے ہوتی ہے۔ اس لئے ہم یقین کرنے پر مجبور ہیں۔ اس کے برعکس ایک ایسی کتاب آپ پڑھتے ہیں جس کا مضمون آپ کی دلچسپی کے برعکس ہے۔ تو پانچ دس منٹ کے بعد طبیعت پر بوجھ محسوس ہونے لگتا ہے اور بالآخر ہم وہ کتاب چھوڑ دیتے ہیں اس مثال سے دوسرا قانون یہ بنا کہ ذہنی مرکزئیت کیساتھ ساتھ اگر دلچسپی بھی قائم ہو جائے۔ تو کام آسان ہو جاتا ہے جہاں تک دلچسپی کا تعلق ہے اس کی حدود اگر متعین کی جائیں تو وہ دو رُخ پر قائم ہیں جن کو عرف عام میں ذوق اور شوق کہا جاتا ہے۔ یعنی ایک طرف کسی چیز کی معنویت کو تلاش کرنے کی جستجو ہے۔ اور دوسری طرف اس جستجو کے نتیجہ میں کوئی چیز حاصل کرنے کا شوق ہے۔

ذوق اور شوق کے ساتھ جب کوئی بندہ کسی راستہ کو اختیار کرتا ہے وہ راستہ دین کا ہو یا دنیا کا اس کے نتائج مثبت مرتب ہوتے ہیں۔ ٹیلی پیتھی کی مشقوں میں تصور کا منشا یہی ہے کہ آدمی ذوق وشوق کے ساتھ ذہنی مرکزئیت کے ساتھ باطنی علم حاصل کرے چونکہ یہ علم کتابی علم نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس علم کو سیکھنے کے لئے ایسے طریقے اختیار کرنا لازم ہیں جو مروّجہ طریقوں سے الگ ہوں۔

روح نور ہے روشنی ہے روحانی علوم بھی نور ہیں روشنی ہیں۔ نور یا لہروں کا عالم ظاہر ہے کہ نور یا لہروں کے ذریعہ ہی منتقل ہو سکتا ہے ہم جب نور کا تصور کرتے ہیں تو نور کی لہریں یعنی علم روحانیت کی روشنیاں ہمارے ذوق شوق کے مطابق ہمارے اندر منتقل ہونے لگتی ہیں۔

تصور کی مشقوں سے بھر پور فوائد حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ صاحب مشق جب آنکھیں بند کر کے تصور کرنے بیٹھے تو وہ خود سے اور ماحول سے بے نیاز ہو جائے۔ اتنا بے نیاز کہ اس کے اوپر سے بتدریج ٹائم اور اسپیس کی گرفت ٹوٹ جائے۔ یعنی اس تصور میں اتنا انہماک ہو جائے کہ وقت گزرنے کا مطلق احساس نہ رہے کتاب کا دلچسپ مضمون پڑھنے کی مثال پیش کی جا چکی ہے۔

تصور کے ضمن میں اسباق کو سمجھنا بہت ضروری ہے کہ اگر آپ کا نور کا تصور کر رہے ہیں تو آنکھیں بند کر کے کسی خاص قسم کی روشنی کو دیکھنے کی کوشش نہ کریں بلکہ صرف نور کی طرف دھیان قائم کریں نور جو کچھ بھی ہے اور جس طرح بھی ہے از خود آپ کے سامنے آئے گا۔ اصل مدعا کسی ایک طرف دھیان کر کے ذہنی یکسوئی حاصل کرنا اور منتشر خیالی سے نجات پانا ہے جس کے بعد باطنی علم کڑی در کڑی ذہن پر منکشف ہونے لگتا ہے۔ تصور کا مطلب اس بات سے کافی حد تک پورا ہوتا ہے جس کو عرف عام میں بے خیال ہونا کہا جاتا ہے۔ ہم اگر کھلی یا بند آنکھوں سے کسی چیز کا تصور کرتے ہیں اور تصور میں خیالی تصویر بنا کر اسے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں یہ عمل ذہنی یکسوئی کے احاطہ میں نہیں آتا۔ ذہنی یکسوئی سے مراد یہ ہے کہ آدمی شعوری طور پر دیکھنے اور سننے کے عمل سے بے خبر ہو جائے۔

قانون یہ ہے کہ آدمی کسی لمحے بھی حواس سے ماورا نہیں ہو سکتا۔ جب ہمارے اوپر شعوری حواس کا غلبہ نہیں رہتا تو میکانکی آٹو میٹک طور پر لاشعوری حواس متحرک ہو جاتے ہیں اور لاشعوری حواس سے متعارف ہونا ہی ماورائی علوم کا عرفان ہے۔

آدمی کے اندر دو دماغ کام کرتے ہیں ایک دماغ ظاہری حواس بناتا ہے اور دوسرا دماغ ظاہری حواس کے پس پردہ کام کرنے والی اس ایجنسی کی تحریکات کو منظر عام پر لاتا ہے جو ظاہر حواس کے الٹ ہیں۔ جن حواس سے ہم کشش ثقل میں مقید چیزوں کو دیکھتے ہیں۔ اس کا نام شعور ہے اور جن حواس میں ہم کشش ثقل سے آزاد ہو جاتے ہیں اس کا نام لاشعور ہے شعور اور لاشعور دونوں لہروں پر قیام پذیر ہیں۔ شعوری حواس میں کام کرنے والی لہریں مثبت

(Triangle) ہوتی اور لاشعوری حواس میں کام کرنے والی لہریں (Circle) حصولی ہیں۔ سائنسدان یہ سمجھنے میں کامیاب ہو گئے ہیں کہ زمین اور زمین کے اوپر موجود ہر شے دراصل لہروں کا مجموعہ ہے۔

زمین کی حرکت دو رُخ پر قائم ہے ایک رُخ کا نام طولانی حرکت ہے اور دوسرے رخ کا نام محوری حرکت ہے یعنی زمین جب اپنے مدار پر سفر کرتی ہے۔ تو طولانی گردش میں ترچھی ہو کر چلتی ہے اور محوری گردش میں لٹو کی طرح گھومتی ہے ہر مظہر دو رخ پر قائم ہے ایک رخ ہمیں گوشت کی آنکھ سے نظر آتا ہے اور دوسرا رخ ہم باطنی آنکھ سے مشاہدہ کرتے ہیں یہ دو رخ در اصل دو حواس ہیں۔ حواس کے ایک رخ کا نام شعور اور دوسرے کا نام لاشعور ہے شعوری حواس میں ہم ٹائم اسپیس میں قید ہیں اور لاشعوری حواس ہمیں ٹائم اسپیس سے آزاد کر دیتے ہیں یہ دونوں حواس ایک ورق کی طرح ہیں ورق کے دونوں صفحات پر ایک ہی تحریر لکھی ہوئی ہے فرق صرف یہ ہے کہ ورق کے ایک صفحہ پر عبارت ہمیں روشن اور واضح نظر آتی ہے اور دوسرے صفحہ پر تحریر دھندلی اور غیر واضح نظر آتی ہے۔

ہم جب کوئی ماورائی چیز دیکھتے ہیں تو دراصل یہ صفحہ کی دھندلی تحریر کا عکس ہوتا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ وہ نظر جس کو تیسری آنکھ کہا جاتا ہے کھل جاتی ہے چونکہ اس طرح دیکھنا ہماری روزمرہ دیکھنے کی عادت کے خلاف ہے اس لئے شعور پر چوٹ پڑتی ہے اس عادت کو معمول پر لانے کے لئے ہمیں شعوری حواس کے ساتھ لاشعوری حواس کی طرف متوجہ ہونا پڑتا ہے جیسے جیسے ہم شعوری حواس میں دیکھنے کے قابل ہوتے ہیں۔ شعور کی طاقت میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا ہے زمین اپنے مدار پر طولانی اور محوری گردش میں چل رہی ہے۔ طولانی گردش (Triangle) ہے اور محوری گردش دائرہ (Circle) ہے ہماری زمین پر تین مخلوق آباد ہیں انسان' جنات اور ملائکہ عنصری انسان کی تخلیق میں بحیثیت گوشت پوست مثلث غالب ہے اس کے برعکس جنات میں دائرہ غالب ہے اور فرشتوں کی تخلیق میں جنات کے مقابلہ میں دائرہ زیادہ غالب ہے انسان کے بھی دو رخ ہیں غالب مثلث اور مغلوب رخ دائرہ

جب کسی بندہ پر مثلث کا غلبہ کم ہو جاتا ہے اور دائرہ غالب آ جاتا ہے تو وہ جنات فرشتوں اور دوسرے سیاروں میں آباد مخلوق سے متعارف ہو جاتا ہے بلکہ ان سے گفتگو بھی کر سکتا ہے ٹیلی پیتھی اور ماورائی علوم حاصل کرنے کے لئے شمال کی سمت اس لئے متعین کی جاتی ہے کہ شمال جنوب میں سفر کرنے والی تخلیقی لہروں کا وزن صاحب کے شعور پر کم سے کم پڑے اس کی مثال یہ ہے کہ ایک آدمی دریا میں اپنے ارادہ سے اترتا ہے تو اس کے حواس معطل نہیں ہوتے لیکن اگر کسی آدمی کو بے خبری میں دریا میں دھکا دے دیا جائے تو اس کے حواس غیر متوازن ہو سکتے ہیں خود اختیاری عمل سے انسان بڑی سے بڑی افتاد کا ہنستے کھیلتے مقابلہ کر لیتا ہے جبکہ ناگہانی طور پر کسی افتاد سے وہ پریشان ہو جاتا ہے۔

روحانی علم اس کا نام کچھ بھی ہو۔ ٹیلی پیتھی ہو۔ روحانیت ہو۔ آدمی کے اندر روحانی صلاحیتوں کا انکشاف ہے اور روحانی صلاحیتوں کا یہ انکشاف آدمی کو انسان بنا دیتا ہے ایسا انسان جو اشرف المخلوقات ہے یاد رہے آدمی بھی ایک حیوان ہے۔ لیکن جب اس کے اندر انسانیت آ جاتی ہے تو یہ اشرف بن جاتا ہے اور تمام مذاہب کی یہی کوشش رہی ہے کہ آدمی کو انسانیت کے درجہ پر فائز کر دیا جائے۔

''دنیا جیسے جیسے ترقی کر رہی ہے۔ اسی مناسبت سے اولاد آدم نئی نئی مصیبتوں' پریشانیوں اور پیچیدہ بیماریوں کی ختم نہ ہونے والی دلدل میں گرفتار ہو رہا ہے۔ جدید یورپ اب تیزی کے ساتھ روحانی مسرت کے پرسکون لمحات کی تلاش میں سرگرداں ہے'' (لائف)

ہم جب کسی سخت چیز کو دیکھتے ہیں تو ہمیں اس چیز کی سختی کا علم ہو جاتا ہے۔ حالانکہ ہمارے دماغ کے اوپر وہ سخت چیز ٹکراتی نہیں ہے۔ سائنس کے نقطۂ نظر اور علوم کی روشنی میں ہر شے دراصل شعاعوں یا لہروں مجموعہ کا نام ہے۔ جب ہم کسی سخت چیز کی طرف کسی بھی طریقہ سے متوجہ ہوتے ہیں تو اس سخت چیز کے اندر کام کرنے والی لہریں ہمارے دماغ کو اپنی حیثیت سے باخبر کر دیتی ہیں۔ باخبری کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ پتھر یا کسی دھات کو چھو کر ہی محسوس کیا جائے۔

غور طلب بات یہ ہے کہ شعاع یا لہر اپنے اندر سختی رکھتی ہے اور نہ وزن پھر ہمیں یہ علم کیسے ہو جاتا ہے کہ یہ پتھر ہے یا لوہا ہے یا یہ دیوار ہے؟۔

حقائق یہ ہیں کہ ہر شے الگ اور معین مقداروں کے ساتھ موجود ہے۔ لہروں یا شعاعوں کی یہ معین مقداریں ہی ہر شے کو ایک دوسرے سے الگ کرتی ہیں اور ہر شے کی لہریں یا شعاعیں ہمیں اپنے موجود ہونے کی اطلاع فراہم کرتی ہیں۔ زیادہ وضاحت کے لئے عرض ہے کہ ہر موجود شے دراصل لہروں یا شعاعوں کا دوسرا نام ہے اور ہر شے کی لہر یا شعاع ایک دوسرے سے الگ ہے۔ اگر کسی طریقہ سے ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ انسان' حیوانات' نباتات اور جمادات میں کس کس قسم کی لہریں کام کرتی ہیں اور ان لہروں پر کس طرح کنٹرول حاصل کیا جا سکتا ہے تو ہم ان چیزوں کو متاثر کر سکتے ہیں۔ قانون قدرت کے مطابق لہر یا شعاع دراصل ایک جاری و ساری حرکت ہے اور ہر شے کے اندر لہروں یا شعاعوں کی حرکت کا ایک فارمولا ہے۔

ہمارے اردگرد بہت سی آوازیں پھیلی ہوتی ہیں۔ یہ آوازیں بھی لہروں کی شکل میں موجود ہیں۔ ان کے قطر (Wavelenght) بہت چھوٹے یا بہت بڑے ہوتے ہیں۔ سائنس دانوں نے اندازہ لگایا ہے کہ چار سو قطر سے نیچے کی آوازیں آدمی نہیں سن سکتا۔ اس طرح ایک ہزار چھ سو قطر سے زیادہ آوازیں بھی عام سماعت سے باہر ہوتی ہے۔ چار سو قطر سے نیچے کی آوازیں برقی رو (لہر) کے ذریعے سنی جا سکتی ہیں۔ اور ایک ہزار چھ سو قطر سے اوپر کی آوازیں بھی برقی رو کے ذریعہ سننا ممکن ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

''تم ہماری سماعت سے سنتے ہو۔ ہماری بصارت سے دیکھتے ہو۔''

تفکر کا مقام ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ کی سماعت اور بصارت کو نور' روشنی لہر کے علاوہ کوئی اور نام دیا جا سکتا ہے آنکھ کے پردوں پر جو عمل ہوتا ہے وہ برقی رو یا لہر سے بنتا ہے آنکھ کی حس جس قدر تیز ہوتی ہے۔ اتنا ہی وہ برقی رو کو زیادہ قبول کرتی ہے اور اتنا ہی رو یا لہر میں زیادہ امتیاز کر سکتی ہے۔ آنکھیں باہر کے عکس کے ذریعہ دماغ کو متاثر کرتی ہیں۔ ہرا رنگ یا ہریالی

دیکھ دیکھ کر ہمیں سکون محسوس ہوتا ہے۔ اس کے برعکس تیز روشن آگ کو دیکھ کر ہمارے حواس گرانی محسوس کرتے ہیں۔ باہر کے عکس سے حواس تازہ یا افسردہ ہو جاتے ہیں۔ کمزور ہو جاتے ہیں یا طاقتور ہو جاتے ہیں۔ ان ہی باتوں پر دماغی کام کا انحصار ہے۔

ٹیلی پیتھی (Telepathy) میں ایسے علوم سے بحث کی جاتی ہے جو حواس کے پس پردہ شعور سے ہٹ کر کام کرتے ہیں۔ یہ علم ہمیں بتاتا ہے کہ ہمارے حواس کی گرفت محض مفروضہ ہے۔ ہم یہ بتا چکے ہیں کہ سولہ سو قطر سے اوپر کی آوازیں یا چار سو قطر سے نیچے کی آوازیں لہروں کے ذریعہ سنی جا سکتی ہے اور یہ اس لئے ممکن ہے کہ ہمارے تمام حواس اور خیالات بجائے خود برقی رو یا لہر ہیں۔ اگر ہمارے خیالات برقی رو سے الگ کوئی چیز ہوتو تو برقی رو کو قبول ہی نہ کرتے۔ ٹیلی پیتھی میں یہ خیالات جو دراصل برقی رو ہیں دوسرے آدمی کو منتقل کئے جاتے ہیں۔ خیالات منتقل کرنے کے لئے اس بات کی ضرورت پیش آتی ہے کہ یہ برقی رو کسی ایک ذرہ پر یا کسی ایک سمت میں یا کسی ایک رخ پر مرکوز ہو جائے۔ اگر یہ رو تھوڑی دیر بھی مرکوز رہے تو دور دراز تک اپنے اثرات مرتب کرتی ہے۔ انسان کو اور ان چیزوں کو جو ذی روح نہیں سمجھی جاتیں۔ ان کو اس رو سے متاثر کیا جاتا ہے۔

انسان دو تقاضوں سے مرکب اور محرک ہے ایک تقاضا جبلی ہے اور دوسرا فطری جبلی تقاضے پر ہم بااختیار ہیں اور فطری تقاضے پر ہمیں کسی حد تک تو اختیار حاصل ہے مگر اس تقاضے کو کلیتاً رد کرنے پر قدرت نہیں رکھتے ایک ماں اپنے بچے سے محبت کرتی ہے۔ بچہ مر جاتا ہے۔ ماں رو دھو کر بالآخر صبر کر لیتی ہے عرف عام میں ماں کی محبت کو فطری تقاضا کہا جاتا ہے ہم جس قانون کو بیان کر رہے ہیں اس کی روشنی میں ماں کی محبت فطری نہیں جبلی ہے۔ ماں کی محبت کو اگر فطری جذبہ قرار دے دیا جائے تو بچہ کی جدائی کے غم میں ماں اپنے بچہ کے ساتھ ہی مر جائے گی یا بچہ کی یاد اس کے حواس کا شیرازہ بکھیر دے گی۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا۔

اس کے برعکس فطری تقاضے بھوک اور نیند کے سلسلہ پر غور کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ آدمی بھوک رفع کرنے کے لئے خوراک میں تو کمی بیشی کر سکتا ہے لیکن یہ ممکن نہیں

ہے کہ وہ کبھی کچھ نہ کھائے یا پیاس بجھانے کے لئے کبھی پانی نہ پئے۔ یا ساری عمر سوتا رہے یا ساری زندگی جاگتا رہے۔ ان حقائق کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جذبات فطری ہوں یا جبلی، بہر کیف انکا تعلق خیالات سے ہے۔ جب تک کوئی تقاضا خیال کی صورت میں جلوہ گر نہیں ہوگا۔ ہم اس سے بے خبر رہیں گے۔ ہمارے اوپر حواس (بصارت، سماعت، گویائی، لمس) کا انکشاف نہیں ہوگا۔ اور خیال خارجی شے نہیں (Inner) میں قیام پذیر ہے۔

یہ خواہش فطری ہے کہ ہم معلوم کریں کہ خیالات کہاں سے آتے ہیں۔ کیوں آتے ہیں اور خیالات کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے مل کر کس طرح زندگی بنتے ہیں؟

کہکشانی نظاموں اور ہمارے درمیان بڑا مستحکم رشتہ ہے۔ پے در پے جو خیالات ہمارے ذہن میں آتے ہیں۔ وہ دوسرے نظاموں اور ان آبادیوں سے ہمیں وصول ہوتے رہتے ہیں۔ یہ خیالات روشنی کے ذریعہ ہم تک پہنچتے ہیں۔ روشنی کی چھوٹی بڑی شعاعیں خیالات کے بے شمار تصویر خانے لے کر آتی ہیں۔ ان ہی تصویر خانوں کو ہم اپنی زبان میں، توہم، تخیل، تصور اور تفکر کا نام دیتے ہیں۔ جس قدر خیالات ہمارے ذہن میں دور کرتے رہتے ہیں ان کا تعلق قریب اور دور کی ایسی اطلاعات سے ہوتا ہے جو کائنات میں کہیں نہ کہیں موجود ہیں۔ یہ اطلاعات لہروں کے ذریعہ ہم تک پہنچتی ہیں۔ اب ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ ہم تمام کہکشانی نظاموں اور ان میں آباد بستیوں سے ٹیلی پیتھی کے ذریعہ منسلک ہیں کیونکہ ٹیلی پیتھی خیالات کی منتقلی کا دوسرا نام ہے۔

ٹیلی پیتھی میں پہلے پہلے یہ مشق کرائی جاتی ہے کہ اشیاء ہمارے اندر موجود ہیں۔ مشق کی تکمیل کے بعد کوئی صاحب مشق یہ دیکھنے لگتا ہے کہ فلاں چیز میرے اندر موجود ہے اور مسلسل توجہ کے بعد اس چیز پر نظر ٹھہر جاتی ہے ارتکاز کے لئے سانس کی مشق اور مراقبہ کرایا جاتا ہے۔

نگاہ یا بصارت کسی شے پر مرکوز ہو جاتی ہے تو اس شے کو اپنے اندر جذب کر کے دماغ کی اسکرین پر لے آتی ہے۔ اور دماغ اس چیز کو دیکھتا اور محسوس کرتا ہے اور اس میں معانی پہناتا ہے نظر کا قانون یہ ہے کہ جب وہ کسی شے کو اپنا ہدف بناتی ہے تو دماغ کی اسکرین پر اس شے

کا عکس پندرہ سیکنڈ تک قائم رہتا ہے' اور پلک جھپکنے کے عمل سے یہ آہستہ آہستہ مدہم ہو کر حافظہ میں چلا جاتا ہے اور دوسرا عکس دماغ کی اسکرین پر آ جاتا ہے اگر نگاہ کو کسی ہدف پر پندرہ سیکنڈ سے زیادہ مرکوز کر دیا جائے تو ایک ہی ہدف بار بار دماغ کی اسکرین پر وارد ہوتا رہتا ہے اور حافظہ پر نقش ہوتا رہتا ہے مثلاً ہم کسی چیز کو پلک جھپکائے بغیر مسلسل ایک گھنٹہ تک دیکھتے رہیں تو اس عمل سے نگاہ قائم ہونے کا وصف دماغ میں پیوست ہو جاتا ہے۔ اور دماغ میں یہ پیوستگی' ذہنی انتشار کو ختم کر دیتی ہے۔ ہوتے ہوتے اتنی مشق ہو جاتی ہے کہ شے کی حرکت صاحب مشق کے اختیار اور تصرف میں آ جاتی ہے۔ اب وہ شے کو جس طرح چاہے' حرکت دے سکتا ہے مطلب یہ ہے کہ نگاہ کی مرکزیت کسی آدمی کے اندر قوت ارادی کو جنم دیتی ہے اور قوت ارادی سے انسان جس طرح چاہے کام لے سکتا ہے۔

ٹیلی پیتھی (Telepathy) کا اصل اصول بھی یہی ہے کہ انسان ایک نقطہ پر نگاہ کو مرکوز کرنے پر قادر ہو جائے۔ نگاہ کی مرکزیت حاصل کرنے میں کوئی ارادہ بھی شامل ہوتا ہے۔ جیسے جیسے نگاہ کی مرکزیت پر عبور حاصل ہوتا ہے۔ اسی مناسبت سے ارادہ مستحکم اور طاقت ور ہو جاتا ہے۔ ٹیلی پیتھی جاننے والا کوئی شخص جب یہ ارادہ کرتا ہے کہ اپنے خیال کو دوسرے آدمی کے دماغ کی اسکرین پر منعکس کر دے تو اس شخص کے دماغ میں یہ ارادہ منتقل ہو جاتا ہے۔ وہ شخص اس ارادہ کو خیال کی طرح محسوس کرتا ہے اگر وہ شخص ذہنی طور پر یکسو ہے تو یہ خیال' تصور اور احساسات کے مراحل سے گذر کر مظہر بن جاتا ہے۔ اگر اسی ارادہ کو بار بار منتقل کیا جائے تو دماغ اگر یکسو نہ بھی ہو تو یکسو ہو کر اس خیال کو قبول کر لیتا ہے اور ان کا توجہ سے عملی جامہ پہن کر منظر عام پر آ جاتا ہے۔

ٹیلی پیتھی' محض خیالات کو دوسروں تک منتقل کرنے کا علم ہی نہیں ہے بلکہ اس علم کے ذریعہ ہم اپنی زندگی کا مطالعہ کر کے زندگی کو خوش آئند تصورات سے لبریز کر سکتے ہیں۔ زندگی خواہشات' تمناؤں اور آرزوؤں کے تانے بانے پر قائم ہے۔

نوٹ: ٹیلی پیتھی کی مشق استاد کی نگرانی کے بغیر نہیں کرنی چاہیے۔ کیونکہ استاد کی نگرانی کے بغیر دماغ پر غلط اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

"خواب کا علم"

سوال: عام طور پر جب ہم خواب دیکھتے ہیں تو ٹکڑوں میں دیکھتے ہیں' کبھی کوئی سین (Scene) چل رہا ہوتا ہے تو کبھی کوئی۔ انسان خواب میں کیے ہوئے اعمال یا دیکھے گئے واقعات میں ترتیب کیوں قائم نہیں کر سکتا؟

جواب: جب حضرت یوسف علیہ السلام کو قید کیا گیا اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ دو نوجوان اور بھی قید خانہ میں داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک بادشاہ کا ساقی تھا اور دوسرا شاہی باورچی خانے کا داروغہ ایک روز یہ دونوں نوجوان حضرت یوسف علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے' ساقی نے کہا میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں شراب بنانے کے لیے انگور نچوڑ رہا ہوں داروغہ نے کہا' میں نے خواب دیکھا ہے کہ میرے سر پر روٹیوں کا خوان رکھا ہوا ہے اور اس خوان میں سے پرندے روٹی کھا رہے ہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا۔ میرے رب نے جو علوم مجھے عطا فرمائے ہیں' ان میں سے ایک علم خواب کی تعبیر کا علم ہے اور تمہارے خواب کی تعبیر یہ ہے۔ جس نے یہ خواب دیکھا ہے کہ وہ شراب کے لیے انگور نچوڑ رہا ہے' بادشاہ اس کو آزاد کر کے اس کے عہدے پر بحال کر دے گا۔

جس نے روٹیوں والا خواب دیکھا ہے' اس کو پھانسی دے دی جائے گی اور اس کو پرندے نوچ نوچ کر کھا جائیں گے' اور یہ باتیں تمہارے لیے مقدر ہو چکی ہیں۔

توراۃ پیدائش باب ۴۰۔ آیت ۱

علم لدنی کے علوم میں ایک علم خواب ہے جو خواب کی پوری پوری تشریح کرتا ہے اور اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ انسان خواب کیوں دیکھتا ہے خواب کے اندر کیے ہوئے اعمال اور دیکھے ہوئے واقعات میں تخلیق کا کونسا قانون کام کر رہا ہے۔ آج کی نشست میں ہم اس کا

اجمالی بیان کر رہے ہیں۔

لوح محفوظ کا قانون ہمیں بتاتا ہے کہ ازل سے ابد تک صرف لفظ کی کارفرمائی ہے' حال' مستقبل اور ازل سے ابد تک کا درمیانی وقفہ لفظ کے علاوہ کچھ نہیں ہے' کائنات میں جو کچھ ہے وہ سب کا سب اللہ تعالیٰ کا فرمایا ہوا لفظ ہے اور یہ لفظ اللہ تعالیٰ کا اسم ہے' اسی اسم کی مختلف طرزوں سے نئی تخلیق وجود میں آتی رہتی ہے اور آتی رہیں گی' اللہ تعالیٰ کا اسم ہی پوری کائنات کو کنٹرول کرتا ہے' لفظ یا اسم کی بہت سی قسمیں ہوتی ہیں' ہر قسم کے اسم یا الفاظ کا ایک سردار ہوتا ہے اور وہی سردار اسم اپنی قسم کے تمام اسماء کو کنٹرول کرتا ہے' یہ سردار اسم بھی اللہ تعالیٰ کا اسم ہوتا ہے اور اسی کو اسم اعظم کہتے ہیں' الفاظ اسماء کی حیثیت روشنیوں کے علاوہ کچھ نہیں ہے' ایک طرز کی جتنی روشنیاں ہیں ان کو کنٹرول کرنے والا اسم بھی ان ہی روشنیوں سے مرکب ہوتا ہے اور یہ اسماء کائنات میں موجود اشیاء کی تخلیق کے اجزاء ہوتے ہیں' مثلاً انسان کے اندر کام کرنے والے تمام تقاضے اور پورے حواس کو قائم رکھنے والا اسم ان سب کا سردار ہوتا ہے اور یہی اسم اعظم کہلاتا ہے۔

نوع جنات کے لیے الگ اسم اعظم ہے نوع انسان کے اوپر الگ اسم اعظم کی حکمرانی ہے' نوع نباتات کے لیے الگ' نوع جمادات کے لیے الگ اور نوع فرشتوں کے لیے الگ اسم اعظم ہے' کسی نوع سے متعلق اسم اعظم کو جاننے والا صاحب علم اس نوع کی کامل طرزوں تقاضوں اور کیفیات کا علم رکھتا ہے۔

انسان کے اندر پورے تقاضوں اور جذبات کے ساتھ دو حواس کام کرتے ہیں' ایک طرح کے حواس خواب میں کام کرتے ہیں اور دوسری طرح کے حواس بیداری میں کام کرتے ہیں' ان دونوں حواسوں کو اگر ایک جگہ جمع کر دیا جائے تو ان کی کیفیات کی تعداد گیارہ ہزار ہوتی ہے اور ان گیارہ ہزار کیفیات یا تقاضوں کے اوپر ایک اسم ہمیشہ غالب رہتا ہے' اس کو اس طرح بھی کہا جا سکتا ہے کہ انسان کی زندگی میں اللہ تعالیٰ کے جو اسماء کام کرتے ہیں ان کی تعداد تقریباً گیارہ ہزار ہے اور ان گیارہ ہزار اسماء کو جو اسم کنٹرول کر

رہا ہے وہ اسم اعظم کہلاتا ہے ان گیارہ ہزار اسماء میں سے ساڑھے پانچ ہزار اسماء بیداری میں کام کرتے ہیں اور ساڑھے پانچ ہزار خواب میں کام کرتے ہیں۔ انسان چونکہ اشرف المخلوقات ہے اس لیے اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق انسان کے اندر کام کرنے والا ہر اسم کسی دوسری نوع کے لیے اسم اعظم کی حیثیت رکھتا ہے' یہی وہ اسماء ہیں جن کا علم اللہ تعالیٰ نے آدم کو سکھایا ہے' تکوین یا اللہ تعالیٰ کے ایڈمنسٹریشن کو چلانے والے حضرات یا صاحب خدمت اپنے اپنے عہدوں کے مطابق ان اسماء کا علم رکھتے ہیں۔

اسم ذات کے علاوہ اللہ تعالیٰ کا ہر اسم اللہ تعالیٰ کی ہر صفت کامل طرزوں کے ساتھ اپنے اندر تخلیقی قدریں رکھتی ہے تخلیق میں کام کرنے والا سب کا سب قانون اللہ کا نور ہے۔

(اللہ نور السمٰوٰت والارض)

اور یہی اللہ کا نور لہروں کی شکل میں نباتات' جمادات' حیوانات' انسان' جنات اور فرشتوں میں زندگی اور زندگی کی پوری تحریکات پیدا کرتا ہے پوری کائنات میں قدرت کا یہ فیضان جاری ہے کہ کائنات میں ہر فرد نور کی ان لہروں کے ذریعہ ایک دوسرے کے ساتھ نتھی اور بندھا ہوا ہے۔

کہکشانی نظاموں اور ہمارے درمیان بڑا مستحکم رشتہ ہے۔ پے در پے جو خیالات ہمارے ذہن میں آتے ہیں وہ دوسرے نظاموں اور ان کی آبادیوں سے ہمیں وصول ہوتے رہتے ہیں' نور کی یہ لہریں ایک مرحلہ میں روشنی کا روپ دھار لیتی ہیں روشنی کی یہ چھوٹی بڑی لہریں ہم تک بے شمار تصویر خانے لے کر آتی ہیں' ہم اپنے تصویر خانوں کا نام واہمہ' خیال' تصور اور تفکر رکھ دیتے ہیں۔

انسان صرف اس زمین پر ہی آباد نہیں ہے اور بھی بے شمار سیاروں میں انسانوں کی آبادیاں ہیں۔ ان کی زندگی کی طرزیں گو مختلف ہیں لیکن تقاضے سب کے یکساں ہیں۔ جس طرح زمین پر آباد انسان کے اندر بیداری اور خواب کے حواس کام کرتے ہیں' بالکل اسی طرح دوسرے لاکھوں سیاروں میں آباد انسان اور ان کی نوع میں بھی بیداری اور خواب کے

حواس میں کام کرتے ہیں۔

خواب کے حواس ہوں یا بیداری کے حواس ہوں دونوں کے تقاضے یکساں ہوتے ہیں‘ بس فرق اتنا ہوتا ہے کہ بیداری میں حواس زمان اور مکان کے پابند ہوتے ہیں‘ لیکن خواب میں زمانیت اور مکانیت کی حد بندی انسان پر اپنا تسلط نہیں رکھتی۔

یہی وجہ ہے کہ کوئی انسان خواب میں کیے ہوئے اعمال یا دیکھے ہوئے واقعات میں ترتیب قائم نہیں رکھ سکتا‘ کیونکہ اسے بیداری میں ایسے حواس میں زندگی گزرنے کی عادت پڑ جاتی ہے۔

☆☆☆

باب دوئم

”عذاب قبر سے مراد“

سوال: قبر کے عذاب کے بارے میں ایک گروہ کا خیال ہے کہ عذاب قبر کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ اگر عذاب قبر ہے تو روز حشر میں حساب کتاب کیا ہے؟...... جب حساب و کتاب ہوا ہی نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ نے کوئی فیصلہ صادر نہیں کیا ہے تو پہلے سے عذاب کا مطلب انسانی شعور قبول نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہیں‘ ستار العیوب اور غفار الذنوب ہیں۔ یوم حشر میں انسان کا ہر عضو خود گواہی دے گا اور اس گواہی پر اللہ تعالیٰ فیصلہ صادر کریں گے کہ کون دوزخی اور کون جنتی ہے......

اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں۔

ترجمہ: ”سب تعریف اللہ کو ہے جو صاحب سارے جہانوں کا بہت بڑا مہربان نہایت رحم والا‘ مالک انصاف کے دن کا۔“

سورۂ فاتحہ کی ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے یوم انصاف متعین کر دیا ہے۔ یوم عدالت سے پہلے قبر کے عذاب یا ثواب میں کیا حکمت ہے؟......

جواب: مرنے کے بعد زندگی کی تشریح کی جائے تو کہا جائے گا کہ......

جسم مثالی نے مٹی کے ذرات سے بنائے ہوئے جسم سے رشتہ منقطع کر لیا ہے۔ اور دوسرے عالم میں وہاں کی فضا کے مطابق ذرات یکجا کر کے ایک نیا جسم تخلیق کر لیا ہے۔ عالم اعراف میں دنیا کی آبادی سے برابر جو لوگ منتقل ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے دراصل یہ اس عالم سے اس عالم میں جسم مثالی کی منتقلی ہے۔ عربی زبان میں اسی لئے اس عالم میں جانے کا نام انتقال کرنا ہے یعنی اس عالم سے اُس عالم میں آدمی منتقل ہو گیا......

جسم مثالی‘ زندگی میں ہمہ وقت متحرک و سرگرم رہتا ہے اس کی اپنی صفات میں سے ایک

مخصوص صفت یہ ہے کہ جب تک یہ اپنے لباس سے کلی طور پر قطع تعلق نہیں کر لیتا اس کی حفاظت کرتا ہے۔

ایک آدمی سویا ہوا ہے...... نیند بہت گہری ہے...... کراچی میں سویا ہوا آدمی امریکہ کے بازاروں میں گشت کر رہا ہے...... اس کے سوئی چبھو دی جاتی ہے...... جسم مثالی امریکہ سے چل کر فوراً اپنے لباس کی پاسبانی کے لئے آ موجود ہوتا ہے۔ سوئی چبھنا...... امریکہ سے جسم مثالی کا کراچی میں آ جانا۔ اتنا قلیل وقفہ ہے کہ جس کی پیمائش کسی بھی طرح ممکن نہیں ہے۔ اس پیمائش کو آپ لمحے کا کھربواں حصہ کہہ سکتے ہیں اور لمحے کا کھربواں حصہ کہنا پیمائش کے دائرے میں نہیں آتا۔ مقصد یہ ہے کہ جسم مثالی کے لئے ٹائم اسپیس کوئی چیز نہیں ہے لیکن جب یہ اپنے لئے مادی جسم بناتا ہے تو اس کو ٹائم اسپیس میں بند رکھنے کے لئے پوری حفاظت کرتا ہے۔

عالم اعراف کے بارے میں ہے......

ترجمہ: ''خرابی ہے ڈنڈی مارنے والوں کی، جن کا یہ حال ہے کہ جب لوگوں سے ماپ لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں اور جب ان کو ماپ یا تول کر دیتے ہیں تو انہیں گھٹا دیتے ہیں۔ کیا یہ لوگ نہیں سمجھتے کہ ایک بڑے دن اٹھا کر لائے جانے والے ہیں۔ اس دن جب کہ سب لوگ اللہ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے۔ ہرگز نہیں یقیناً بدکاروں کا نامہ اعمال قید خانے (سجنین) میں ہے اور تمہیں کیا معلوم کہ وہ قید خانے کا دفتر سجین کیا ہے؟ ایک کتاب ہے لکھی ہوئی۔ تباہی ہے اس روز ان لوگوں کے لئے جو روز جزا کو جھٹلاتے ہیں اور روز جزا کو وہی لوگ جھٹلاتے ہیں جو حد سے تجاوز کر جانے والے بدعمل ہیں۔ انہیں جب ہماری آیات سنائی جاتی ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ تو اگلے وقتوں کی کہانیاں ہیں۔ ہرگز نہیں بلکہ اصل بات یہ ہے کہ ان لوگوں کے دلوں پر ان کے برے اعمال کا زنگ لگ گیا ہے۔ ہرگز نہیں یقیناً اس روز یہ اپنے رب کی دید سے

محروم رکھے جائیں گے۔ پھر یہ جہنم میں جا پڑیں گے۔ پھر ان سے کہا جائے گا کہ یہ وہی چیز ہے جسے تم جھٹلا دیا کرتے تھے۔ ہرگز نہیں، بے شک نیک آدمیوں کا نامہ اعمال بلند پایہ لوگوں کے دفتر میں ہے اور تجھ کو کیا خبر ہے کیا ہیں اوپر والے...... ایک کتاب ہے لکھی ہوئی...... اس کو دیکھتے ہیں مقربان بارگاہ...... بے شک نیک لوگ ہیں آرام میں، اونچی مسند اور تختوں پر بیٹھے نظارہ کر رہے ہوں گے۔ ان کے چہروں پر تم آرام اور تازگی محسوس کرو گے۔ ان کو نفیس ترین شراب پلائی جائے گی جس پر مشک کی مہر لگی ہوئی ہوگی۔ جو لوگ دوسروں پر بازی لے جانا چاہتے ہیں وہ اس چیز کو حاصل کرنے میں بازی لے جانے کی کوشش کریں۔ اس شراب میں تسنیم کی آمیزش ہوگی۔ یہ ایک چشمہ ہے جس کے پانی کے ساتھ مقرب لوگ شراب پئیں گے...... لوگ دنیا میں ایمان لانے والوں کا مذاق اڑاتے تھے۔ جب ان کے پاس سے گزرتے تو آنکھیں مار مار کر ان کی طرف اشارہ کرتے تھے، اپنے گھروں کی طرف پلٹتے تو مزے لیتے ہوئے پلٹتے تھے اور جب دیکھتے تو کہتے تھے یہ بہکے ہوئے لوگ ہیں حالانکہ وہ ان پر نگراں بنا کر نہیں بھیجے گئے۔ آج ایمان لانے والے کفار پر ہنس رہے ہیں۔ مسندوں پر بیٹھے ہوئے ان کا حال دیکھ رہے ہیں۔ اب بدلہ پایا منکروں نے جیسا کرتے تھے۔ (پارہ ۳۰ سورہ ۸۳)

قرآن پاک کی مندرجہ بالا آیتیں مرنے کے بعد زندگی کا نقشہ پیش کرتی ہیں۔ روحانی نگاہ دیکھتی ہے کہ ہر آدمی کے کندھوں پر دو فرشتے موجود ہیں اور کچھ لکھ رہے ہیں۔ لیکن لکھنے کی طرز یہ نہیں ہے جو ہماری دنیا میں رائج ہے۔ نہ ان کے ہاتھوں میں قلم ہے اور نہ سامنے کسی قسم کا کاغذ ہے۔ فرشتوں کا ذہن کوئی بات نوٹ کرتا ہے اور وہ بالقلم کی طرح ایک جھلی پر نقش ہو جاتی ہے۔ نقش و نگار کی صورت یہ ہے کہ مثلاً ایک آدمی کے ذہن میں ذخیرہ اندوزی اور منافع خوری ہے۔ دوسرے آدمی کے ذہن میں ایذا رسانی

اور حسد کے جذبات متحرک ہیں۔ تیسرا آدمی کسی کو قتل کرنے کے درپے ہے۔ یہ آدمی قتل کرنے کے ارادے سے گھر سے باہر نکلا۔ ایک فرشتے نے فوراً اس کے ذہن میں ترغیب کے ذریعے یہ بات ڈالی کہ قتل کرنا بہت بڑا جرم ہے اور جان کا بدلہ جان ہے۔ لیکن اس آدمی نے اس ترغیب کو قبول نہیں کیا۔ اور اپنے ارادے کو پورا کرنے کے لئے آگے بڑھتا رہا۔ ترغیبی پروگرام پر جب عمل نہیں ہوا تو دوسرے فرشتے نے اس جلی نما فلم پر اپنا ذہن مرکوز کر دیا اور اس فلم پر یہ تصویر منعکس ہوگئی کہ وہ بندہ قتل کی نیت سے گھر سے باہر آیا اور اس کے اوپر اس بات کا کوئی اثر نہیں ہوا کہ جان کا بدلہ جان ہے۔ یہ بندہ اور آگے بڑھا اور متعین مقام پر پہنچ کر اپنے ہی جیسے دوسرے انسان کے پیٹ میں چھرا گھونپ دیا۔ دوسرے فرشتے نے فوراً ہی اس کی فلم بنا دی۔

جرم کرنے کے بعد اس بندے کے ضمیر میں ہل چل برپا ہوگئی۔ دماغ میں مسلسل اور تواتر سے یہ بات آتی رہی کہ میں نے یہ کام صحیح نہیں کیا۔ جس طرح میں نے ایک جان کا خون کیا ہے اس طرح میری سزا بھی یہی ہے کہ مجھے قتل کر دیا جائے۔ ضمیر کی اس ملامت کی بھی فلم بن گئی ...... اس کے برعکس ایک آدمی نماز کے ارادے سے مسجد کی طرف بڑھا ...... مسجد میں پہنچ کر خلوص نیت سے نماز ادا کی ...... خلوص نیت اللہ کو پسند ہے ...... اللہ تعالیٰ کی اس پسندیدگی کے نتیجے میں وہ انعامات وکرامات کا مستحق قرار پایا۔ گو کہ اسے معلوم نہیں کہ اس کا عمل مقبول ہوا یا مقبول نہیں ہوا ...... لیکن چونکہ اس کی نیت مخلصانہ تھی ...... اس لئے عمل کرنے کے بعد اس کا ضمیر مطمئین ہو گیا اور اس کے اوپر سکون کی حالت قائم ہوگئی۔ سکون کا اصل مقام جنت ہے۔ ضمیر نے مطمئین ہو کر اس بات کا مشاہدہ کیا کہ میرا مقام جنت ہے۔ جیسے ہی جنت سامنے آئی ...... جنت کے اندر تمام انواع و اقسام کے پھل، شہد کی نہریں، حوض کوثر وغیرہ وغیرہ سامنے آ گئے۔ جب ضمیر ایک نقطہ پر مرکوز ہو کر ان انعامات وکرامات سے فیض یاب ہو چکا تو فرشتے نے اس جلی نما فلم پر اپنا ذہن مرکوز کر دیا اور یہ ساری کاروائی وڈیو فلم بن گئی ......

ایک دوسرا آدمی گھر سے نماز کے لئے چلا ...... ذہن میں کثافت ہے ...... اللہ کی مخلوق کے لئے بغض و عناد ہے ...... حق تلفی، سفاکی، بربریت اور جبر و تشدد مشغلہ ہے۔ مسجد میں داخل ہوا ...... نماز ادا کی ...... لیکن ضمیر مطمئین نہیں ہوا۔ ضمیر مطمئین نہ ہونا دراصل وہ کیفیت ہے جس کو دوزخ کی کیفیت کے سوا دوسرا نام نہیں دیا جا سکتا۔ جب یہ آدمی نماز سے فارغ ہوا اور دل و دماغ خالی اور بے سکون محسوس کئے تو فرشتے نے اس جلی نما فلم پر اپنا ذہن مرکوز کیا اور یہ ساری روئیداد بھی وڈیو فلم بن گئی ......

اس وقت آپ کے سامنے دو کردار ہیں ......

ایک کردار وہ ہے جس نے ترغیبی پروگرام سے روگردانی کی اور محض اپنی خواہش نفس کی پیروی کرتے ہوئے اپنے ہی بھائی کو قتل کر دیا۔

ایک وہ شخص ہے جس نے بظاہر وہ عمل کیا جو نیکو کار لوگوں کا عمل ہے لیکن اس کی نیت میں خلوص نہیں تھا۔ وہ خود کو اور اللہ کے نظام کو دھوکہ دے رہا تھا۔

دوسرا گروہ وہ ہے جس کی نیت میں خلوص ہے ...... ذہن میں پاکیزگی ہے اور اللہ کے قانون کا احترام ہے۔

آیئے اب ہم ان دونوں گروہوں میں سے ایک ایک فرد کی زندگی کا مطالعاتی تجزیہ کرتے ہیں۔

قتل کرنے والا بندہ جب دنیا کی ہماہمی اور گہما گہمی اور لامتناہی مصروفیات سے فارغ ہوتا ہے تو اس کے اوپر جرم کا احساس مسلط ہو جاتا ہے۔ بے چینی، پریشانی، ذہنی خلفشار اور دماغی کشاکش آلام و مصائب کی تصویریں بن جاتی ہیں۔ اب فرشتے کی بنائی ہوئی فلم پر نقوش اس بندے کے اپنے ارادے اور اختیار سے گہرے ہو جاتے ہیں۔ جیسے جیسے ان نقوش میں گہرائی واقع ہوتی ہے، اس آدمی کے اندر روشن نقطے دھندلے ہونے لگتے ہیں ...... اور روشنیاں تاریکی میں ڈوب جاتی ہیں۔

ان روحانی حقائق کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انسان اس دنیا میں جو

عمل کرتا ہے' اور اس عمل کے پس پردہ جو سوچ کام کر رہی ہے وہ فلم کی صورت میں ریکارڈ ہو جاتی ہے۔ جسے قرآن مجید نے کتاب المرقوم کہا ہے۔ مرنے کے بعد انسان یہ فلم (کتاب المرقوم) دیکھتا رہتا ہے۔ برے انسان کے سامنے اُس کے برے ارادوں' برے اعمال اور برے اعمال پر ضمیر کی ملامت جب فلم کی صورت میں ڈسپلے ہوتی ہے تو وہ اسے دیکھ کر شدید اذیت سے دوچار ہو جاتا ہے۔ یہ اذیت پچھتاوا بن کر اس پر مسلط رہتی ہے۔ نیک انسان مرنے کے بعد جب اپنے نیک ارادوں' نیک اعمال اور اعمال کے نتیجے میں ضمیر پر طاری ہونے والی سکون کی کیفیت کو دیکھتا ہے تو وہ اللہ کی رحمت اور قربت کو شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے......

ہر آدمی فلم دیکھتا ہے اور مناظر کی نوعیت سے وہ فلم دیکھ کر کبھی قہقہے لگاتا ہے اور کبھی ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے۔ کبھی آنسوؤں سے رونا شروع کر دیتا ہے۔ حالانکہ وہ جانتا ہے کہ جو فلم میں دیکھ رہا ہوں وہ کس کی لکھی ہوئی کہانی ہے......

اعراف (مرنے کے بعد قبر کی زندگی) میں جب آدمی یہ دیکھتا ہے کہ میں چوری کر رہا ہوں اور میرا ہاتھ کاٹ دیا گیا ہے...... تو اس منظر کو دیکھ کر وہ بدحواس ہو کر رونے چیخنے لگتا ہے...... چونکہ فلم پوری زندگی کی ہے۔ اس لئے جب دوسرے اعمال کی فلم دیکھتا ہے تو ہاتھ کٹنے کی اذیت بھول جاتا ہے۔ اور پھر جب چوری کی فلم کے مناظر سامنے آتے ہیں تو آدمی رونے لگتا ہے۔ اور یہ صورت یوم حساب قائم ہونے تک رہے گی۔ یوم انصاف کے بعد جنت دوزخ کے مراحل ہیں۔ اللہ تعالیٰ رحیم و کریم ہیں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے......

''ایک دن دوزخ کی آگ ٹھنڈی ہو جائے گی''

☆☆☆

''اپنی سوچ بدلیں''

سوال: ایک شخص کسی کو بہت اچھا کہتا ہے پھر دو منٹ بعد اُسی شخص کو بہت بُرا کہتا ہے۔ روحانی طور پر اس کی تشریح فرمائیں؟

جواب: حضور قلندر بابا اولیاءؒ فرماتے ہیں کہ انسان گفتگو میں بہت زیادہ مبالغہ آرائی سے کام لیتا ہے اور وہ ایک تو استعارے سے کام لیتا ہے اور انسان کی عادت ہے گفتگو میں مبالغہ بھی کرتا ہے اگر کسی آدمی کی تعریف کرنا مقصود ہے تو عرش سے نیچے تو چھوڑے گا نہیں اور جب اس سے ناراض ہوگا تو وہ فرش نہیں بلکہ تحت الثریٰ میں لے جانے کی کوشش کرے گا۔ میں آپ کو اپنا ایک واقعہ سناؤں کہ میرے ایک پیر بھائی تھائی لینڈ گئے اور وہاں سے انھوں نے حضور قلندر باباؒ کا ہوائی جہاز کا ٹکٹ بھیج دیا مجھے بہت صدمہ اور تکلیف ہوئی کہ قلندر باباؒ میرے پاس سے چلے جائیں گے۔ مجھ پر بہت زیادہ رقت طاری ہوگئی۔ میں نے پیر بھائی کو برا بھلا کہا۔ حضور قلندر بابا چلے جائیں گے تو ہم یہاں کیا کریں گے۔ رات کو میں نے خواب دیکھا کہ میں حضورﷺ کے دربار میں حاضر ہوں۔ میں نے سلام پیش کیا حضورﷺ نے پوچھا ...... کیسا آدمی ہے؟ میں نے کہا سب اچھے آدمی ہیں۔ حضورﷺ کہنے لگے کہ بہت اچھا آدمی خراب آدمی کیسے ہوسکتا ہے۔ میرے اوپر رعب کی کیفیت اتنی زیادہ طاری ہوئی کہ میں گھبرا کر بیدار ہوگیا اور اتنا وزن پڑا کہ میں رات بھر سو نہ سکا صبح سویرے سویرے حضور قلندر باباؒ کو خواب سنایا۔ حضورؒ نے فرمایا ٹھیک ہے ایک طرف تو آپ ان کو اچھے آدمی کہتے ہیں دوسری طرف آپ کہتے ہیں کہ انھوں نے اچھا نہیں کہ آپ کی کس بات کا یقین کیا جائے۔ ایک بات ہونی چاہیئے کہ اگر آدمی اچھا ہے تو اچھا ہے اور اگر برا ہے تو پھر برا ہے۔ ایک آدمی اچھا بُرا کیسے ہوسکتا ہے۔ حضورﷺ نے آپ کی اصلاح فرمائی ہے۔ میں نے بہت معافی تلافی کی۔

انسان جو کچھ کہتا ہے فی الوقت وہ سمجھتا نہیں کہ وہ کیا کہہ رہا ہے ایک آدمی کو وہ بہت اچھا کہتا ہے اور دو منٹ کے بعد اسی آدمی کو وہ بہت برا کہتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا اچھا

کہنا سند ہے اور نہ برا کہنا سند ہے وہ منافقت کر رہا ہے حالانکہ وہ نہیں سمجھ رہا ہے کہ وہ منافقت کر رہا ہے۔

قلندر باباؒ نے فرمایا کہ انسانی گفتگو میں مبالغہ بہت ہوتا ہے اور اس کی یہ بشری کمزوری ہے اس پر کوئی آدمی عبور نہیں پا سکتا۔ اس سے بچنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ کبھی کسی آدمی کو برا نہ کہو۔ اگر وہ بُرا ہے وہ جانے اللہ تعالیٰ جانے۔ اگر اچھائی میں مبالغہ بھی ہوگا جزا نہیں ملے گی تو سزا بھی نہیں ملے گی بہتر طریقہ یہی ہے کہ کوئی آدمی برا ہو' اچھا ہو' اسے اچھا سمجھے اگر وہ برا ہے تب بھی اسے اچھا کہو۔ ویسے یہ ہے مشکل کام۔ اس لیئے کہ ایک آدمی ہے اس نے آپ کے ساتھ خلوص و محبت کے ساتھ اچھا سلوک کیا جس کی بناء پر آپ اسے اچھا سمجھنے لگے۔ کچھ عرصے کے بعد اس نے آپ کو پریشان کرنا شروع کر دیا و آپ اس کے خلاف ہو گئے اسے بُرا بھلا کہنے لگے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ آپ نے پہلے اسے اچھا کیوں کہا تھا۔ آپ اسے اچھا کہہ چکے ہیں ایک دفعہ' تو اب آپ کو اسے اچھا ہی کہنا ہے چاہے وہ کتنا ہی برا ہو۔

کسی بھی مذہب کے بڑے کو برا نہ کہو۔ مثلاً یہ کہ پادری کو بُرا نہ کہو اور نہ بُرا جانو۔ جب تم اُسے بُرا نہ کہو گے تو وہ تمہارے مذہب کے بڑوں کو بُرا نہیں کہے گا۔ یہ وہ اخلاق حسنہ ہے جس کی تعلیم حضور ﷺ نے دی ہیں۔ قومیں ذاتیات سے بنتی ہیں۔ قوموں سے نوعیں بنتی ہیں۔ پہلے انفرادیت ہوتی ہے پھر انفرادیت سے قبیلے بنتے ہیں قبیلوں سے قومیں بنتی ہیں یعنی بہت سارے افراد کے جمع ہو جانے کا نام قبیلہ ہے. بہت سارے قبیلوں کے جمع ہونے کا نام قوم ہے اور بہت ساری قوموں کے ایک جگہ جمع ہونے کا نام نوع ہے انفرادیت **Base** بن گئی ہے قبیلے کی بھی **Base** ہے اگر افراد نہ ہوں قبیلہ کہاں سے آئے گا ایک ذہن' ایک طرز فکر کے بہت سارے افراد کے ایک جگہ جمع ہو جانے سے خاندان بنتا ہے۔ کئی چھوٹے خاندان ایک ہی طرز فکر کے جمع ہو جائیں اسے قبیلہ کہتے ہیں کئی قبیلے مختلف طرز فکر کے ایک جگہ جمع ہو جائیں تو اسے قوم کہتے ہیں اور کئی قومیں مختلف نظریات کی ایک جگہ جمع ہو جائیں تو اسے نوع کہتے ہیں۔ یعنی فرد ہوگا تو خاندان اور کنبہ بنے گا اور جب آپ نے اپنی طرز فکر یعنی معاشرتی طرز

فکر یہ بنا لی کہ اپنی ذات سے کسی دوسری ذات کو تکلیف نہیں پہنچے گی اپنی ذات میں رہتے ہوئے کسی بھی فرد کو بُرا نہیں کہیں گے تو ایک خاندان میں ایک باپ نے اپنا اصول بنا لیا۔ اب اس کی اولادیں ہیں۔ دس کی دس نہیں پانچ تو اس کی طرز فکر پر چلیں گی اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے اچھائی کا ایک دروازہ کھول دیا۔ چھ نسلیں اچھی بنیں۔

جب تک انسان کی سوچ انفرادی رہتی ہے وہ محدود رہتی ہے اور جب انسان کی سوچ انفرادی نہیں رہتی اور اس کی سوچ میں اجتماعیت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ جو کچھ اپنے لیئے چاہتا ہے وہ دوسروں کے لیئے بھی چاہتا ہے تو اس کی محدودیت ٹوٹ جاتی ہے پھر اس کی فکر محدود دائرہ سے نکل کر لامحدود دائرے میں داخل ہو جاتی ہے محدود کا مطلب یہ ہے کہ جس کی آپ حد بندی کر سکیں' لامحدود وہ چیز ہے جس کی حد بندی تو کر سکیں لیکن وہ حدود میں نہ ہو۔ مثلاً آپ کے پاس ایک زمین ہے اس میں دس کھیت ہیں۔ دوسری زمین ہے اس میں بیس کھیت ہیں تیسری زمین ہے جس میں یہاں سے وہاں تک وہاں سے یہاں تک کھیت ہیں تو یہ دس کھیت محدودیت کے دائرے میں آتے ہیں۔ آپ کو معلوم نہیں کہ دس کھیت کے بعد ہزار کھیت ہیں لیکن یہ پتہ ہے کہ بے شمار زمین ہے یہ لامحدود ہے لیکن محدود ہے اس لئے اگر حد بندی کی جا سکے تو اس کی حد بندی ہو سکتی ہے۔ یہی اجتماعیت ہے۔ اب آپ اجتماعیت کے دائرے سے نکل کر لامتناہیت میں داخل ہو گئے آپ کا ذہن لامحدود ہو گیا اب آپ جو بھی سوچیں گے وہ محدود دائرے سے باہر سوچیں گے اور جب آپ لامتناہیت کے دائرے سے باہر سوچیں گے آپ کی سوچ لامحدود ہو جائے گی۔

محدود دائرہ یہ ہے کہ ایک باپ اپنی اولادوں کے لیئے سوچتا ہے کہ میری اولاد تعلیم یافتہ ہو۔ ان کے پاس پیسے ہوں گھر ہو وغیرہ' وہ سوچتا ہے میرے بھائی ایسے ہوں' میرے دوستوں کو مجھ سے فائدہ پہنچے یہ بہرحال محدود سوچ ہے اب اس محدود سوچ سے نکلنے کے بعد وہ یہ سوچتا ہے کہ میری قوم کو مجھ سے میری ذات سے فائدہ پہنچے وہ یہ سوچتا ہے کہ میری سوچ سے پوری نوع کو بلکہ کائنات کے اندر جتنے بھی عوامل ہیں ان کو فائدہ پہنچے۔ یہ لامحدود سوچ ہے لیکن

محدود سوچ ہو یا لامتناہیت کی سوچ' اس کی مشق اور وہ عمل انفرادیت ہی سے شروع ہوتا ہے اگر انفرادیت سے وہ عمل شروع نہیں ہوگا تو کسی طرح تکمیل نہیں ہوگی انبیاء میں اور عام آدمیوں میں یہ فرق ہے کہ عام آدمی انفرادی سوچ سے لامتناہیت میں داخل ہوتا ہے۔ پیغمبروں کا یہ وصف ہے اور اللہ تعالیٰ کے انعام اکرام کی وجہ سے وہ لامتناہیت سے انفرادیت میں داخل ہوتے ہیں۔ یہ بہت بڑا فرق ہے اسی لیئے پیغمبروں کو فضیلت ہے۔ عام آدمی انفرادی سوچ سے قدم بہ قدم چل کر یعنی انفرادی سوچ سے ایک خاندان بنے گا ایک قبیلہ بنے گا۔ ایک قوم بنے گی ایک نوع بنے گی پھر نوع سے دوسری نوع سے وہ ہم رشتہ ہوگا یہ انفرادی سوچ ہے لیکن اس کے برعکس پیغمبر لامتناہیت میں جہاں ساری کائنات ایک جگہ ایک کنبے کی حیثیت میں ہم رشتہ ہے وہاں سے اس کی سوچ شروع ہوتی ہے اور وہ سوچ نزول کرتی ہے۔ انفرادی سوچ صعود کرتی ہے. جس وقت کوئی نبی اس دنیا میں مبعوث ہوتا ہے اس کی پیدائش کا عمل وہی عمل ہے جو عام انسانوں کا ہوتا ہے اس کی نشوونما کا عمل وہی عمل ہے جو عام بچوں کا ہوتا ہے اس کی غذا وہی ہے جو عوام کی غذا ہے. جس طرح عام آدمی سوتے ہیں کھاتے ہیں اور دوسری ضروریات زندگی پوری کرتے ہیں اسی طرح پیغمبر بھی پوری کرتے ہیں لیکن جب وہ شعور میں داخل ہوتا ہے شعور سے مراد بالغ شعور نہیں بلکہ بچپن کا شعور۔ اگر شعور کا نام ۷' ۸ سال کی عمر رکھیں جس وقت وہ بچہ شعور کے اندر داخل ہوگا اس کی سوچ لامتناہیت سے شروع ہوگی لامتناہیت سے شروع ہونے کا مطلب یہ ہے کہ روئے زمین پر جتنی بھی مخلوق آباد ہے چاہے وہ نبی کی اپنی نوع سے تعلق رکھتی ہو یا وہ کسی بھی نوع سے تعلق رکھتی ہو اس کی سوچ جو اپنے لیئے ہے وہ ساری نوع کے لیئے ہے حضور قلندر باباؒ نے فرمایا ہے انفرادی سوچ بیکار ہے اجتماعی سوچ انسان کا حاصل ہے اور اس اجتماعی سوچ سے ہی کوئی انسان...... (Gravity) کو توڑ سکتا ہے۔ انفرادی سوچ سے آدمی کشش ثقل کو نہیں توڑ سکتا اور جب آپ کشش ثقل کو نہیں توڑ سکتے تو ظاہر ہے کہ زمین میں قید ہیں زمین سے نکلنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ اڑنے لگیں کبوتر کی طرح۔ انسان اور کبوتر میں یہ فرق ہے کہ کبوتر اڑتا ہے انسان اڑتا نہیں۔

جہاں تک اڑنے کا سوال ہے کبوتر زیادہ افضل ہے انسان سے' اگر انسان اڑنے لگے کبوتر کی طرح تو انسان کہاں رہا کبوتر ہوگیا۔ کبوتر اور انسان میں کس طرح آپ درجہ بندی کریئنگے۔ بات یہ ہے کہ وہ زمین پر رہتا ہے کشش ثقل اس پر مسلط رہتی ہے لیکن ذہنی طور پر وہ کشش ثقل سے آزاد ہے یعنی زمین کی جو چپک ہے اور زمین کی جو گرفت ہے اس سے ایک طرف تو گرفت قائم رہتی ہے اس کے پیر اُوپر نہیں اٹھ جاتے زمین کے اندر جو کچھ ہے وہ کھاتا ہے پیتا ہے سوتا اور جاگتا ہے لیکن اس دلچسپی پر چپک کے ساتھ ساتھ یہ زمین کی ساری زندگی اور زمین کی ساری دلچسپیاں اس کا مقصد قرار نہیں پاتیں۔ مقصد اس کا وہی ہوتا ہے جو مقصد ہے۔ مقصد کیا ہے کہ اس کو یہ پتہ ہے کہ ہر انسان نقطہ واحدہ ہے نفس واحدہ ہے اور نقطہ واحدہ کی الٹ پلٹ سے ساری کائنات بنتی ہے وہ یہ جانتا ہے کہ میں ایک نقطہ ہوں ایسا نقطہ جو الٹ پلٹ ہو رہا ہے اس الٹ پلٹ ہونے کی وجہ سے یہ ساری کائنات وجود میں آئی۔ کبوتر یہ بات نہیں جانتا۔ اس لیے کبوتر پرواز میں انسان سے بظاہر اشرف نظر آتا ہے لیکن کبوتر چونکہ اس قانون سے واقف نہیں ہے کہ یہ انسان ہی ہے جو اس قانون سے واقف ہے۔ (الٹ پلٹ کبوتر کی بھی ہو رہی ہے۔ بس اس کو یوں سمجھو کہ ایک شیشہ ہے اسمیں چھ (Dimension) ہیں اس شیشے کو آپ رکھ دیجئے۔ اس شیشے میں چاروں طرف جتنی چیزیں اوپر نیچے جتنی چیزیں سب نظر آئیں گی مثلاً ادھر آم ہے وہ نظر آئے گا اُدھر بادام ہے وہ نظر آئے گا۔ ادھر گیٹ ہے وہ نظر آئے گا اُدھر گھڑی ہے وہ نظر آئے گی۔ اور پنکھا ہے وہ نظر آئے گا نیچے زمین ہے وہ نظر آئے گی اب اس نقطے کو آپ پلٹ دیجئے اسے گھمایئے جیسے جیسے آئینہ گھومے گا اسی مناسبت سے وہ چیزیں گھومتی چلی جائیں گی یعنی آئینہ کے گھومنے سے چیزیں بدل جاتی ہیں چیزیں بظاہر بدلتی ہوئی نظر نہیں آئیں گی لیکن جہاں وہ نقطہ موجود ہے اس نقطے سے گھومنے سے نقطے کی الٹ پلٹ ہونے سے ہی یہ حرکت قائم ہے۔ جتنا جتنا انسان اپنی اجتماعیت سے دور ہوتا چلا جائے گا وہ انفرادی خول میں بند ہوتا چلا جائے گا اور جتنا جتنا آدمی اپنی اصل سے واقف ہوتا چلا جائے گا وہ انفرادی خول سے آزاد ہوتا چلا جائے گا یہی حضور قلندر باباؒ کی تعلیمات ہیں۔

حضور قلندر بابا اولیاءؒ کی تعلیمات کا نچوڑ یہ ہے کہ وہ نوع انسانی کے ہر فرد کو یا اپنے سلسلہ عظیمیہ کے تمام افراد کو یہ سبق دیتے ہیں کہ انفرادیت سے آزاد ہو جاؤ۔ انفرادیت سے آزاد ہو کر اپنے ذہن کو اجتماعی بنالو۔ جب آپ اجتماعی ذہن بنالیں گے تو چونکہ آپ کا ذہن لامحدود دائرے میں داخل ہوگیا ہے اب کوئی آدمی بُرا کہے گا تو آپ کو بُرا نہیں لگے گا اس لیئے بُرا محسوس کرنا انفرادی سوچ ہے آپ کی کوئی آدمی تعریف کرتا ہے آپ خوشی سے پاگل یا دیوانے نہیں ہو جائیں گے یا تکبر نہیں کریں گے۔ اس لیئے کہ یہ انفرادی سوچ ہے جو خوشامد کو پسند کرتی ہے اجتماعی سوچ میں خوشامد نہیں ہے جب تک آپ کے اندر اخلاص پیدا نہیں ہوگا آپ اجتماعیت میں داخل نہیں ہو سکتے اور اخلاص جب پیدا ہوگیا تو کوئی برا کہے کوئی اچھا' اس کا آپ پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ میں اپنا ایک واقعہ سناتا ہوں' ایک اخبار میں میں کالم لکھا کرتا تھا وہاں ایک جنرل مینجر صاحب تھے۔ تنخواہ کا مسئلہ تھا مجھے اس زمانہ میں دوسو روپے تنخواہ ملتی تھی میں نے کہا میری تنخواہ بڑھاؤ یہ بہت کم تنخواہ ہے۔ قصہ مختصراً ایک دفعہ ان کے یہاں ڈائریکٹران کی میٹنگ ہورہی تھی۔ میں اس کمرے میں چلا گیا۔ غصے میں بغیر اجازت کے اور میں نے کہا میرا فیصلہ ہو جائے اگر کالم لکھوانا ہے آپ کو لکھوائیں' میری تنخواہ بڑھائیں دوسو روپے میں گزارا نہیں ہوتا۔

یہ بات غصے میں ہوگئی جو نہیں ہونی چاہیئے تھی اس پر جنرل مینجر نے سخت سست کہا میں نے بھی انھیں سخت سست کہا۔ انھوں نے کہا میں آپ کا کالم ختم کردوں گا۔ میں نے کہا کہ میں آپ کی کرسی چھین لوں گا اور میں آپے سے باہر ہوگیا۔

مقصد یہ تھا کہ حضور قلندر باباؒ سے جا کر عرض کروں گا وہ ایسا کردیں گے میں اخبار سے نکلا اور سیدھا حیدری (جگہ کا نام) پہنچا۔ غصے کے مارے بُرا حال تھا حضور قلندر باباؒ نے کہا کیا بات ہے بیٹھیں۔ پانی پلوایا ابھی میں کچھ کہنے بھی نہیں پایا تھا انہوں نے فرمایا کہ خواجہ صاحب بات یہ ہے کہ آپ نے جو حرکت کی ہے بہت غلط ہے ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا میں نے صفائی پیش کی کہ فلاں صاحب نے یوں کہا۔ انھوں نے کہا کہ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ جو کچھ یہاں

زمین پر ہورہا ہے۔ یا کائنات میں ہورہا ہے۔ یہ سب اللہ کے حکم سے ہورہا ہے یا کسی بندے کے حکم سے ہورہا ہے؟

میں نے کہا اللہ کے حکم سے ہورہا ہے۔ کہنے لگے اللہ نے آپ کو جنرل مینجر کی کرسی پر کیوں نہیں بٹھا دیا۔ آپ کو کالم نویس کیوں بنایا۔ آپ کون ہوتے ہیں غصہ کرنے والے۔ اگر آپ میں صلاحیت ہوتی تو آپ جنرل مینجر ہوتے۔ یہ کون سا طریقہ ہے وہ بہت زیادہ ناراض ہوگئے۔ میں نے سوچا بات ہی اُلٹی ہوگئی واقعی غلطی میری تھی۔ بات سیدھی تھی کہ جب اللہ ہی سب کچھ کررہا ہے تو مجھے جنرل مینجر کیوں نہیں بنایا۔ مجھے اللہ نے جنرل مینجر کے ماتحت کیوں کیا۔ میں دو دن تک دفتر نہیں گیا شرمندگی کی وجہ سے غلطی میری تھی۔ دو دن کے بعد پھر گیا تو انہوں نے مجھے دیکھا۔ میں شرم کے مارے آنکھ نہیں اٹھا سکا کیونکہ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا تھا وہ تیزی سے میری طرف بڑھے اور ہاتھ پکڑ کر مجھے کمرے میں لے گئے اور کنڈی لگا دی۔ انہوں نے کہا کہ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ جو کچھ اس روز آپ نے کیا آپ کی غلطی تھی لیکن بعد میں میں نے محسوس کیا کہ غلطی میری بھی تھی۔ میں ڈائریکٹران کی میٹنگ میں کہہ دیتا کہ ان کا کیس ہے نظر ثانی کرو۔ اگر وہ بڑھاتے پیسے بڑھ جاتے نہ بڑھاتے نہ بڑھتے۔ میرا کیا حرج تھا۔ بھئی میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔

میں نے عرض کیا جناب! میں اپنے پیرو مرشد کے پاس گیا تھا۔ مجھے الٹی بہت ڈانٹ پڑی ہے جناب میں بہت شرمندہ ہوں آپ مجھے معاف کردیں۔ گلے ملے اور بات صاف ہو گئی۔ مجھے انہوں نے ناشتہ پر بلایا میں نے انکار کردیا۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ کا دل صاف نہیں ہے۔ میں نے کہا ٹھیک ہے میں آجاؤں گا۔ ناشتہ کیا ناشتہ کے بعد انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں آپ کو ایک واقعہ سنانا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا سنائیں جس دن یہ واقعہ ہوا رات کو مجھے احساس ہوا کہ میں نے غلطی کی ہے پھر سوچا میں نے غلطی نہیں کی۔ غلطی خواجہ صاحب کی ہے۔ اسی ادھیڑ بن میں سوگیا رات کو ڈھائی بجے کے قریب کروٹ جو لی تو ہاتھ سن ہوگیا میں نے کہا اب کیا ہوگا۔ میں نے بیوی کو آواز دی کہ میرا ہاتھ فالج زدہ ہوگیا۔ بہت

مالش کی۔ میں رونے لگا بچوں کا کیا ہوگا۔ روتے روتے آپ کا خیال آیا ذہن میں بات آئی کہ ان کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔

بیوی سے کہا نفل پڑھ کر دعا استغفار کرو۔ پھر آ کر بیوی نے سکائی کی تو ہاتھ ٹھیک ہوگیا۔ بتانا یہ ہے کہ قلندر باباؒ نے مجھے ڈانٹ بھی دیا۔ مجھ سے معافی بھی منگوادی اور جی ایم کو سزا بھی دے دی۔ میں نے جہاں کہیں بھی ملازمت کی کبھی اپنے باس سے زور سے بات نہیں کی ٹھیک ہے اگر کام نہیں ہوسکتا تو چھوڑ دیں۔ یہ بات ذہن نشین کرنے کی ہے کہ آپ کلرک کیوں ہیں اور کوئی دوسرا آدمی جنرل منیجر کیوں ہے۔

حضور قلندر باباؒ فرماتے ہیں کہ فقیر کی عجیب شان ہے میں نے کہا کیا شان ہے؟ فرمایا' لوگ بے وقوف بناتے ہیں' آخر تک بنتا رہتا ہے۔...... فقیر یہ سمجھتا ہے کہ مجھے بیوقوف بنا کر یہ خوش ہو رہا ہے تو چلو اسے خوش ہونے دو' وہ بیوقوف بنتا چلا جاتا ہے تاوقتیکہ وہ بندہ خود ہی بھاگ جائے' اسے اپنی غلطی کا احساس ہو جائے پھر فرمایا حضورﷺ نے اس بات کو اس طرح فرمایا ہے کہ مومن کی فراست سے ڈرو کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے دیکھتا تو وہ عام انسانوں کی طرح ہے لیکن اس کے دیکھنے میں اور عام انسانوں کے دیکھنے میں فرق ہے عام انسان کی آنکھوں پر شعور کا چشمہ لگا ہوا ہے محدود شعور کا چشمہ اور مومن کی آنکھ پر اللہ کے نور کا چشمہ لگا ہوا ہے لیکن وہ اللہ کے نور سے جو کچھ دیکھتا ہے اس پر اتراتا نہیں ہے اور نہ اس کا اظہار کرتا ہے یہ بھی فرمایا جو آدمی تمہاری تعریف کر رہا ہے وہ اس لیئے تمہاری تعریف کر رہا ہے یا تو اسے تمہاری ذات سے کوئی توقع ہے کہ اس کا کوئی کام ہو جائے گا یا اس کا کوئی کام ہوگیا ہے اس نے ایک توقع قائم کر لی کہ مجھے اس آدمی سے کسی بھی وقت ایک ہزار روپے مل جائیں گے چونکہ اس نے توقع قائم کی ہوئی ہے اس بنیاد پر وہ اس کی خوشامد بھی کرے گا اگر اس کی توقع پوری نہیں ہوتی تو وہی آدمی جو آپ کی تعریف کر رہا ہے برائی کرے گا کسی آدمی کا اچھا سمجھنا یا بُرا کہنا دونوں زائد باتیں ہیں آپ اس کی خدمت میں لگے رہیئے وہ آپ کو اچھا کہتا رہے گا آپ اس کی خدمت سے انکار کر دیجئے وہ آپ کو برا کہے گا اگر آپ اس کی تعریف اور برائی

سے بے نیاز ہو جائیں تو وہ آپ کے پاس آنا جانا چھوڑ دے گا۔

حضور قلندر باباؒ فرماتے ہیں کسی کی تعریف سے کیا خوش ہونا اور کسی کی برائی سے کیا دل بُرا کرنا۔

ایک اور واقعہ سنیئے۔ ایک صاحب سے منہ زوری ہوگئی لڑائی ہوگئی۔ میں حضور قلندر باباؒ کے پاس گیا حضور فلاں صاحب سے لڑائی ہوگئی اس نے مجھے یوں کہا یوں کہا۔ قلندر باباؒ نے کہا۔

ٹھیک ہے آپ یہاں بیٹھیں۔ اس نے آپ کو بُرا کہا جس وقت اس نے آپ کو گالی دی اس وقت آپ کا وزن کتنا تھا میں نے کہا کہ ایک من بیس سیر تھا۔ گالی دینے کے بعد وزن تلوایا تھا کیا ایک سیر کم ہوگیا میں نے کہا جی نہیں۔ انہوں نے کہا خواہ مخواہ ہی تھک رہے ہو۔ بھئی اگر وزن کم ہوگیا ہے تو پھر نوٹس لیتے ہیں کہ کیسا بُرا آدمی ہے اُسے پکڑ کر لاؤ کہ اس نے گالی دی ہمارے خواجہ صاحب کو کہ اس کی وجہ سے ایک سیر وزن کم ہوگیا۔ بعد میں فرمایا' غور کریں کہ جس وقت اس نے گالی دی اس وقت تو آپ کا وزن کم نہیں ہوا وہ گالی دے کر بھول بھی گیا اب آپ کے اندر جتنی دیر تک انتقامی جذبہ عود کرتا رہے گا آپ کا وزن کم ہوتا رہے گا۔ وزن گالی سے نہیں گھٹا۔ وزن انتقام کے جذبے سے کم ہوا تکلیف بھی ہوئی اور وزن بھی گھٹا اور وہ آرام سے سو رہا ہے فرمایا کوئی اچھا کہے یا بُرا کہے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ عبوری چیزیں ہیں انھیں کبھی خاطر میں نہیں لانا چاہیئے بس اپنی طرف سے جس کے ساتھ جو بھلائی ہو سکے کرو اور اگر بھلائی نہ کر سکتے ہو تو کوئی حرج نہیں۔ کوئی مجبور تو نہیں کر رہا۔ اپ کوئی خدا نہیں ہیں یہ خدا کے ہاتھ کی بات ہے وہ ایسے آدمی کو جو فٹ پاتھ پر پڑا ہے۔ اسے محل دیدے اس سے صرف نظر کر کے جو کچھ آپ کر سکتے ہیں کر دیں۔ یہ آج میں نے حضور قلندر بابا اولیاءؒ کی نسبت سے جو فرمان آپ کو بتائے ہیں یہ سب آپ نوٹ کر لیں اور اس پر پورا پورا عمل کریں۔ اس سے یہ ہوگا کہ انفرادی ذہن کا جو غلبہ ہے وہ ٹوٹ جائے گا۔ آدمی جس حال میں بھی ہو۔ اگر انفرادیت کے خول سے آدمی باہر نہیں نکلتا تو اسے خوشی میسر نہیں آتی اس لیئے کہ خوشی ایک

ایسی کیفیت ہے جس کو کسی طرح بھی محدود نہیں کیا جا سکتا اور لامحدود چیز محدودیت میں داخل نہیں ہوسکتی یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ ایک گلاس میں آپ سمندر انڈیل دیں یہ ہوسکتا ہے کہ گلاس کو آپ سمندر میں الٹ دیں شعور کی انفرادیت محدود ہے۔ انفرادیت کے اندر آپ مستقل خوشی حاصل کرنا چاہیں تو یہ ناممکن ہے خوشی اگر حاصل کرنی ہے تو خوشی اور غم دونوں سے گزرنا ہوگا خوشی اور غم دونوں محدود چیزوں کا نام ہے خوشی کی بھی ایک (Limit) ہے اور غم کی بھی ایک (Limit) ہے خوشی کا بھی ایک وقت ہے غم کا بھی ایک وقت ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ خوشی کا وقت معلوم نہیں ہوتا۔ سالوں گزر جائیں نہیں معلوم ہوتا کہ ایک دن گزرا ہے اور اللہ تعالیٰ.....سب کو حفظ وایمان میں رکھے غم اور پریشانی کا ایک دن سال بھر کے برابر ہوتا ہے لیکن تجزیہ کرنے کے بعد ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ خوشی بھی محدود کیفیت کا نام ہے اور غم بھی محدود کیفیت کا نام ہے اگر آپ محدود کیفیت سے باہر چلے جائیں انفرادیت سے نکل کر اجتماعی ذہن حاصل کرلیں تو خوشی اور غم چونکہ دونوں کیفیتیں محدود ہیں اسکی گرفت آپ کے اوپر سے ٹوٹ جائے گی اسی بات کو اللہ نے قرآن پاک میں فرمایا ہے **الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون** ۔ جو اللہ کے دوست ہوتے ہیں انھیں غم ہوتا ہے اور نہ خوف۔ محدود دائرے میں رہنے والا آدمی اللہ کا دوست نہیں ہوسکتا اس لئے کہ اللہ تو لامحدود ہے بلکہ لامتناہیت ہے۔ انفرادی سوچ سے نکلنے کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی خوشی اور غم دونوں سے بے نیاز ہوجاتا ہے اور اس کے اوپر ایک ایسی کیفیت طاری ہوجاتی ہے جس کو آپ سرور کہتےہیں اس کا نام خوشی نہیں رکھ سکتے اللہ کے قانون کے مطابق یہاں ہر چیز دورخوں پر قائم ہے جب تک آپ خوش ہیں غم اس کے ساتھ چپکا ہوا ہے جب تک آپ غمگین ہیں خوشی اس کے ساتھ ساتھ چپکی ہوتی ہے خوشی اور غم الٹ پلٹ ہوتے رہتے ہیں یعنی ابھی خوش ہے تو ابھی غمگین ہے۔ ابھی غمگین ہے تو ابھی خوش ہے بالکل اسی طرح رات اور دن الٹ پلٹ ہوتے رہتے ہیں ابھی دن ہے ابھی رات ہے۔ ابھی رات ہے تو ابھی دن ہے اسی صورت سے خوشی اور غم ایک دوسرے سے ردوبدل ہورہے ہیں ردوبدل کا ہونا ہی اس بات کی علامت ہے کہ

آدمی کی سوچ محدود ہے جب آدمی محدود سوچ سے آزاد ہوجاتا ہے تو اس کے اندر سے خوشی/غم دونوں نکل جاتے ہیں اور خوشی/غم نکلنے کے بعد ایک کیفیت ہوتی ہے جو اس کے اوپر طاری رہتی ہے اس کیفیت کا نام آپ کی لغت میں لفظوں میں نہیں ہے اس کو سرور کہنا اس لیئے ٹھیک نہیں کہ سرور جب ٹوٹتا ہے تو اس کے اوپر اذیت ناک کیفیت ہوتی ہے۔ حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے مجھ سے فرمایا کہ اس کو کیفیت بھی نہیں کہہ سکتے۔ یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ خوشی/غم دونوں سے نجات حاصل کرلیتا ہے۔

اُسے آپ لنگوٹی بندھوادیں تو خوش ہے اسے آپ اطلس وکم خواب کے کپڑے پہنادیں تو ٹھیک ہے اسے مرغی کھلادیں تو ٹھیک ہے۔ اسے روکھی روٹی کھلادیں تو تب بھی خوش ہے اس لیئے کہ وہ خوشی اور غم دونوں سے ماورا کیفیت میں ہے۔ ایسے بندوں کو اللہ اپنے پاس سے کھلاتا ہے اپنے پاس سے پہناتا ہے اور صرف وسائل اس کے تابع کردیتا ہے۔ بندہ وسائل کے تابع نہیں رہتا۔



''دنیا آخرت کی کھیتی''

سوال: سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان ہے۔ ''دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔'' ازراہ کرم فرمان کی تشریح کر دیں۔

جواب: سوچ کی دو طرزیں ہیں۔

ا۔ زندہ رہنے کے لئے ماحول سے متاثر ہو کر ہم خود کو وسائل میں قید کر لیتے ہیں۔ آسائش و آرام اور روٹی کپڑے کے علاوہ دوسری کوئی شے ہمارے لئے اہمیت نہیں رکھتی اور یہ عمل ہماری زندگی کا مقصد بن جاتا ہے۔

۲۔ ہم یہ سوچتے ہیں کہ مادی دنیا میں ہم نے کیا کھویا کیا پایا ہے۔

دنیا میں عزت و جاہ کا خوشنما لباس زیب تن کرنے کے لئے ہم دولت جمع کرتے ہیں۔ اس دولت کی تشہیر کے لئے عالی شان محلات کھڑے کرتے ہیں۔ گھروں کو اس اس طرح سجاتے ہیں کہ لوگ انہیں دیکھ کر احساس کمتری میں مبتلا ہو جائیں قرض لے کر بڑی بڑی کاریں خریدتے ہیں۔

دولت سے عزت و توقیر کا حصول خود فریبی ہے۔ ایسی خود فریبی جس سے کوئی ایک فرد بھی انکار نہیں کر سکتا۔ فراعین مصر کے مقبرے شداد و نمرود کے محلات اور قارون کے زمین میں دفن خزانے ہمیں بتا رہے ہیں کہ دولت نے کبھی کسی کے ساتھ وفا نہیں کی۔ تاریخ خود کو دہراتی رہتی ہے اور ہر زمانے میں دولت کی حقیقت کو ہمارے اوپر آشکارا کرتی رہتی ہے۔ بڑے بڑے شہنشاہوں کا ماضی ہمارے لئے آئینہ ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ شان و شوکت اور شاہی دبدبہ کے حامل بادشاہوں کو مادر وطن میں قبر بھی نصیب نہیں ہوئی۔ سب واقف ہیں کہ سونے چاندی کے ذخیروں اور جواہرات نے امیر ترین آدمیوں کے ساتھ وفا نہیں کی۔

مٹی نہ صرف یہ کہ خود کو پہچانتی ہے۔ بلکہ ایک ایک ذرّہ کو اپنی کوکھ سے وابستہ رکھتی ہے۔ مٹی کو اگر ایک فرد مان لیا جائے تو مٹی سے بنی ہوئی ہر چیز مٹی کے اعضاء ہیں۔ تانبا' لوہا'

آکسیجن' نائٹروجن' ہائیڈروجن' ہیلیم' کاربن' یورینیم' چاندی' سونا وغیرہ مٹی کے وہ اعضاء ہیں جن پر مٹی کا تشخص قائم ہے۔ آدمی کا جسم بھی مٹی سے بنا ہوا ہے۔ لیکن آدمی چونکہ اللہ تعالیٰ کی امانت کا امین ہے' اس لئے مٹی آدمی کو دوسرے اعضاء کے مقابلے میں اپنا قلب سمجھتی ہے اور جب قلب متاثر ہو جاتا ہے تو جسم ناکارہ بن جاتا ہے۔ مفلوج اور ناکارہ جسم زمین پر بوجھ ہے۔

یہ بات کون نہیں جانتا کہ آدمی چاہے تو پچاس کمروں کا مکان بنا لے لیکن سوئے گا وہ ایک ہی چارپائی کی جگہ۔ چاہے تو ہوس زر میں سونے چاندی (مٹی کے ذرات) سے خزانے بھر لے لیکن پیٹ دو روٹی سے بھر جاتا ہے۔ ماحول کو مصنوعی روشنیوں اور خوشبوؤں سے کتنا ہی معطر کر لیا جائے آدمی کے اندر کی سڑاند کا نعم البدل نہیں ہوتا۔

زمین کی فطرت ہے کہ وہ اپنی اولاد کو صاف ستھرا دیکھنا چاہتی ہے اور صاف ستھرا رکھتی ہے اور جب اولاد تعفن سے نہیں نکلنا چاہتی تو وہ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیتی ہے اور اس ادبار کی وجہ سے آدمی گھناؤنا اور ناسور زدہ ہو جاتا ہے۔ بلاشبہ کسی بندے کے لئے اس سے بڑا اور دردناک عذاب کوئی نہیں۔

''اور وہ لوگ جو سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور اللہ کے لئے خرچ نہیں کرتے' ان کے لئے عذاب الیم کی بشارت ہے'' (قرآن)

صدیوں سے زمین پر ہونے والی تبدیلیاں اس بات کی شہادت فراہم کرتی ہیں کہ زندگی کے ادوار' زمانہ کے نشیب و فراز اور سائنسی ایجادات زمین کے سینہ میں محفوظ ہیں۔ زمین یہ بھی جانتی ہے کہ کتنی تہذیبوں نے اس کی کوکھ سے جنم لیا ہے اور پھر یہ تہذیبیں زمین دوز ہو کر صفحہ ہستی سے غائب ہو گئیں۔

خلا کے پار آسمان کی وسعتوں میں جھانک کر دیکھا جائے تو مایوسیوں' ناکامیوں اور ذہنی افلاس کے علاوہ ہمیں کچھ نظر نہیں آتا۔ یوں لگتا ہے کہ زمین کے باسیوں کا اپنی ذات سے فرار اور منفی طرز عمل دیکھ کر نیلے پربت پر جھلمل کرتے ستاروں کی شمع امید کی لو مدھم پڑ گئی ہے۔ وہ انسان جو اشرف المخلوقات ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ ذہنی اعتبار سے حیوانات سے بدتر زندگی

گزار رہا ہے۔ فی الوقت جو سکون بلی اور بکری کو حاصل ہے اس کا عشر عشیر بھی انسان کو میسر نہیں ہے۔

تخلیق کرنے والوں میں بہترین تخلیق کرنے والی ہستی خود مختار خالق نے اس دھرتی کو ایک قطعہ زراعت بنا کر آدمی کے حوالے کیا ہے کہ وہ اس کے سینہ پر سر رکھ کر میٹھی نیند سو سکے۔ اسی ہی لئے اس کی تخلیق کا ظاہری جسم مٹی سے بنایا گیا اور اس کے استعمال کی ہر چیز مٹی سے بنائی گئی ہے۔ زمین کو قدرت نے اتنا سخت نہیں بنا دیا کہ آدم زاد اس پر چل نہ سکے' اتنا نرم نہیں بنایا کہ آدم زاد کے پیر زمین میں دھنس جائیں۔ اسے اختیار دیا گیا ہے کہ وہ زمین پر تصرف کر سکے اور زمین کے جسم میں دوڑنے والے خون Rays سے جس طرح چاہے استفادہ کرے۔ لاکھوں کروڑوں سال پہلے کے آدم کی طرح آج بھی آدم زاد زمین کے سینہ پر کھیتی باڑی کرنے میں مصروف عمل ہے۔ اس کھیتی کا ہر جزو بھی آدم کی طرح مٹی ہے۔ جو کچھ بوتا ہے اس کا بیج بھی مٹی ہے۔ پودا بھی مٹی کی بدلی ہوئی ایک شکل ہے۔ درخت بھی مٹی کے اجزاء سے مرکب ہے اور یہ پرشکوہ عمارت بھی مٹی ہے۔ بڑی بڑی ایجادات کا مصالحہ Raw Material بھی مٹی ہے۔ آدمی جس طرح سے سبز درخت اور ہرے بھرے لہلہاتے کھیت اُگاتا ہے۔ اسی طرح بلند و بالا عمارتیں۔ دیو ہیکل جہاز اور دیگر اشیاء بھی اس ہی کی تخلیق ہیں۔

آدمی مٹی ہوتا ہے اور مٹی سے ہی نتائج حاصل کرتا ہے۔ بوائی اور کٹائی کا یہ عمل متواتر اور مسلسل جاری ہے کیونکہ آدمی زمین پر ایک فعال رکن ہے اور قدرت نے اسے ارادے کا اختیار دیا ہے۔ عمل اور ردِ عمل' حرکت اور نتائج کے اس قانون کو نبی مکرم حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

"دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔"

موجودہ پُر آشوب دور میں قول و فعل میں تضاد کا عالم یہ ہے کہ ہر آدمی جانتا اور کہتا ہے زمین پر وقفہ زندگی محدود ہے لیکن اس کا عمل اس کے روزمرہ مشاہدہ کے خلاف ہے۔ وہ پوری زندگی ان خطوط پر گزارتا ہے جو قانون فطرت کے خلاف ہے تخریب کا نام اس نے ترقی رکھ دیا

ہے۔ دانشور انسان فلاح و بہبود کے طلسمی نام پر مستقبل کی ناخوش گواریوں کو جنم دیتا ہے۔ روشن نگاہی کا دعویٰ کر کے جو کچھ کرتا ہے وہ بدترین درجہ کی کوتاہ اندیشی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

سبحان اللہ کی خوب منظر نگاری ہے۔

ایٹم بم کو ترقی کا نام دے کر انسان کی اعلیٰ صلاحیتوں کا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے۔ یہ کوئی نہیں سوچتا فلاح و بہبود کے دعویٰ داروں نے ایک ایٹم بم کو لاکھوں قیمتی جانوں پر فضیلت بخش دی ہے۔ انسان قدرت کی دی ہوئی صلاحیتوں کا امین ہے۔ لیکن اس نے ان صلاحیتوں کو حرص و ہوس' خود غرضی' انا پرستی اور خود نمائی جیسے جذبات کی تسکین کے لئے اپنی ذات تک محدود کر دیا ہے۔ لیکن اس طرف کوئی توجہ نہیں دیتا کہ فانی دنیا کے اعمال بھی فانی ہیں۔ اگر اعمال میں تعمیر ہے تو اعمال یہاں اور آخرت میں جزا ہیں اور اگر اعمال میں تخریب ہے تو اس دنیا اور آخرت کی دنیا میں سزا ہے۔ جب وہ دنیا میں تخریب ہوتا ہے تو تخریب ہی کاٹتا ہے۔

☆☆☆

''عالم اعراف کی سیر''

آیئے!

آج آپ کو اعراف میں لے چلتے ہیں۔

یہ ایک ایسی بات ہے یہاں آ کر جو آباد ہو گیا پھر کبھی چشم پرنم نے کسی کو واپس آتے ہوئے نہیں دیکھا۔ عالم رنگ و بو کی تاریخ میں یہ کبھی نہیں ہوا کہ یہاں آ کر بسنے والے کسی شخص نے نقل مکانی کر کے یہ بتایا ہو کہ اس پر کیا گزرتی ہے اور وہ وہاں کس حال میں زندگی گزارتا ہے۔

آرام واستراحت اور غم وآلام کے اس ماحول سے ذرا دیر کے لیئے الگ ہو کر دیکھئے۔

قبرستان:

یہاں نئی، پرانی، کتبوں اور ٹائلوں سے مزین درخت کے پتوں میں سایہ فگن، سورج کی تپش اور تمازت میں جھلسی ہوئی، شکستہ اور کھلی ہوئی قبریں ہیں۔ ماحول میں اداسی گھلی ہوتی ہے۔ فضا خاموش اور ساکت ہے ہر طرف سناٹا ہے، ہو کا ایک عالم ہے اس عالم آب وگل میں امیر، غریب، بادشاہ غلام، ظالم، رحمدل، بوڑھے، جوان اور بچے سب موجود ہیں۔ مٹی کے ان ڈھیروں میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کا وجود دنیا کے لیئے رحمت تھا اور ایسے بھی جن کا وجود دنیا کے لیئے زحمت تھا اور ایسے بھی جن کے نام سے دنیا لرزہ براندام ہو جاتی تھی ایسے لوگ بھی مٹی کی آغوش میں سوئے ہوئے ہیں جن کی زندگی کا مقصد اپنی اور صرف اپنی ذات ہوتا ہے

یہاں دولت کے پجاری اور ایثار پیشہ سب ہی آباد ہیں۔

دیکھیئے۔

قبرستان کے ایک ویران گوشہ میں نقش ونگار سے مزین یہ کتنی خوبصورت قبر ہے۔

آیئے

اس قبر کے اندر دیکھیں کہ کیا ہو رہا ہے؟

دوزانو بیٹھ کر آنکھیں بند کر لیجئے۔ منہ بند کر کے ناک کے دونوں سوراخوں (نتھنوں) سے گہرائی میں سانس لے کر سینہ میں روک لیجئے جب تک آسانی کے ساتھ برداشت کر سکیں سانس کو سینہ میں جمع رکھیئے اور پھر منہ کھول کر آہستہ آہستہ اور بہت آہستہ سانس باہر نکال دیں۔ چند بار کے اس عمل سے دماغ کی وہ صلاحیت جو ٹائم اسپیس (Time Space) کی حدوں میں قید نہیں ہے متحرک ہو جاتی ہے۔ قانون یہ ہے کہ جب ہم اپنے اندر سانس لیتے ہیں تو ہم صعودی کیفیت میں سفر کرتے ہیں اور جب سانس باہر نکالتے ہیں تو نزولی کیفیات (آب وگل کے تاثرات) ہمارے اوپر مسلط ہو جاتی ہیں۔

بس ٹھیک ہے۔ غیب بینی کی صلاحیت حرکت میں آ گئی ہے یکسو ذہن کی پوری توجہ کے ساتھ روح کی آنکھ سے یہ دیکھئے کہ آپ قبر کے اندر موجود ہیں۔

اُف خدایا! کس قدر اندھیرا ہے سیاہ تاریک اور چمکدار۔ یہ تاریکی بادلوں کی طرح متحرک ہے۔ اب اس نے دائروں کی صورت اختیار کر لی ہے۔

تاریکی میں یہ روشنی کی کرن کیسی؟ تاریکی کی سیاہ چادر کو چاک کرتی ہوئی آ رہی ہے۔

اندھیرا اجالے میں تبدیل ہو گیا ہے۔

منظر کس قدر حسین ہے۔ ہر چہار سو مرکری روشنیاں چودھویں کے چاند کو شرما رہی ہیں۔

اس طرف دیکھیئے! یہ دروازہ ہے۔

چلیئے اس دروازہ سے اندر داخل ہوتے ہیں۔

یہاں تو پورا شہر آباد ہے۔

اس عظیم اور لاکھوں سال پرانے شہر میں فلک بوس عمارتیں، چھوٹے بڑے مکانات، پھونس سے بنی ہوئی جھونپڑیاں، دکانیں، بازار، میدان، ندی، نالے بھی ہیں۔ یہ شہر پتھر کے زمانے کے لوگوں کا مسکن ہے اور ترقی یافتہ دور کے لوگ بھی اس میں مکین ہیں۔

چور بازاری:

بازار میں ایک صاحب دکان لگائے بیٹھے ہیں۔ دوکان طرح طرح کے ڈبوں اور شیشے

کے جار سے بجی ہوئی ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ان ڈبوں اور شیشہ کے جاروں میں سامان کچھ نہیں ہے۔

کتنا اداس اور پریشان ہے یہ شخص؟

پوچھا تمہارا کیا حال ہے؟

کہا! میں اس بات سے غمگین ہوں کہ مجھے بیٹھے ہوئے پانچ سو سال گزر گئے ہیں اس طویل عرصہ میں میرے پاس ایک گاہک بھی نہیں آیا۔

میں دنیا میں ایک سرمایہ دار تھا منافع خوری اور چور بازاری میرا کاروبار تھا۔

تین ہزار سال:

برابر کی دکان میں ایک اور آدمی بیٹھا ہوا ہے بوڑھا آدمی ہے۔ بال الجھے ہوئے اور بالکل خشک چہرہ پر وحشت ہے۔ گھبراہٹ کا عالم ہے۔ سامنے کاغذ اور حساب کے رجسٹر پڑے ہیں یہ ایک کشادہ اور قدرے صاف دکان ہے۔ یہ صاحب کاغذ پر رقموں کی میزان دے رہے ہیں۔ رقموں کا جوڑ کرتے ہیں تو اعداد بلند آواز سے گنتے ہیں۔

کہتے ہیں دو اور تین سات، سات اور دو دس، دس اور پانچ بیس، میزان کر کے دوبارہ ٹوٹل کرتے ہیں تا کہ اطمینان ہو جائے۔ اب اس طرح میزان کرتے ہیں تین اور چار سات، سات اور تین بارہ۔ مطلب یہ ہے کہ ہر مرتبہ جب میزان کی جانچ پڑتال کرتے ہیں میزان صحیح نہیں ہے تو وحشت زدہ ہو کر بال نوچتے ہیں خود کو کوستے ہیں بڑبڑاتے اور دیوار سے سر ٹکراتے ہیں اور پھر میزان دینے میں منہمک ہو جاتے ہیں۔

بڑے میاں کی خدمت میں عرض کیا۔ جناب یہ کیا ہو رہا ہے اور آپ کتنی مدت سے اس پریشانی میں گرفتار ہیں۔

بڑے میاں نے غور سے دیکھا اور کہا۔

''میری حالت کیا ہے کچھ بتا نہیں سکتا چاہتا ہوں کہ رقموں کی میزان صحیح ہو جائے مگر تین ہزار سال ہو گئے ہیں کم بخت یہ میزان صحیح ہونے میں نہیں آتی۔

میں زندگی میں لوگوں کے حسابات میں دانستہ ہیر پھیر کرتا تھا بد معاملگی میرا شعار تھا۔

''سو جس نے کی ذرہ بھر بھلائی وہ دیکھ لے گا اور جس نے کی ذرہ بھر برائی وہ دیکھ لے گا۔'' (قرآن)

اللہ کے ساتھ مکر:

علماء سے تعلق رکھنے والے ان صاحب سے ملیئے:

داڑھی اتنی لمبی کہ جیسے جھڑ بیر کی جھاڑی۔ اتنی بڑی کہ اس میں پیر چھپے ہوئے ہیں۔ چلتے ہیں تو داڑھی اکٹھا کر کے اپنی کمر کے اردگرد لپیٹ لیتے ہیں اس طرح جیسے پٹکا لپیٹ لیا جاتا ہے۔ چلتے وقت داڑھی کھل جاتی ہے۔ اور اس میں الجھ کر زمین پر اوندھے منہ گر جاتے ہیں۔ اٹھتے ہیں تو داڑھی میں الجھ کر پھر منہ کے بل زمین پر گرتے ہیں۔ سوال کرنے پر بتایا۔

دنیا میں لوگوں کو دھوکہ دینے کے لیئے میں نے داڑھی رکھی ہوئی تھی اس کے ساتھ ساتھ داڑھی رکھنا میرے لیئے بہت بڑی نیکی بھی تھی۔ میں اس نیکی کے ذریعے بہت آسانی سے سیدھے اور نیک دل لوگوں سے اپنی مطلب براری کر لیتا تھا۔

لوگ اللہ کے ساتھ مکر کرتے ہیں اور اللہ بہترین تدبیر کرنے والا ہے۔ (قرآن)

فرشتے:

وہ دیکھیئے، دور بستی سے باہر ایک صاحب زور زور سے آواز لگا رہے ہیں۔ اے لوگو! آؤ! میں تمہیں اللہ کی بات سناتا ہوں۔ اے لوگو! آؤ اور سنو اللہ تعالیٰ کیا فرماتا ہے۔ کوئی بھی آواز پر کان نہیں دھرتا۔ البتہ فرشتوں کی ایک ٹولی ادھر آ نکلتی ہے۔ فرشتے کہتے ہیں۔

ہاں سناؤ اللہ تعالیٰ کیا فرماتے ہیں؟

ناصح کہتا ہے۔

میں بہت دیر سے پیاسا ہوں پہلے مجھے پانی پلاؤ۔ پھر بتاؤں گا اللہ تعالیٰ کیا ارشاد کرتا ہے۔

فرشتے کھولتے ہوئے پانی کا پیالہ منہ کو لگا دیتے ہیں ہونٹ جل کر لٹک جاتے ہیں اور سیاہ ہو جاتے ہیں اور جب یہ شخص پانی پینے سے انکار کرتا ہے تو فرشتے یہی ابلتا ہوا پانی اس

کے منہ پر انڈیل دیتے ہیں۔ ہنستے اور قہقہے لگاتے ہوئے بلند آواز سے کہتے ہیں مردود کہتا تھا آؤ اللہ کی بات سنو۔ دنیا میں بھی اللہ کے نام کو بطور کاروبار استعمال کرتا تھا اور یہاں بھی یہی کر رہا ہے جھلسے اور جلے ہوئے منہ سے ایسی وحشت ناک آوازیں اور چیخیں نکل رہی ہیں کہ انسان کو سننے کی تاب نہیں۔ چلئے دور اور بہت دور بھاگ چلیں۔

میری آیتوں کا کاروبار نہ کرو (قرآن)

لگائی بجھائی:

اس عظیم الشان شہر میں یہ ایک تنگ و تاریک گلی ہے۔ گلی کے اختتام پر کھیت اور جنگل ہیں۔ یہاں ایک مکان بنا ہوا ہے مکان کیا ہے بس چار دیواری ہے۔ اس مکان پر کسی ابر نما چیز کی جالی دار چھت پڑی ہوئی ہے اس لیے دھوپ اور بارش سے بچاؤ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس مکان میں صرف عورتیں ہی عورتیں ہیں چھت اتنی نیچی ہے کہ آدمی کھڑا نہیں ہوسکتا ماحول میں گھٹن اور اضطراب ہے۔ ایک صاحبہ ٹانگیں پھیلائے بیٹھی ہیں عجیب اور بڑی ہی عجیب بات یہ ہے کہ ٹانگوں کے اوپر کا حصہ معمول کے مطابق اور ٹانگیں کم از کم دس دس فٹ لمبی ہیں اس ہیئت کذائی میں دیکھ کر ان صاحبہ سے پوچھا۔ یہ کیا معمہ ہے؟

عورت مذکور نے جواب دیا۔

میں دنیائے فانی میں جب کسی کے گھر جاتی تھی تو اس گھر کی سن گن لے کر دوسرے گھر میں جا کر بڑھا چڑھا کر پیش کرتی تھی یہ وہی عادت ہے جس کو دنیا والے لگائی بجھائی سے موسوم کرتے ہیں۔

اب حال یہ ہے کہ چلنے پھرنے سے معذور ہوں ٹانگوں میں انگارے بھرے ہوئے ہیں۔

ہائے! میں جل رہی ہوں اور کوئی نہیں جو مجھ پر ترس کھائے۔

چغل خور جنت میں نہیں جائے گا۔ (حدیث)

غیبت:

چہرہ پر خوف اور ڈر نمایاں، یہ شخص چھپتے چھپاتے دبے پاؤں، ہاتھ میں چھری لیئے کہاں جا

رہا ہے؟

اُو! اس نے سامنے کھڑے ہوئے ایک آدمی کی پشت میں چھری گھونپ دی اور بہتے ہوئے خون کو کتے کی طرح زبان سے چاٹنا شروع کر دیا۔ تازہ تازہ اور گاڑھا خون پیتے ہی قے آ گئی۔ خون کی قے۔

جسم سے گوشت کا ایک ٹکڑا کاٹ کر کھایا تھا چہرہ پر حزن وملال آ گیا۔

نحیف و نزار زندگی سے بیزار کراہتے ہوئے اس مردار خور آدمی نے کہا۔

کاش عالم فانی میں یہ بات میری سمجھ میں آ جاتی کہ غیبت کا یہ انجام ہوتا ہے۔

جو شخص دنیا میں غیبت کریگا وہ مردار کھائیگا اور ناک بھوں چڑھا کر غل مچائے گا۔ (حدیث)

پیٹ میں انگارے:

شکل وصورت سے انسان، ڈیل ڈول کے اعتبار سے دیو۔ قد تقریباً بیس فٹ۔ جسم بے انتہا چوڑا قد کی طوالت اور جسم کی چوڑائی کی وجہ سے کسی کمرہ یا گھر میں رہنا ممکن نہیں ہے۔ بس ایک کام ہے کہ اضطرابی کیفیت میں یہ صاحب مکانوں کی چھتوں پر ادھر سے ادھر اور اُدھر سے اِدھر گھوم رہے ہیں بیٹھ نہیں سکتے لیٹ بھی نہیں سکتے۔ ایک جگہ قیام کرنا بھی ان کے بس کی بات نہیں۔ اضطراری کیفیت میں اس چھت سے اس چھت پر اور اس چھت سے اس چھت پر چھلانگیں لگا رہے ہیں۔ کبھی روتے ہیں۔ کبھی بے قرار ہو کر پیر پٹختے ہیں۔

پوچھا! یہ کیا تماشہ ہے؟ اسقدر غمگین اور پریشان ہونے کی آخر کیا وجہ ہے۔ الحفیظ والامان، یہ کس عمل کی پاداش ہے؟

جواب دیا۔

میں نے دنیا کی چندروزہ زندگی میں یتیموں کا حق غصب کر کے بلڈنگیں بنائی تھیں یہ وہی بلڈنگیں اور عمارتیں ہیں آج جن کے دروازے میرے اوپر بند ہیں لذیذ اور مرغن کھانوں نے میرے جسم میں ہوا اور آگ بھر دی ہے۔ ہوا نے میرے جسم کو اتنا بڑا، اتنا بُرا کر دیا کہ میرے لیئے گھر میں رہنے کا تصور بھی عذاب بن گیا ہے۔ آہ آہ۔ یہ آگ مجھے جلا رہی ہے میں جل رہا

ہوں بھاگنا چاہتا ہوں مگر فرار کی ساری راہیں مسدود ہوگئی ہیں۔

جو لوگ یتیموں کا مال کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں انگارے بھرتے ہیں۔" (قرآن)

بادشاہ اور ملکہ:

اچھا! آپ مغل خاندان کی عظیم ملکہ نور جہاں ہیں۔

آپ کو کیا تکلیف ہے۔ چہرے پر پژمردگی جھنجلاہٹ بے قراری اور غیض وغضب کے آثار اتنے زیادہ نمایاں کیوں ہیں۔

میں نہیں جانتی کہ آپ کون صاحب ہیں۔ مرنے کے بعد سے آج تک کسی نے میری خبر نہیں لی۔ میں اپنی کنیزوں کو آواز دیتی ہوں تو وہ میرے اوپر ہنستی ہیں دو گھڑی کے لیئے بھی کوئی میرا ہمدم نہیں ہے۔ تنہائی اور مسلسل نظر انداز کر دینے والے عوامل نے میری اس زندگی کو زہریلا کر دیا ہے۔ میں آخر ملکہ ہوں لوگ میرے اوپر ہنستے کیوں ہیں۔ میرا حکم کیوں نہیں مانتے مجھ سے دور کیوں بھاگتے ہیں۔

بر مزار ما غریباں نے چراغ نے گلے
نے پر پروانہ سوزو نے صدائے بلبلے

دوزخ:

چلتے چلتے ان صاحبہ سے ملتے چلیں۔

بہن! یہ آپ اوپر بار بار کیا دیکھتی ہیں

میں کیا دیکھتی ہوں؟ میں جس عالم میں ہوں یہاں سب لوگ ایسے ہیں، جن پر جنت کے دروازے بند ہیں۔ اس عالم سے اوپر وہ لوگ ہیں جو جنت کے نظارے کرتے ہیں۔ میں اس غم میں گھل رہی ہوں۔ کہ میں جنت کا نظارہ کرنے والوں میں کیوں نہیں ہوں۔ جب بھی یہ خیال ذہن میں ابھرتا ہے مجھے ایک ہی جواب ملتا ہے کہ میں نے اپنے خاوند کے ہمدردانہ سلوک کی ہمیشہ ناشکری کی ہے۔

فرمایا۔ رسول اللہ ﷺ نے میں نے مردوں کی نسبت، عورتوں کو دوزخ میں زیادہ دیکھا

ہے۔ ایسی عورتیں اپنے خاوند کی ناشکری کرتی ہیں۔ خاوند کتنا ہی اچھا سلوک کرے وہ یہی کہتی ہیں کہ ہمارے ساتھ کچھ نہیں کیا گیا۔

اعراف کیا ہے؟

اس بے آب وگل عظیم آبادی میں گروہ در گروہ رہتے ہیں۔ فریبی، دھوکہ باز، قاتل چور، حاسد وغیرہ وغیرہ ایک طرز فکر کے لوگ ایک جگہ رہتے ہیں یہ اعراف "سجین" کا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق مرنے کے بعد نوع انسان اور جنات کے دو طبقے (زون) ہیں۔ ایک اعلیٰ، دوسرا اسفل اعلیٰ اور اسفل کی قرآن پاک میں اس طرح وضاحت کی گئی ہے۔

وما ادراک ما علیین و ما ادراک ما سجین کتاب المرقوم۔ آپ کیا سمجھے علیین کیا ہے اور آپ کیا سمجھے سجین کیا ہے یہ ایک لکھی ہوئی کتاب (ریکارڈ فلم) ہے۔ انسان دنیا میں جو کچھ کرتا ہے وہ سب کا سب فلم کی صورت میں ریکارڈ ہو جاتا ہے۔

☆☆☆

باب سوئم

"اللہ کو پہچانیے"

بسم اللہ الرحمان الرحیمo والراسخون فی العلم یقولون امنا به کل من عند ربنا.

معزز سامعین!

یوں تو ہر آدمی یہ کہتا ہے۔آپ تشریف لائے۔ہمیں بڑی خوشی ہوئی۔یہ ایک طریقہ کار بھی ہے۔خوشی تو بہر حال ہوتی ہے مگر مجھے اس وقت جو محسوس ہوا وہ یہ ہے کہ ابھی زمین بنجر نہیں ہوئی' ابھی زمین کے اوپر ایسے لوگ موجود ہیں جو اللہ کی آواز کو سننا چاہتے ہیں اور اللہ کی آواز کو سن کر اللہ کی قربت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔اگر ایسا نہ ہوتا تو ظاہر ہے کہ آپ اپنی بے پناہ مصروفیات میں سے وقت نکال کر یہاں نہ آتے۔

ماشاء اللہ! آپ تین چار گھنٹوں سے بیٹھے ہوئے ہیں اور جس نے جو کہا وہ آپ نے سنا۔اگر آپ کے اندر تلاش نہ ہوتی اللہ کی طلب نہ ہوتی تو آپ اتنی دیر یہاں نہ ٹھہر سکتے۔یہ اللہ کا بڑا کرم ہے انعام ہے کہ دھرتی پر اللہ کی زمین پر ابھی ایسے لوگ موجود ہیں کہ جو ابھی یہ سمجھنا چاہتے ہیں۔

کہ ہم پیدا کیوں ہوئے؟

پیدا ہونے سے پہلے ہم کہاں تھے؟

اور جب پیدا ہو گئے تو ایک معینہ مدت یہاں رہنے کے بعد ہم کہاں چلے جاتے ہیں؟

لوگ یہ سمجھنا چاہتے ہیں کہ انسان میں اور حیوانات میں بنیادی فرق کیا ہے؟

عقل و شعور والے لوگ جب انسانی زندگی کا تجزیہ کرتے ہیں تو انہیں یہ بات نظر آتی ہے کہ اگر انسانی زندگی کا مقصد کھانا پینا' سونا جاگنا' گھر بنانا اور معاش کے لیئے جدو جہد کرنا

ہی ہے تو یہ سارے کام ایک بکری بھی کرتی ہے' ایک گائے بھی کرتی ہے اور ایک کبوتر بھی کرتا ہے۔

اگر انسان اور حیوانات میں کوئی امتیاز ہے تو وہ کیا ہے؟

پھر انسان یہ بھی سوچنا چاہتا ہے سوچتا ہے اور سمجھنا چاہتا ہے کہ میری پیدائش کا مقصد کیا ہے؟ مجھے کیوں پیدا کیا گیا ہے؟

زمین پر پہلے سے یہ دنیا آباد تھی شجر و انہار بھی موجود تھے پرندے اور چوپائے بھی موجود تھے۔پھر کیوں ایک نئی مخلوق پیدا کرنے کی ضرورت پیش آئی؟ وہ اس کا بھی جواب چاہتا ہے۔

اگر ہم مجموعی طور پر اللہ تعالیٰ کی ہستی کا تذکرہ کریں اور اللہ تعالیٰ کو سمجھنا چاہیں کہ اللہ کی ہستی کیا ہے تو ہم ایک ہی بات کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی لامتناہی صلاحیتوں کا ایک symbol ہے۔اتنی صلاحیتیں' اتنی طاقتیں کہ ان کا شمار دنیا میں نہیں ہے۔وہ نسل کو بڑھانے اور نسل کو کم کرنے والا بھی ہے۔زمین کے اندر نشوونما پیدا کرنے والا بھی ہے۔

اس دنیا کے اوپر جتنی بھی چیزیں آپ کو موجود نظر آتی ہیں ان میں ہر چیز کا وجود کسی نہ کسی صلاحیت کے ساتھ ہے۔مثلاً درخت کا ایک بیج آپ زمین میں ڈالتے ہیں تو پہلے وہ چھوٹا سا پودا بنتا ہے پھر اتنا بڑا درخت بن جاتا ہے کہ اس کے نیچے قافلے رکتے ہیں اور دھوپ کی تمازت سے بچنے کیلئے اس کے سائے میں بیٹھتے ہیں۔

کہنے کی تو یہ بات ہے کہ آپ نے زمین میں ایک بیج ڈال دیا اور اس کا درخت بن گیا' لیکن اگر براہ راست بات کی جائے تو یوں کہیں گے کہ یہ درخت بیج کی صلاحیت ہے۔بیج کے اندر جو صلاحیت تھی اس صلاحیت کا مظاہرہ درخت کی شکل میں ہو گیا۔اتنا چھوٹا بیج خشخاش کے دانے سے بھی چھوٹا بیج زمین کے اندر آپ نے ڈالا اور دیکھتے ہی دیکھتے بہت بڑا درخت بن گیا۔ربڑ کا درخت بن گیا ہم یوں کہیں گے کہ باجرے سے بھی چھوٹا بیج کی Micro Film ہے تو مائیکرو فلم نے جب اپنے آپ کو ڈسپلے کیا یا زمین نے اسے (Display) کیا تو

وہ اتنا چھوٹا بیج جو آپ کی ہتھیلی میں ہزاروں کی تعداد میں آجاتا ہے۔ وہ بیج ایک بہت بڑے درخت کی شکل میں سامنے آیا تو گویا اس چھوٹے سے بیج کے اندر اتنا بڑا درخت موجود تھا۔ یا ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ بیج کسی درخت کیلئے مائیکروفلم کے طور پر کام کررہا ہے۔

اسی طرح جب ہم زمین کا تذکرہ کرتے ہیں تو زمین کے تذکرے میں یہی بات آتی ہے کہ زمین ایک ایسی صلاحیت کا نام ہے جس میں پانی کا دخل ہے۔ ہواؤں کا دخل ہے (Petrol) پیٹرول کا دخل ہے تیل کا دخل ہے اور دیگر معدنیات کا دخل ہے۔ یہ سب زمین کی صلاحیتوں کے نام ہیں۔ مثلاً زمین کی وہ صلاحیت جو لوہے کی شکل میں ہوتی ہے اس معمولی سی صلاحیت سے ہوائی جہاز بن جاتے ہیں۔ بحری جہاز بن جاتے ہیں۔ (Rails) اور موٹر گاڑیاں بن جاتی ہیں۔ بلڈنگیں بن جاتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں جو کچھ ہے اس کا تعلق صلاحیت سے ہے سورج بھی ایک صلاحیت ہے۔

سورج کے اندر (Rays) نہ ہوں۔ رنگ نہ ہوں تو دنیا میں کھیتی باڑی کا وجود ہی نہ رہے۔ کھانے کیلئے خوراک آپ کو نہیں ملے گی اس کا مطلب یہ ہے کہ سورج کے اندر یہ صلاحیت اللہ تعالیٰ نے رکھ دی ہے کہ آپ کو رنگ فراہم کرے۔ آپ کے کھیتوں کو پکائے۔ آپ کے نظام صحت کو برقرار رکھنے کیلئے ایک اہم رول ادا کرے۔ سورج سے آپ کو روشنی ملے گی اور سورج کی روشنی سے آپ دن اور رات کی صلاحیتوں کا اندازہ کرسکیں گے۔

سورج ایک صلاحیت ہے سورج کا مطلب ہوا دن، دن ایک صلاحیت ہے۔ تو دوسری صلاحیت رات ہے۔ جب ہم دن کی صلاحیت پر غور کرتے ہیں تو ہمیں ہمارا ہر قدم محدود اور مقید نظر آتا ہے۔ ہم دو قدم بھی اگر چلیں گے تو ان دو قدم کیلئے ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم Space کی محتاجی کو تسلیم کریں اسپیس نہیں ہوگی تو دو قدم نہیں اٹھیں گے اور دو قدم اٹھانے میں (Time) کی پابندی بھی ہمارے لئے ضروری ہوجائے گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دن اور رات کی جو حرکات وسکنات ہیں وہ تابع ہیں دن اور رات کی صلاحیتوں کے تو دو صلاحیتیں

آپکے پاس آگئیں۔

دن اور رات!

اب جب ہم دن کے حواس کا کھوج لگاتے ہیں تو ہمارے اوپر زمانیت و مکانیت (Time and Space) کا غلبہ ہوتا ہے اور ہم کسی بھی طرح اس غلبے کو توڑ نہیں سکتے لیکن جب ہم رات کے حواس کا تذکرہ کرتے ہیں تو ہم ٹائم اور اسپیس دونوں سے آزاد ہوجاتے ہیں۔ اس کی مثال آپ کا خواب دیکھنا ہے خواب کی حالت میں آپ میلوں میل سفر کرتے ہیں اور جب جاگتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ وہیں بستر پر تھے۔ ایک منٹ بھی نہیں گزرا آپ لندن سے لاہور بھی ہو آئے اور داتا صاحب کے مزار پر فاتحہ بھی پڑھ کر آگئے۔

پھر دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتے ہیں۔

يخرج الحى من الميت و يخرج الميت من الحى o

وہ زندے کو مردے سے نکال لیتا ہے اور مردے کو زندے سے۔

و يولج اليل فى النهار و يولج النهار فى اليل o ہم رات دن میں داخل کرتے ہیں اور دن کو رات میں کہ یہ رات اور دن جو ہیں یہ انسان کے اندر دو صلاحیتیں ہیں۔ دو حواس ہیں اور یہ دونوں صلاحیتیں، دو حواس کوئی الگ الگ یونٹ نہیں ہیں پھر ایک ایسی کوئی چیز ہے جس کے اوپر یہ دونوں حواس چپکے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سورۃ یٰسین میں فرماتے ہیں۔

وايت لهم اليل نسلخ منه النهار ۔ترجمہ: اور ایک نشانی ان کیلئے رات ہے کہ اس میں سے ہم دن کو کھینچ لیتے ہیں۔

اب مطلب یہ ہوا کہ انسان جو ہے، وہ دو صلاحیتوں سے مرکب ہے ان دو صلاحیتوں میں بے شمار صلاحیتیں ذخیرہ ہیں۔ محفوظ ہیں۔ اب ان دو صلاحیتوں کو سمجھنے کیلئے وقت چاہیے اور وقت میرے پاس بہت کم ہے۔

صورت حال یہ ہے کہ انسان کے اندر اللہ تعالیٰ نے جو صلاحیتیں رکھی ہیں۔ روحانی نقطہ نظر سے جو روح کی آنکھ نظر آتی ہے وہ بہتر ہزار ۷۲۰۰۰ ہیں۔ یعنی ۷۲۰۰۰ وہ صلاحیتیں جنکو

روحانی لوگوں نے سمجھ لیا دماغ میں بارہ کھرب Cells کام کرتے ہیں اور ہر Cell ایک صلاحیت ہے۔ دماغ میں کام کرنے والے ان بارہ کھرب سیلز کی کارکردگی کا ابھی پوری طرح نہ تو روحانی لوگوں نے احاطہ کیا ہے اور نہ سائنسدانوں نے۔ روحانی لوگوں نے جن سیلز یا صلاحیتوں کا احاطہ کرلیا ہے وہ ۷۲۰۰۰ ہیں تو گویا ہر انسان کم از کم ۷۲۰۰۰ ہزار صلاحیتوں سے مرکب ہے۔ اور اگر وہ خود کو پہچان لے تو اپنے اندر مخفی ان ۷۲۰۰۰ صلاحیتوں سے آشنا ہو جائے گا جبکہ عام زندگی میں (Genius) جن لوگوں کو کہتے ہیں ان کے اندر ۲۲۵ صلاحیتیں (Active) ہوتی ہیں۔ ۲۲۵ سے زیادہ صلاحیتوں کا آدمی ابھی تک دنیا میں پیدا نہیں ہوا۔ جو ان ۲۲۵ صلاحیتوں کو سمجھ کر ان سے کام لے سکا ہو۔

انسان کے اندر موجود ۷۲۰۰۰ صلاحیتوں کو کام میں لانے کیلئے ان سے استفادہ کرنے کیلئے ان کی بنیاد پر (Galaxies) کے اندر داخل ہو کر ان کے تخلیقی فارمولے معلوم کرنے کیلئے، سورج کی روشنی ہے یا نہیں؟

اس کو معلوم کرنے کیلئے

زمین اپنے مدار پر کیوں گھوم رہی ہے؟

طولانی اور محوری گردش کیوں ہے؟

سات آسمان کیا ہیں؟

چھ دن کیا ہیں؟

عرش کیا ہے؟

کرسی کیا ہے؟

بیت المعمور کیا ہے؟

سدرۃ المنتہا کیا ہے؟

حجاب عظمت کیا ہے؟

حجاب کبریا کیا ہے؟

حجاب محمود کیا ہے؟

مقام محمود کیا ہے؟

سیدنا حضور علیہ الصلوۃ والسلام کا مقام کیا ہے؟

تجلی کیا ہے؟

تدلی کیا ہے؟

اللہ کی صفات کیا ہیں؟

مشیت کیا ہے؟

اور خود اللہ کی ذات کیا ہے؟

یہ معلوم کرنے کیلئے انسان کو ۷۲۰۰۰ صلاحیتوں سے واقف ہونا ضروری ہے اور یہ بہتر ہزار صلاحیتیں معلوم کرنے کیلئے ان بہتر ہزار صلاحیتوں کو ایکٹو (Active) کرنے کیلئے روحانی لوگوں نے جو قاعدہ بنایا ہے وہ یہ ہے کہ ہر انسان کے اندر اللہ تعالیٰ کی طرف سے چھ (Generator) نصب ہیں اور ہر Negative / Positive کے قانون کے تحت چل رہا ہے۔ ان میں جو (Current) دوڑ رہا ہے اسکی ترتیب کچھ اس طرح ہے۔

ہم کہتے ہیں روشنی! روشنی تک ہمارے سائنسدان پہنچ گئے ہیں۔

المیہ یہ ہے کہ مسلمان ابھی تک تو اس کا یقین ہی نہیں کر رہا غیر مسلم وہاں تک پہنچ گئے ہیں اور انہوں نے Aura کی تصویر بھی لے لی ہے یہی بات جب دو سو سال پہلے حضرت شاہ ولی اللہ نے فرمائی تھی تو لوگوں نے اس جرم میں ان کے ہاتھ توڑ ڈالے تھے۔ مسلمانوں نے فتوے صادر کئے کہ صاحب قرآن کا ترجمہ فارسی میں کیا ہے کہ انسان کے اوپر ایک نور کا انسان ہوتا ہے۔ ایسی ایسی باتیں کرتا ہے اس جرم میں ان کے دونوں ہاتھ تڑوا دیئے گئے۔ آج دو سو سال کے بعد (Scientist) جب یہی بات کہتا ہے کہ اس جسم کے اوپر ایک اور جسم ہوتا ہے تو ہر آدمی آنکھیں بند کر کے اعتبار کر رہا ہے۔ مگر اس کے باوجود کہ انسان اورا Aura کا اعتبار کر رہا ہے اس کو سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہا۔

بہر حال انسان کے اوپر روشنی کا بنا ہوا ایک اور انسان ہوتا ہے۔

اب روشنی ستاروں کی بھی ہے۔ روشنی چاند کی بھی ہے۔ روشنی سورج کی بھی ہے اور روشنی (Electricity) کی بھی ہے تو یہ جو انسان کے ٹھوس جسم سے ۹ انچ کے فاصلے پر روشنی کا ایک اور انسان ہوتا ہے اسکی روشنی کس قسم کی روشنی ہے؟ یہ روشنی ایسی روشنی ہے جس میں کثافت بھی شامل ہوتی ہے۔ پھر اس آدمی کے اوپر ایک اور آدمی ہے وہ نور کا بنا ہوا ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

اللہ نور السمٰوت والارض o یعنی زمین و آسمان اللہ کے نور سے بنے ہوئے ہیں۔ اس نورانی انسان کے اوپر ایک اور انسان ہوتا ہے تجلی کا انسان تو انسان روحانی نقطہ نظر سے تین رخوں سے مرکب ہے ایک روشنی کا آدمی۔ ایک نور کا آدمی اور ایک تجلی کا آدمی۔

روشنی کا آدمی Aura اس مادی دنیا میں چلتا پھرتا ہے اس مادی دنیا میں دو رخوں پر سفر کرتا ہے ایک (Time and Space) میں پابند اور دوسرا ٹائم اور اسپیس سے آزاد اس کی صورت یہ بھی ہے کہ جتنا آپ رفتار کو بڑھا لیں گے اسی تناسب سے آپ کے Aura کی رفتار بڑھ جائے گی اسکی مثال ہوائی جہاز اور راکٹ کا سفر ہے۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ جب آپ ہوائی جہاز میں بیٹھتے ہیں تو آپ کے اورا (Aura) کی رفتار وہی رہتی ہے جو اس سے قبل تھی۔

قانون یہ ہے کہ جس رفتار سے آپ سفر کریں اسی رفتار سے روشنی کا جسم اپنی رفتار کو اس کے قریب کرلے گا۔ یہ روشنی کا جسم وہی ہے جس سے ہم نئی نئی ایجادات کرتے ہیں اس سے ہم لاسلکی نظام بناتے ہیں۔ اس آدمی کی صلاحیت سے ہم اجرام سماوی کو دیکھ سکتے ہیں۔ اور اجرام سماوی میں یہ جو چاند، سورج، ستارے ہیں ان کی حرکات وسکنات کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔

دوسرا آدمی جو نور کا بنا ہوا ہے اس آدمی کی صلاحیت سے ہم آسمانوں کے اندر داخل ہو سکتے ہیں۔ سات آسمانوں کو دیکھ سکتے ہیں۔ بیت المعمور کو دیکھ سکتے ہیں۔ جنت کو دیکھ سکتے ہیں۔

اب آسمان کیا چیز ہے؟ یہ بہت بڑا موضوع ہے اس کو سمجھانے کیلئے مجھے کم از کم ڈیڑھ گھنٹہ درکار ہے۔

اب تیسرا آدمی جو ہے تجلی کا آدمی ہے۔ تجلی کے آدمی کے اندر یہ صلاحیت ہے کہ وہ اللہ کی آواز سنتا ہے اور اس کا جواب دیتا ہے اور یہ ساری باتیں جو میں آپ سے عرض کر رہا ہوں یہ قرآن پاک کی آیتوں میں موجود ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے جب کن کہا تو ساری کائنات تخلیق ہو گئی اس مرحلے میں روحیں بے آواز تھیں۔ نہ ان کے اندر سماعت تھی نہ بصارت، نہ یہ سنتی تھیں نہ بولتی تھیں اور نہ محسوس کرتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان روحوں کے اندر جب حواس پیدا کرنا چاہے اللہ تعالیٰ نے جب چاہا کہ جن روحوں کو میں نے وجود بخشا ہے ان روحوں کا مجھ سے جو تعلق ہے وہ ان کو معلوم ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ان روحوں سے مخاطب ہو کر فرمایا:۔

الست بربکم o کیا میں تمہارا رب نہیں؟

جیسے ہی اللہ تعالیٰ کی آواز روح کے کانوں یا سماعت سے ٹکرائی۔ روح کے اندر قوت سماعت پیدا ہو گئی۔ اور فوراً سماعت جب انسان کے اندر گونجی۔ میں تمہارا رب ہوں، میں تمہارا رب ہوں؟ میں تمہارا رب ہوں؟ اس گونج میں، اس آواز میں روح کے اندر تجسس پیدا ہوا کہ کون ہے جو یہ کہہ رہا ہے؟ کہ میں تمہارا رب ہوں؟ اس تجسس کی بنیاد پر روح اس آواز کی طرف متوجہ ہوئی اور یوں روح نے اللہ کا دیدار کر لیا۔ اللہ کو دیکھتے ہی روح پکار اٹھی۔ (قالو بلیٰ)

آپ کو دیکھ لیا ہے۔ ہم اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ آپ ہمارے رب ہیں۔۔ اب دیکھیئے! روح پیدا ہونے سے پہلے اللہ تعالیٰ کے ذہن میں موجود تھی۔

مثال کے طور پر...... مثال تو ناقص ہے لیکن سمجھنے کیلئے مثال تو دینی ہی پڑتی ہے.........

آپ ایک ڈرامہ لکھنا چاہتے ہیں تو ڈرامہ کہاں ہوتا ہے۔ آپ کے دماغ میں ہوتا ہے۔ آپ اس ڈرامے کو کاغذ پر اتار لیتے ہیں۔ اب آپ فلم بنالیں۔ ٹی وی پر دکھادیں مطلب یہ کہ سارے کردار ڈرامہ نویس کے دماغ میں ہوتے ہیں۔ دماغ سے کاغذ پر منتقل ہوتے ہیں اسی طرح یہ کائنات وجود میں آنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کے ذہن میں موجود تھی۔ اللہ تعالیٰ نے

جب اس کائنات کو وجود بخشنا چاہا تو فرمایا۔

ہو جا!

تو ساری کائنات پیدا ہو گئی۔ جب کائنات وجود میں آ گئی تو اللہ تعالیٰ نے اسے اپنا تعارف کرایا کہ میں تمہارا رب ہوں۔ کائنات کی مخلوق نے جب اس آواز کی طرف متوجہ ہو کر اس آواز کو سنا۔ چونکہ اس نے مشاہدہ کر لیا تھا۔ اس مشاہدے کی بنیاد پر اس نے اقرار کیا کہ

جی ہاں آپ ہمارے رب ہیں۔

تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ سماعت و بصارت کے بعد مخلوق میں معنی پہنانے کی صلاحیت بھی پیدا ہو گئی کہ میں مخلوق ہوں اور یہ خالق ہے جب یہ صلاحیت مخلوق کے اندر پیدا ہو گئی تو اس کے اندر ادراک پیدا ہو گیا کہ مخلوق اور خالق کیا ہیں۔ الگ الگ وہ یونٹ ہیں جب یہ ادراک پیدا ہو گیا۔ اپنا الگ' اور خالق کا الگ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ مخلوق اپنی ذات سے واقف ہو گئی۔ اپنی نوع سے واقف ہو گئی۔ اپنی نوع سے اس واقفیت کا صاف مطلب ہے کہ مخلوق کے اندر جو اعلیٰ (Receptionary Sense) ہے وہ متحرک ہو گیا اور اس نے معنی پہنانے شروع کر دیئے اب یہ تین رخ ہو گئے۔ ایک روشنی کا آدمی' ایک نور کا آدمی اور ایک تجلی کا آدمی تو یہ تجلی کا آدمی نزول کر کے روشنی کے آدمی تک منتقل ہوا۔ پھر یہی روشنی کا آدمی پلٹ کر' صعود کر کے پھر تجلی کا آدمی بن جاتا ہے۔ جہاں یہ تجلی کا آدمی بنتا ہے اسکو تصوف والے روحانیت والے علم امر کہتے ہیں۔ اور جہاں یہ تجلی کا آدمی اس پوزیشن میں آ جاتا ہے جو کن سے پہلے تھی۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے حافظے میں دوبارہ منتقل ہو جاتا ہے۔ اسکو ابدالآباد کہتے ہیں۔

کہانی تو یہ بہت بڑی ہے مگر مختصراً میں نے عرض کیا کہ انسان جو ہے اتنی صلاحیتوں کا مالک ہے کہ وہ اللہ کو دیکھ سکتا ہے اللہ سے بات کر سکتا ہے اللہ سے اپنی بات منوا سکتا ہے۔ اللہ سے محبت کر سکتا ہے اور یہ دیکھ سکتا ہے کہ اللہ اس سے کتنی محبت کرتا ہے۔ جتنے بھی علوم ہیں وہ فلسفی حضرات نے پیش کئے ہوں یا انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام نے نوع انسانی کو عطا کئے ہوں ان میں ایک ہی علم پر زور دیا جاتا ہے کہ ہر مخلوق کا خالق کے ساتھ براہ راست ایک رشتہ ہے

اور وہ ایسا رشتہ ہے کہ اسکو مخلوق پہلے سے دیکھ بھی چکی ہے۔ مخلوق پہلے اللہ کی آواز بھی سن چکی ہے اب ہم یوں کہیں گے کہ جب ہم یہاں پیدا نہیں ہوئے تھے تو ہماری روح وہاں موجود تھی اس روح نے اللہ کو دیکھا۔ اللہ کی آواز سنی اور اللہ کی ربوبیت کا اقرار بھی کیا۔ پھر نزول کرتے کرتے وہ روشنی کے آدمی میں منتقل ہو گئی۔ اس روشنی میں کثافت ہے مادیت ہے۔ تعفن ہے۔ سڑاند ہے۔ اس تعفن اور سڑاند کی بنیاد پر خالق اور مخلوق کے درمیان ایک پردہ حائل ہو گیا اگر کوئی انسان اس تعفن اور سڑاند کے پردے کو اپنے بیچ سے کھینچ دے تو اسکی وہی پوزیشن ہو جائے گی جو عالم امر میں تھی۔

روحانیت کے جتنے بھی لوگ ہیں ان کا ایک ہی منشاء ہے کہ مخلوق خالق کو پہچان لے۔ اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں۔

کنت کنزا مخفیاً فا اجبب ان اعراف فخلقت خلق o ترجمہ میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا پس میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں۔ اسلئے مخلوق کو پیدا کیا۔

فالجت کا لفظ غور طلب ہے۔ تو گویا اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں میں نے محبت کے ساتھ مخلوق کو اس لئے پیدا کیا کہ وہ مجھے پہچانے۔ میرا اور مخلوق کا تعلق قائم ہو جائے۔ اگر انسان نے اپنا یہ وصف پورا کر دیا کہ اس نے اللہ کو چاہنے اور سوچنے کے ذریعے اللہ کو پہچان لیا تو انسان کی تخلیق کا مقصد پورا ہو گیا۔ اگر اس نے اللہ کو نہیں پہچانا یا پہچانے بغیر اس دنیا سے چلا گیا تو جو حالت بے سکونی کی بیماریوں کی پریشانیوں کی موجود ہے اس دنیا میں وہ مرنے کے بعد بھی اس پر مسلط رہے گی۔

روحانیت کا مقصد اتنا ہے کہ انسان اپنے اللہ کو جانتا ہو۔ جس طرح ایک بیٹا اپنی ماں کو جانتا ہے۔ اپنے باپ کو جانتا ہے اسلئے کہ اللہ سے بڑا نہ کوئی باپ ہے اور نہ کوئی ماں۔ ت روحانی علوم اگر آپ سیکھنا چاہتے ہیں آپ اللہ سے قریب ہونا چاہتے ہیں۔ آپ بادشاہ کے شہنشاہ کونین کے رب العالمین کے مقربین میں سے ہونا چاہتے ہیں۔ اس کے مہمان بن چاہتے ہیں تو آپ پر یہ لازم ہے کہ اس روح کو تلاش کریں جس روح نے اللہ کو دیکھ کر کہا تھا

''بلی جی ہاں آپ ہمارے رب ہیںo

اور اگر یہ صورت نہیں ہوئی تو پھر ایک انسان اور ایک کتے بلی میں کوئی فرق نہیں۔ بجز اس کے کہ انسان کے پاس عقل تھوڑی سی زیادہ ہے اور جانوروں کے پاس تھوڑی سی کم۔

جب ہم انسانوں اور جانوروں کا تجزیہ کرتے ہیں تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کتے کے سونگھنے کی جو حس ہے وہ انسان کو نصیب ہی نہیں ہوئی۔ سونگھنے کی حس میں کتا انسان سے زیادہ باحس ہے۔ اور جب بلڈنگ بنانے کا تصور کرتے ہیں تو بلاشبہ بڑی بڑی بلڈنگیں بنا لیتے ہیں۔ مگر ایک چھوٹا سا بیا ایسا گھر بناتا ہے کہ انسانوں کا بڑے سے بڑا (Architect Engineer) بھی اسے دیکھ کر شرم سے سر جھکا لیتا ہے کہ اتنی چھوٹی سی چڑیا نے ایسا گھر بنایا جس کے اندر بیڈ بھی ہے روشنی کا انتظام بھی ہے جھولے کا انتظام بھی ہے۔ بارش کا پانی بھی اندر نہیں جا سکتا۔ آندھیاں چلیں' طوفان آئیں وہ ہلتا رہے گا مگر اس درخت سے گرے گا نہیں یہ چھوٹے سے پرندے کی (Civil Engineering) کا کمال ہے۔

انسان کہتا ہے کہ میں اپنی خوراک ذخیرہ کرتا ہوں۔ اگر چونٹیوں کا انتظام دیکھیں تو وہ بارش ہونے سے پہلے اپنی غذا اس طرح ذخیرہ کرتی ہیں کہ آندھی میں' بارش میں' انکی غذا میں فرق نہیں پڑتا۔

اگر انسانی اور حیوانی عقل کا تجزیہ کیا جائے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عقل کے معاملے میں انسان حیوانوں سے زیادہ عقل رکھتا ہے لیکن محض عقل کی بنیاد پر کسی انسان کو حیوان سے ممتاز نہیں کیا جا سکتا۔ انسان کا امتیاز یہ ہے کہ انسان وہ علوم جانتا ہے جو نہ فرشتے جانتے ہیں نہ جنات جانتے ہیں نہ جمادات جانتے ہیں نہ درخت جانتے ہیں نہ پرندے۔

رزق کے حصول کیلئے آپ صبح سے شام تک محنت کر کے روٹی کھاتے ہیں پرندے جو اڑتے ہیں۔ سارا دن کوشش کرتے ہیں یعنی روزی کھاتے ہیں آپ اپنے بچوں کی تربیت کرتے ہیں جانور بھی اپنے بچوں کی تربیت کرتے ہیں۔ کیا آپ نے بلی کو اپنے بچوں کی تربیت کرتے نہیں دیکھا۔ کیا اس کو نہیں دیکھا کہ وہ اپنے بچوں کو شکار کرنا سکھا دیتی ہے۔

تو اگر آپ کو اپنا شرف تلاش کرنا ہے۔ حیوانات سے خود کو ممتاز کرنا ہے تو اس کی ایک ہی صورت ہے کہ آپ اس روح کو تلاش کریں۔ جس روح نے خالق کائنات کو دیکھا ہے اسکی آواز سنی ہے اور اس کی ربوبیت کا اقرار کیا ہے۔

اب اس کا طریقہ کیا ہو؟

طریقہ بہت آسان ہے ہر آدمی رات اور دن کی زندگی کے اختلاف سے بخوبی آگاہ ہے جب ہم پیدا ہوتے ہیں تو ہمارا Aura (روشنی کا جسم) ہمیں اس Matter کی پابندی کے ساتھ زندگی گزارنے پر مجبور کرتا ہے اور جب ہم سو جاتے ہیں تو ہمارا یہ مادی جسم بستر پر پڑا رہتا ہے اور اندر کا آدمی Aura نکل جاتا ہے۔ کبھی وہ زمین کی اور کبھی آسمانوں کی سیر کرتا ہے فرشتوں کو دیکھتا ہے۔

اب آپ یہ کہیں گے کہ صاحب یہ خواب و خیال کی باتیں ہیں۔ تو خواب و خیال کا جہاں تک تعلق ہے پھر تو ساری کائنات ہی خیال ہے۔

عالم تمام حلقہ دام خیال ہے

جب تک آپ کو خیال نہیں آئے گا آپ پانی نہیں پئیں گے۔ آپ کھانا نہیں کھائیں گے علی ہذا القیاس یہ الگ بات ہے کہ آپ نے ان خیالوں کو پیاس اور بھوک کا نام دے رکھا ہے۔ یہ دنیا اصل میں خیال ہے اور اس خیال میں معنی پہنانا جسم کا کام ہے۔ تو یہ دنیا ساری ایک دماغی فلم ہے جو اوپر سے چل رہی ہے۔ اور ہم اسے دیکھ رہے ہیں۔

اب ادھر (Projector) چل رہا ہے ادھر فلم اسکرین (Display) ہو رہی ہے۔ ایک آدمی پروجیکٹر سے واقف ہی نہیں تو وہ یہی کہے گا کہ بھائی میں نے فلم دیکھی ہے بس مگر کوئی دانشور ہے۔ سمجھدار ہے وہ یہ کہے گا کہ فلم کا فیتہ پروجیکٹر پر چل رہا ہے اور روشنی کے ذریعے اسکرین پر ڈسپلے ہو رہا ہے اور میں اسے دیکھ رہا ہوں تو جو کچھ آپ اسکرین پر دیکھ رہے ہیں وہ تابع ہے پروجیکٹر کے بعینہ یہ ساری کائنات ایک فلم ہے اللہ کی اور لوح محفوظ اس کا پروجیکٹر ہے۔

تو اب ہم اس طرح کہیں گے کہ ایک لوح محفوظ ہے اس پر کائنات کی فلم چل رہی ہے اور اس فلم کو آپ دیکھ رہے ہیں جب اس کائناتی فلم سے آپ واقف ہو جائیں گے یعنی لوح محفوظ سے واقف ہو جائیں گے تو تب آپ کو پتہ چلے گا کہ آپ کیا دیکھ رہے ہیں؟

تو اس فلم سے واقف ہونے کیلئے' روح کی حقیقت سے آشنا ہونے کیلئے روحانیت میں سب سے بڑی اہمیت جس عمل کو ہے وہ ہے ''محبت'' ہر چیز سے محبت کرو' ہندو سے محبت کرو' عیسائی سے محبت کرو۔ یہودی سے محبت کرو' مسلمان سے محبت اس لئے کرو کہ آپ مخلوق ہیں اور اللہ کی ہر مخلوق آپ کی طرح مخلوق ہے ہر مرد میرا بھائی ہے۔ ہر عورت میری ماں ہے' بہن ہے' ہم آدم وحوا کے رشتے سے دیکھیں تو ہم سب آپس میں بہن بھائی ہیں۔ تو روحانیت میں پہلی شرط یہ ہے کہ آپ کے اندر وہ محبت کام کرتی ہو جو اللہ اپنی مخلوق سے کرتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ آپ کے اندر یہ صلاحیت ہو کہ آپ کے اندر سطحی نظر کام کرتی رہے اور ساتھ ہی ساتھ آپکے اندر گہرائی بھی ہو۔ آپ اگر باہر دیکھیں تو اندر بھی دیکھیں آپ نے کبھی آئینے کو دیکھا ہے؟

آپ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بال بناتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ ہم نے آئینہ دیکھا۔ اصل میں ہم نے آئینے کے اندر اپنی صورت دیکھی ہے۔ آئینہ نہیں دیکھا۔ اب آئینے کے پیچھے جو مرکری اور سینڈرو لگا ہوا ہے اسے ہٹا دیں تو آپ کیا دیکھیں گے؟

کچھ نہیں۔ صورتحال یہ ہے کہ میں جب آئینے کے سامنے کھڑا ہوتا ہوں تو آئینہ مجھے دیکھ کر اپنے اندر جذب کر لیتا ہے تو میں آئینے کو دیکھتا ہوں۔ یعنی میں آئینے کے دیکھنے کو دیکھتا ہو۔ اگر آئینہ مجھے دیکھ کر اپنے اندر جذب نہ کرے تو آئینہ میں میری صورت فلم نہیں آتی۔ یہی روحانی قانون ہے کہ ہر آدمی روح کے دیکھنے کو دیکھ رہا ہے۔ مادی آنکھ کے دیکھنے کو نہیں دیکھ رہا۔ اگر کوئی آدمی مادی آنکھ کے دیکھنے کو دیکھتا رہا تو مرنے کے بعد کیوں نہیں دیکھتا؟

ایک آدمی مر گیا آنکھ موجود ہے۔ کان موجود ہے لیکن نہ وہ دیکھ رہا ہے نہ سن رہا ہے۔ تو جب تک روح آدمی میں موجود ہے وہ ہر چیز دیکھ رہا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم روح کے

دیکھنے کو دیکھ رہے ہیں اور روح کے سننے کو سن رہے ہیں۔

روح کا سننا کیا ہے؟

اللہ تعالیٰ نے **الست بربکم** کو جو سماعت منتقل کی تھی اس سماعت سے ہم سن رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو دیکھنے سے جو بصارت ہمیں منتقل ہوئی۔ اس سے ہم دیکھ رہے ہیں۔ ''بلیٰ'' کہنے سے جو قوت گویائی ہمیں منتقل ہوئی۔ اس کے بل بوتے پر ہم بول رہے ہیں۔ تو روحانی نقطہ نظر سے کوئی آدمی باہر نہیں دیکھتا۔ ہر آدمی اندر دیکھ رہا ہے اور اس کی مثال میں نے عرض کی ہے کہ جب آدمی مر جاتا ہے تو کچھ نہیں دیکھتا!

اگر آپ صلاحیتوں کو تلاش کرنا چاہیں جو صلاحیتیں اللہ تعالیٰ نے آپ کو آپ کی تخلیق کے وقت عطا کی تھیں تو اس کیلئے ضروری ہے کہ آپ اپنے اندر اپنی روح سے متعارف ہوں روح سے متعارف ہو کر آپ یہ سمجھ لیں گے کہ باہر کچھ نہیں ہے سب کچھ اندر ہے اللہ تعالیٰ بھی اندر ہیں۔ آسمان بھی اندر ہے زمین بھی اندر ہے عرش و کرسی بھی اندر ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

وفی انفسکم افلا تبصرون o میں تمہارے اندر ہوں تم دیکھتے کیوں نہیں؟

باہر کا دیکھنا (Time and Space) میں دیکھنا ہے۔ (Matter) میں دیکھنا ہے۔ اندر دیکھنا روح میں دیکھنا ہے۔ سیدھی سی بات ہے باہر دیکھنے کی بجائے اندر جھانکنا شروع کر دیں۔ ساری کائنات روشن ہو جائے گی۔ ساری کائنات کے فارمولے آپ کے اوپر آشکارا ہو جائیں گے۔ آپ یہ جان لیں گے کہ مٹی کے ذرات میں اللہ تعالیٰ نے کیا کیا طاقتیں رکھی ہیں۔ آپ کو یہ پتہ چل جائے گا کہ سورج کیا ہے؟

چاند کیا ہے؟

کتنی زمینیں ہیں؟

حضور قلندر بابا اولیاء رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب لوح وقلم میں لکھا ہے کہ کائنات کا جو سسٹم ہے وہ کچھ اس طرح ہے۔

کائناتی سسٹم	کتاب مبین	تیس کروڑ لوح محفوظ	ہر لوح محفوظ کے نیچے اسی ہزار حضیرے

ہر حضیرے کے نیچے ایک کھرب آباد نظام اور بارہ کھرب غیر مستقل نظام

ہر نظام کسی ایک سورج کا دائرہ وسعت ہوتا ہے۔ ہر سورج کے گرد نو۔ بارہ یا تیرہ سیارے (Planets) گردش کرتے ہیں۔

ہر سیارے (Planet) پر آبادی 5/6 ارب ہے

آپ کے اندر کی آنکھ کھل جائے تو آپ اللہ تعالیٰ کے اس عظیم کائناتی سسٹم سے واقف ہو جائیں گے نہ آپ کے اندر بیماری رہے گی نہ پریشانی' اور جب تک آپ اپنی روح سے ناواقف رہیں گے۔ بے سکون رہیں گے روح کے اندر بے سکونی نہیں ہے یہ آپ یاد رکھیں بے سکونی (Matter) کے اندر آتی ہے اس کی علامت یہ ہے کہ مادہ (Matter) کا کام ہی فنا ہونا ہے۔ بیج اگر زمین کے اندر فنا نہیں ہوتا اور ہوتا مٹی کے ذرات بیج کے اندر تک خود کو جذب نہیں کر لیتے تب تک بیج میں نشو و نما نہیں ہوتی۔ ماں کے اندر جب نطفہ قرار پاتا ہے اور اگر ماں اس چھوٹے قطرے کو ایک ایک خون کا قطرہ دے کر پروان چڑھائے تو دنیا میں کوئی بچہ پیدا نہ ہو۔ ہر چیز کو فنا اور ہر چیز کی فنا میں بقاء ہے پہلے وہ چیز فنا ہو رہی ہے پھر بقا کے دائرے میں داخل ہو رہی ہے۔

ایک بچہ پیدا ہوتا ہے۔ بچپنا فنا ہوتا ہے۔ لڑکا بن جاتا ہے۔ لڑکپن فنا ہو جاتا ہے تو وہ جوانی میں داخل ہو جاتا ہے۔ جوانی فنا ہو جاتی ہے تو بڑھاپا آ گھیرتا ہے۔ بڑھاپا جاتا ہے تو اعراف کی زندگی کا آغاز ہو جاتا ہے۔ جو باتیں مین نے کی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم سب نے روحانی طور پر اللہ کو دیکھا ہوا ہے اُس کی آواز بھی سنی ہوئی ہے اور اس کی آواز کا جواب بھی دیا ہوا ہے۔ (اور اللہ توفیق دے) اگر ہم اپنی روحانی قوتوں یا روح سے واقف ہو جائیں تو اسی عالم میں پھر پہنچ جائیں گے۔ جس عالم میں سب کچھ ہوا ہے اسی بات کو سیدنا حضور علیہ الصلاۃ والسلام نے اس طرح ارشاد فرمایا ہے۔

من عرف نفسہ فقد عرف ربہ o جس نے اپنی روح کو پہچان لیا اس نے

اپنے رب کو پہچان لیا۔ اس لئے کہ روح تو پہلے ہی رب کو پہچانتی ہے اس لئے آسان طریقہ حدیث پاک کی روشنی میں مراقبہ (Meditation) ہے۔ حضور پاک ﷺ نے مومن کی یہ نشانی بتائی ہے کہ مومن مرتبہ احسان پر فائز ہوتا ہے یعنی وہ اللہ کو دیکھتا ہے یا اس کو یہ یقین ہو جاتا ہے کہ اللہ اسے دیکھ رہا ہے جب آدمی اس اسٹیج پر پہنچ جاتا ہے تو اس آیت کا نمونہ بن جاتا ہے جو میں نے شروع میں تلاوت کی تھی۔

والراسحون فی العلم یقولون آمنا بہ ھم من عند ربنا o

یعنی جو لوگ روحانی علوم سیکھ جاتے ہیں۔ یہ بات ان کے مشاہدے میں آ جاتی ہے اور اس مشاہدے کی بنیاد پر وہ پکار اٹھتے ہیں۔

کل من عند ربنا o جو کچھ بھی ہے وہ ہمارے رب کی طرف سے ہے۔

وما علینا الا البلاغ o

☆☆☆

”اللہ کا امین“

سوال: اللہ تعالیٰ نے انسان کی خدمت کے لیے ہر شے تخلیق فرمائی اور ہر شے کو انسان کی خدمت پر معمور کر دیا۔ انسان کو یہ فضیلت کیوں دی گئی۔ اللہ تعالیٰ انسان سے کیا چاہتا ہے اور انسان اس آزمائش پر کس طرح پورا اتر سکتا ہے۔

جواب: دنیا میں چھ ارب انسانوں کی آبادی ہے۔ کھربوں کی تعداد میں دوسری مخلوق آباد ہے۔ اسی طرح عالمین میں انسانی شمار سے باہر اور بھی دنیائیں آباد ہیں۔ ان دنیاؤں میں بھی انسان، جنات اور فرشتے رہتے ہیں۔ انواع واقسام کی مخلوقات جو ہم زمین پر دیکھتے ہیں۔ ان دنیاؤں میں بھی موجود ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے یہ سارا نظام انسان کی خدمت گزاری کے لئے بنایا ہے۔ ہمارا مشاہدہ ہے کہ دنیا میں موجود ہر مخلوق، ہر شئے انسان کی خدمت گزاری میں مصروف ہے۔ انسان اعتراف کرے یا نہ کرے۔ اس بات کو مانے یا نہ مانے لیکن جب کبھی بھی انسان اس بات پر غور کرتا ہے کہ یہ کائنات کیا ہے، زمین کیا ہے۔ چاند سورج ستارے، کہکشانی نظام کیوں قائم کیے گئے ہیں تو انر INNER سے دل و دماغ سے، تفکر سے ایک جواب ملتا ہے کہ یہ پوری کائنات انسان کی خدمت گزاری میں مصروف ہے۔ پانی کی خصوصیات اور اس کی خدمت گزاری ہمارے سامنے ہے۔ گیس، ہوا، سورج چاند ستارے سبھی انسان کی خدمت میں مصرف ہیں۔ ہر وہ چیز جس کی انسان کو کسی بھی حالت میں ضرورت ہے۔ زمین اپنے بطن سے پیدا کر رہی ہے اور تسلسل کے ساتھ قائم رکھے ہوئے ہے۔ انسان جب اپنے بارے میں سوچتا ہے کہ میں زمین، چاند، سورج کے لیے کیا کرتا ہوں اور خلاء کے اندر جو فضائیں ہیں ان کے لئے کیا کرتا ہوں۔ تو اس کو ایک ہی جواب ملتا ہے کہ وہ کسی کے لئے کچھ نہیں کرتا بلکہ تمام چیزیں اس کی خدمت میں مصروف ہیں۔

انسان کے اندرونی سسٹم System میں بھی یہی بات نظر آتی ہے کہ دل و دماغ اور

پھیپھڑے اور تمام اعضاء خدمت میں مصروف ہیں۔ جب کہ انسان یہ بھی نہیں جانتا کہ دل کی حرکت کیوں قائم ہے۔ کس بنیاد پر قائم ہے۔ رگوں میں خون کا دوڑنا، ایک توازن کے ساتھ حرارت کا برقرار رہنا، پیاس لگنا، پانی پینا، پانی کا سیراب کرنا۔ جسم کے اندر سے فاسد رطوبت اور فاسد مادوں کا اخراج، بھوک لگنا، کھانا کھانے کے لیے وسائل کی موجودگی مسلسل وسائل کا فراہم ہونا۔ جتنا زیادہ آپ گہرائی میں سوچیں گے اتنا ہی زیادہ آپ کے اوپر اللہ تعالیٰ کا یہ فضل کھل کر سامنے آ جائے گا کہ سب کچھ اللہ نے انسان کے لئے پیدا کیا ہے۔ اور انسان اس کائنات کے لئے کچھ بھی نہیں کرتا۔

مثلاً وہ زمین کے اوپر کھیتی باڑی کرتا ہے تو زمین کو وہ کچھ نہیں دے رہا ہے۔ اس کھیتی باڑی سے اپنے لیے وسائل پیدا کر رہا ہے۔ اگر زمین کے اوپر آپ گندم کاشت کرتے ہیں تو آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ گندم بونے سے زمین کو کوئی فائدہ پہنچا ہے۔ آپ زمین پر کوئی درخت لگاتے ہیں۔ اس پر پھل لگتا ہے۔ تو کوئی ذی شعور آدمی یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ درخت پر پھل لگنے کا فائدہ زمین کو پہنچ رہا ہے۔ زمین پر دودھ دینے والے جانور ہیں۔ کیا جانوروں کی نسل کشی میں زمین کا کوئی فائدہ ہے۔ دودھ بھی انسان پیتا ہے۔ گوشت بھی انسان کھاتا ہے۔

پرندوں کے بارے میں غور کیجئے۔ پرندے پیدا ہوتے ہیں۔ انسان پرورش کرتا ہے نہ پالتا ہے۔ قدرت پرندے پیدا کرتی ہے یہ بھی انسان کے فائدہ کے لئے ہیں۔ پرندوں سے زمین کو جو زینت ملتی ہے اس سے انسان ہی خوش ہوتا ہے۔ کسی بھی طرح غور کریں ایک ہی بات سامنے آتی ہے کہ یہ سب کچھ اللہ نے انسان کے لئے پیدا کیا ہے۔ نہ صرف یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے وسائل تخلیق کیے ہیں۔ بلکہ ہر چیز کو اس کے لئے محکوم بنا دیا۔

وسخر لکم مافی السموت وما فی الارض o

ترجمہ: (آسمانوں میں جو کچھ ہے اور زمین میں جو کچھ ہے ہم نے تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے۔)

آسمانوں میں زمین میں جو کچھ ہے سب کا سب تمھارے تابع اور محکوم کر دیا گیا اور تمھاری خدمت گزاری کے لئے ان کو پابند کر دیا گیا۔

سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ سب کچھ کیوں کیا؟ آخر انسان میں کیا خصوصیت ہے کہ ساری کائنات انسان کے تابع کر دی گئی اور انسان کو دنیا کے تابع نہیں کیا۔ کوئی انسان یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں چاند' سورج اور زمین کے تابع ہوں۔ البتہ تجرباتی اور مشاہداتی بات یہ ہے کہ زمین کے اوپر ہر موجود شے انسان کے تابع ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کہتے ہیں۔ ایک آسمان نہیں سماوات میں جو کچھ ہے وہ سب انسان کے تابع ہے۔ سماوات میں کیا ہے۔ فرشتے ہیں' جنات ہیں' جنت دوزخ ہے' عرش و کرسی ہے۔ ارشاد باری کے مطابق آسمانوں میں جو کچھ ہے وہ بھی انسان کے تابع ہے یہ سب فضیلت انسان کو کیوں دی گئی۔ انسان نے ایسا کون سا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے کہ جس کارنامے کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ نے انعام وکرام سے اسے نواز دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اوپر اتنا کرم کیا ہے آخر اس کی کیا وجہ ہے؟

اللہ تعالیٰ انسان سے کیا چاہتا ہے؟ ساری کائنات کو انسان کے لئے مسخر کر دیا اور اس کو انسان کی خدمت گزاری میں مصروف اور پابند کر دیا۔ اس کے پس پردہ کیا مقصد ہے۔ اللہ رب العالمین انسان سے کیا چاہتا ہے......؟ اگر اللہ تعالیٰ انسان سے کچھ چاہتے ہیں تو اس چاہنے کی بنیاد بھی انسان کے اندر ہے۔ وہ کیا ہے؟ آپ ذرا سا بھی غور کریں گے تو یہ بات بڑی آسانی سے سمجھ میں آ جائے گی کہ جب کوئی کسی پر انعام و اکرام کی بخشش کرتا ہے اس کا ایک مقصد ہوتا ہے وہ اس کو اپنا دوست بنانا چاہتا ہے اور اس سے قربت حاصل کرنا چاہتا ہے۔

مثلاً آپ کسی آدمی کے ساتھ اچھا سلوک کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہیں۔ اس کی کفالت کرتے ہیں کوئی آپ سے پوچھے کہ اس کی اتنی خدمت کیوں کر رہے ہو؟ آپ یہی کہیں گے یہ شخص مجھے اچھا لگتا ہے۔ کوئی آپ کو اچھا لگتا ہے تو آپ یہ بھی چاہتے ہیں کہ وہ بندہ آپ سے قریب ہو۔

سیدھی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ چاہتے ہیں کہ انسان اللہ کا دوست بن کر رہے اور اس کو اللہ تعالیٰ کی قربت نصیب ہو۔ یہ سارے انعام و اکرام اس وجہ سے ہیں کہ انسان (جو ناشکرا بھی ہے اور کفران نعمت بھی کرتا ہے' ظالم اور جاہل ہے) اس کا ذہن کبھی تو اس طرف

جائے گا کہ جس اللہ نے پوری کائنات کو میرے لئے خادم بنا دیا ہے وہ کون ہے؟ وہ ہستی مطلق مجھ سے کیا چاہتی ہے۔ میرے اوپر اتنے انعامات و اکرام اس نے کیوں کئے ہیں؟ جب اس ہستی کا ادراک آپ کے ذہن میں اتر جائے گا تو آپ کے اندر کا تفکر کام کرنے لگے گا۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں'

ترجمہ: ہم نے اپنی امانت سماوات' زمین اور پہاڑوں کو پیش کی۔ سب نے انکار کر دیا اور انکار کی بنیاد یہ بتائی کہ ہمارے اندر اتنی سکت نہیں ہے کہ ہم آپکی امانت کو اپنے ناتواں کندھوں پر اٹھا سکیں لیکن انسان نے اس امانت کو بغیر سوچے سمجھے اٹھا لیا۔ **انه کان ظلوما جهولا** بے شک یہ ظالم اور جاہل ہے۔

''امانت سے مراد صلاحیت' سکت' ذہنی استعداد' روح کی طاقت' قوت پرواز' ایسی قوت پرواز کہ جب انسان اس قوت پرواز سے واقف ہو جاتا ہے تو آسمانوں سے گزر کر عرش سے بھی اوپر نکل جاتا ہے اس نے بلا سوچے سمجھے وہ صلاحیت تو قبول کر لی لیکن کبھی سوچتا نہیں کہ کائنات میں وہ اللہ تعالیٰ کی واحد مخلوق ہے جو اس کی امین ہے۔ مگر اس امین مخلوق کی حالت یہ ہے کہ وہ فانی دنیا کی کیچڑ میں تو لت پت ہو سکتی ہے لیکن اس کا ذہن کبھی اس امانت کی طرف نہیں جاتا۔ انسان سونا چاندی' بیوی بچوں کو ہی سب کچھ سمجھتا ہے جبکہ اس کی زندگی کی اصل وہ امانت ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو عطا کی اور کائنات میں کسی دوسری مخلوق کو یہ اعزاز حاصل نہیں ہے۔ دوسری دنیاؤں میں بھی انسان ہی امین ہے۔

اللہ تعالیٰ انسان کو اپنا دوست بنانا چاہتے ہیں اور اس دوستی کے لئے انہوں نے انسانوں میں سے ہی ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر اس دنیا میں بھیجے ہیں تا کہ کوئی فرد واحد یہ نہ کہہ سکے کہ انسان کے اندر تو یہ صلاحیت ہی نہیں کہ وہ اللہ کا دوست بن سکے۔ انسان کے اندر اگر یہ صلاحیت نہ ہوتی تو انسانی برادری میں ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر پیدا نہ ہوتے۔ اللہ نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اتنی قربت عطا کی جو کسی بھی مخلوق کو عطا نہیں ہوئی۔

انسان کی فضیلت اس کا شرف اس بنیاد پر نہیں کہ اس کے اندر تھوڑی سی عقل زیادہ ہے۔

انسان کا شرف یہ ہے کہ اس کے اندر ایسی صلاحیت موجود ہے کہ وہ زمین اور آسمانوں کے کناروں سے باہر نکل کر اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ کرسکتا ہے انسانی گوشت پوست کی حیثیت اسی وقت تک ہے جب اس کے اندر ''روح'' موجود ہے۔ روح کو نور کے علاوہ دوسرا نام نہیں دیا جاسکتا۔ آدمی کی محدود طرز فکر دنیا کی محبت' حرص و لالچ' سونے چاندی کے سکوں کے عشق نے اس نور کے اوپر غلاف ڈال دیا ہے۔ آدمی نے اپنے ارادہ اور اختیار سے گہرے اندھیرے کی چادر اوڑھ لی ہے۔ کثافت سے خود کو بھر دیا ہے۔

آپ کے پاس ایک پیالہ ہے اس کے اندر بہترین خوشبو ہے لیکن اس پیالے کے اوپر آپ اپنی مرضی سے کیچڑ ڈال دیں تو آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس پیالے میں خوشبو نہیں ہے۔ خوشبو تو ہے لیکن آپ نے اس خوشبو کو خراب اور غلیظ کر دیا اس کے اوپر تعفن ڈال دیا ہے۔ روحانی استاد کا یہی کام ہے کہ جب اس کا شاگرد اس کے قریب آجاتا ہے یا وہ اس کی اصلاح کا ذمہ لے لیتا ہے تو پہلے ہی دن سے پیالے کو صاف کرنا شروع کر دیتا ہے۔ وہ پھر دھو دیتا ہے مرید پھر پیالے کو گندہ کر دیتا ہے۔ وہ پھر دھو دیتا ہے مرید کے لئے بھنگی بن جاتا ہے۔ اس کے تعفن کو دھوتا رہتا ہے۔ دلاسوں سے اس کو صاف ستھرا کرتا ہے۔ جب تک مرید کے پیالہ میں خوشبو غالب نہیں آجاتی۔ مرشد صفائی ستھرائی کا عمل جاری رکھتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ مرید ذاتی اغراض کی وجہ سے مرشد سے خود دور ہو جائے۔

حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے فرمایا کہ بعض حالات میں ایسا ہوتا ہے کہ پیر و مرشد اپنے مرید کے اندر سے تعفن کو الگ کرتا ہے۔ صاف کرتا ہے بار بار صاف کرتا ہے مرید پھر گندہ ہو جاتا ہے۔ مرشد پھر صاف کرتا ہے۔ مرید پھر گندہ ہو جاتا ہے۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ مرشد ساری زندگی ایک آدمی کی صفائی پر لگا رہا۔ مرید خود کو گندہ کرتا رہا اور مرشد اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

ہمارے ایک دوست تھے۔ میں نے حضور قلندر بابا اولیاءؒ سے پوچھا ان کی ترقی کیوں نہیں ہوتی۔ لاکھوں کی تعداد میں درود شریف پڑھا۔ لاکھوں کی تعداد میں یا حی یا قیوم کا ورد کیا۔ سات وقت کی نمازیں پڑھتے ہیں۔ نوافل پڑھتے ہیں۔ مرشد سے عقیدت رکھتے ہیں۔

ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ آخر ان کی ترقی میں کیا امر مانع ہے۔ قلندر بابا اولیاءؒ نے فرمایا کہ بندہ بہت اچھا ہے لیکن اس کے دل میں اولاد کی محبت بھر گئی ہے۔ میں نے کہا حضور اولاد کی محبت تو ایک فطری اور قدرتی عمل ہے۔ کہنے لگے اولاد کی محبت بلاشبہ قدرتی عمل ہے۔ لیکن اولاد کی محبت اگر خدا کی محبت پر غالب آجائے تو اولاد فتنہ بن جاتی ہے۔ اولاد سے محبت اس لئے کرو کہ اللہ تعالیٰ نے اولاد دی ہے۔ کھلونا عطا کیا ہے۔ اولاد خوشی کا سامان ہے۔ اولاد اللہ کی نعمت ہے۔

یہی صورتحال دنیا کے عام معاملات کی ہے۔ گھر ہے کاروبار ہے۔ دولت ہے۔ بیوی ہے۔ شوہر ہے۔ اولاد ہے۔ اگر اولاد سے محبت اس لئے کی جا رہی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ایک انعام ہے۔ اگر شوہر سے محبت اس لئے کی جا رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے رفیق سفر عطا کیا ہے۔ اگر بیوی سے اس لئے تعلق خاطر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمراز و دمساز دے دیا۔ تو یہ سب آپ کے لئے سکون و راحت ہیں۔ اور اگر آپ نے اولاد' شوہر' بچے اور زر و جواہر کو زندگی کا مقصد بنا لیا تو ساری زندگی جہنم ہے۔

آج یہ حال ہے کہ بیوی شوہر سے ڈرتی ہے۔ شوہر بیوی سے ڈرتا ہے۔ اولاد ماں باپ سے ڈرتی ہے۔ ماں باپ اولاد سے ڈرتے ہیں لیکن کبھی انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ قبر میں بیوی شوہر اور اولاد ساتھ نہیں جاتی۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میں نے انسان کو خلاء سے بنایا ہے اور اس کی کھوپڑی کے اندر' ناک' حلق' منہ' ہونٹ' ڈھانچہ' اور دل میں خلاء ہے۔ پھیپھڑے تو سارا کا سارا ہی اس سپرنگ کا نظام ہے سوراخ ہی سوراخ ہیں۔ گردوں میں خلاء مثانوں میں خلاء' آنتیں نلکیاں' معدہ میں بھی خلاء ہے۔ غور فرمایئے انسان مکمل خلاء ہے۔ اگر انسان خلاء نہیں ہوتا تو اس کے اندر انرجی energy کیسے دوڑتی ہے۔ فریدیں' شریانیں نہ ہوتیں تو خون کیسے دوڑتا۔ انسان جسم Human Body میں خلاء کے علاوہ کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ پنڈلی کی ہڈی اس میں بھی خلاء ہے۔ پسلی میں بھی خلاء آنکھ کے اندر خلاء ہے' کوئی چیز آپ ایسی نہیں بتا سکتے جس میں خلاء یا

سوراخ نہ ہوں۔ زمین بھی خلاء ہے اگر زمین کے اندر خلاء نہ ہو تو ہل نہیں چل سکتا۔ بیج ہی نہیں اگیں۔ درختوں کی نشوونما نہیں ہوگی۔

اس خلاء کو کون چلا رہا ہے۔ یہ خلاء متحرک کیوں ہے۔ حقیقی بات یہ ہے کہ اس خلاء کو روح نے اپنا مسکن بنایا ہوا ہے۔ جب تک وح اس خلاء کے اندر رہتی ہے۔ یہ خلاء چلتا پھرتا ہے۔ گھومتا۔ بولتا۔ ہنستا روتا رہتا ہے۔ اور جب خلاء سے روح رشتہ منقطع کر دیتی ہے تو خلاء ہنستا ہے نہ بولتا ہے۔ ایک بیکار شے ہو جاتا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ میرا چلنا سونا۔ جاگنا۔ اٹھنا بیٹھنا اس لئے ہے کہ میرے اندر اللہ کی روح یعنی اللہ کا نور کام کر رہا ہے۔ میری زندگی کا ضامن نور ہے۔ نور مجھے بھوک پیاس لگا رہا ہے۔ نور میری پیاس بجھا رہا ہے۔ ہائے افسوس میں نے کبھی نور کی طرف توجہ نہیں دی اور روٹی میرے لیے اتنی اہم بن گئی کہ میں اس کے لئے دین دنیا بیچ سکتا ہوں۔ خود کو بھی فروخت کر سکتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اتنے بڑے انعام و اکرام انسان کے اوپر نازل کیے ہیں اور تسلسل کے ساتھ آج نازل ہو رہے ہیں۔ آنے والی کل بھی نازل ہوتے رہیں گے اور گذشتہ کل بھی نازل ہو رہے تھے۔ آدم سے لے کر اب تک اور جب تک قیامت آئے گی۔ انعام و کرام کا یہ سلسلہ ختم نہیں ہوگا۔ یہ سب کیوں ہو رہا ہے۔ اس لئے ہو رہا کہ اللہ تعالیٰ یہ چاہتے ہیں کہ انسان اپنی روح کی طرف متوجہ ہو۔ جب انسان کا ذہن اپنی روح کی طرف متوجہ ہوگا تو خود بخود اللہ کی طرف متوجہ ہو جائے گا اور اگر انسان اپنے اندر اور اپنی روح کے اندر متوجہ نہیں ہو گا تو کبھی بھی اسے اللہ کی قربت نصیب نہیں ہوگی۔ روح اللہ کی جان ہے۔ جان سے جانا پہچانا جاتا ہے۔

روحانیت ہمارے اوپر دروازہ کھولتی ہے۔ کہ ہر آدمی اپنے باطنی وجود میں اللہ کا دوست ہے۔ جبکہ ظاہری وجود کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اس پر ہر آن فنا وارد ہوتی رہتی ہے۔ ظاہر وجود باطنی وجود کے تابع ہے باطنی وجود ہے تو ظاہری وجود ہے اگر باطنی وجود نہیں ہے تو ظاہری وجود بھی نہیں ہے۔ بڑے بڑے سائنسدان یہ نہیں کہہ سکتا کہ باطنی وجود ظاہری وجود کی

وجہ سے ہے۔ یہ تجربے اور مشاہدے کے خلاف بات ہے اس لئے کہ جب باطنی وجود ظاہری وجود سے اپنا رشتہ توڑ لیتا ہے تو کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔

حضور قلندر بابا اولیاءؒ کی تعلیمات طرز فکر اور جس طرح انہوں نے سائنٹیفک طریقے پر Logic کی بنیاد پر روحانیت سے نوع انسانی کو آشنا کیا ہے اس کا مختصر مگر جامع لب لباب یہ ہے کہ ہر انسان کا باطن روح اور روح اللہ کی دوست ہے۔ جب سے انسان نے اپنے باطن سے نظریں چرائی ہیں اللہ کا دشمن بن گیا ہے۔ اور یہ دشمنی ہی بے سکونی ہے۔ پریشانی اور اضطراب ہے۔ اگر میں فی الواقع ''میں'' ہوں۔ نہ میں بول سکتا ہوں نہ میں سن سکتا ہوں۔ نہ کوئی چیز پکڑ سکتا ہوں نہ کہیں جا سکتا ہوں اور نہ آ سکتا ہوں۔

یہ کیسا ظلم ہے یہ کیسا ستم ہے۔ یہ کس قسم کی ناشکری اور کفران نعمت ہے کہ ہر آدمی کے اندر سکون کی نہریں بہہ رہی ہیں اور وہ ان نہروں کی طرف نہیں دیکھتا۔ جب بھی دیکھتا ہے باہر دیکھتا ہے اور پریشانی کو زندگی کہتا ہے اور پریشانی سے بچنا بھی چاہتا ہے۔ جب بھی آواز دیتا ہے۔ ذہنی خلفشار کو بلاتا ہے۔ انسان کا اصلی رخ یہ ہے کہ وہ اللہ سے دور ہے۔ لیکن انسان نے ہمیشہ نقلی رخ کو اہمیت دی ہے۔ اپنے اصلی رخ (روح) کو اس نے کبھی اہمیت نہیں دی۔

روحانی علوم میں مراقبہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ مراقبہ کا مطلب ہے کہ انسان ظاہری وجود سے ذہن کو ہٹا کر اپنے باطنی وجود کو تلاش کرے۔ انسان ظاہر رخ دنیا کو فکشن اور عارضی قرار دے کر مستقل اور قائم رہنے والی دنیا کی طرف توجہ دے جو کہ اس کے اندر موجود ہے۔ ہمیں جو کچھ نظر آ رہا ہے یہ دھوکا اور فریب ہے۔ اگر دنیا کی زندگی فریب نہیں ہے تو مرنے کے بعد دنیا ہمارے کام کیوں نہیں آتی۔ اگر باہر کی دنیا سب کچھ ہے' کھانا پینا ہی سب کچھ ہے تو ہم مرنے کے بعد کھانا کیوں نہیں کھاتے۔ پانی کیوں نہیں پیتے۔ کیا ہمارا حلق ختم ہو جاتا ہے کیا ہمارا دماغ ختم ہو جاتا ہے۔ کیا جب ہم مرتے ہیں تو کیا ہمارے ہاتھ پیر ٹوٹ کر گر جاتے ہیں اور سڑ جاتے ہیں؟ ہر چیز موجود ہوتی ہے۔ جسمانی اعضاء ہاتھ پیر آنکھیں ناک موجود ہوتی ہے۔ لیکن کون سی چیز موجود ہے؟

باطنی وجود نے عارضی اور فنا ہونے والے وجود سے رشتہ توڑ لیا ہے۔

جواب دیجیے!

اصل کون ہوا؟ ظاہری وجود یا باطنی وجود۔؟

خدارا!

باطنی وجود کی طرف بھی دیکھئے! جو آپ کی اصل زندگی ہے۔لیکن آپ کی جان تو سونے چاندی کے ڈھیر اور بیوی بچوں میں اٹکی ہوئی ہے۔

یہ کیسی حماقت ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے اندر ہیں اور آپ کا ذہن کبھی اس طرف نہیں جاتا۔ مسلمان کہتے ہیں کہ ہم جب بھی دعائیں مانگتے ہیں دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔ کیا آپ نے سوچا ہے کہ دعائیں قبول نہ ہونیکی کیا وجہ ہے؟

اللہ تعالیٰ سے ہم کوئی ایسی چیز نہیں مانگتے جو اس کی قدرت سے باہر ہو۔ بات صرف اتنی ہے کہ ہم عارضی جسم اور دنیا کو ہی اصلی سمجھتے ہیں اپنے بندوں کے لئے خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

''کہ میں تو تمھارے اندر بیٹھا ہوں۔تم مجھے دیکھتے کیوں نہیں''۔

جب سالک مراقبہ کرتا ہے اور گہرائیوں میں اتر جاتا ہے تو گہرائی میں اسے باطنی وجود نظر آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں جہاں تم ایک ہو وہاں میں دوسرا ہوں اور جہاں تم دو ہو وہاں میں تیسرا ہوں۔ اس کا کیا مطلب ہوا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں '' اللہ ہر چیز پر محیط ہے'' ہر شے بشمول انسان اللہ کے احاطہ میں ہیں۔ یہ ایک دائرہ ہے جس دائرے سے کوئی باہر نہیں نکل سکتا۔

میں تمہاری ابتداء ہوں میں تمہاری انتہاء ہوں میں تمہارا ظاہر ہوں' تمہارا باطن ہوں۔ تمھاری رگ جان سے اربوں کھربوں گنا زیادہ تم سے قریب ہوں۔ پھر بھی کوئی انسان یہ کہے کہ اللہ کو ہم دیکھ نہیں سکتے۔ یہ سراسر جہالت ہے۔

مراقبہ ایک ایسا عمل ہے کہ اگر خلوص نیت اور مستقل مزاجی سے کیا جائے تو اللہ تعالیٰ کے

ارشاد کے مطابق کہ میں انسان کے اندر ہوں۔ سالک دیکھ لیتا ہے اس کی شان کریمی اور اس کی پریشانیاں ختم ہو جاتی ہیں۔

میرے دوستو! مجھے یہ بتائیں کہ جنت میں اللہ کے دوست رہیں گے یا دشمن؟

آپ کا جواب یہ ہے کہ اللہ کے دشمن نہیں رہیں گے۔ اللہ کے دوست رہیں گے۔

اللہ یہ کہتا ہے کہ

''جس بندے کے اندر غم اور خوف ہوگا وہ میرا دوست نہیں ہے۔''

بتائیں اگر ہمارے اندر غم اور خوف ہے تو ہماری پوزیشن کیا ہوئی؟ نہ ہمیں اللہ کی دوستی پر یقین ہے۔ ہمیں دوست کی طرح اللہ کی صفات کا عرفان بھی نہیں ہے۔ غم اور خوف ہمارے اوپر مسلط ہے۔ اللہ نے واضح الفاظ میں فرمایا ہے'' میرے دوستوں کو خوف اور غم نہیں ہوتا۔''

یہ بات بھی قابل غور وفکر ہے کہ جب کوئی اللہ سے ڈرتا ہے تو اللہ کا دوست کیسے ہوگا۔ کیونکہ خود اللہ نے فرمایا ہے۔ میرے دوستوں کو خوف اور غم نہیں ہوتا۔

غم اور خوف نکالنے کا طریقہ صرف ایک ہے کہ آپ اپنے اندر اللہ کی تلاش کر لیں۔ جب ایک دفعہ آپ اللہ تعالیٰ کو دیکھ لیں گے اور اللہ آپ سے جس طرح چاہے تکلم فرمالیں گے تو آپ کے اندر یقین پیدا ہو جائے گا کہ رزق دینے والا مجھے موت اور حیات میں الٹ پلٹ کرنے والا میرا ہمدرد اور غم گسار ہے۔ میرا مالک اللہ ہے میں اللہ کا بندہ ہوں اور اللہ سے میری دوستی ہے۔ جب آپ کو یقین پیدا ہو جائے گا تو آپ کے یقین کے بعد آپ کے اندر سے غم اور خوف نکل جائے گا۔ جب آپ اللہ کے دوست بن جائیں گے تو آپ کو جنت قبول کرلے گی۔

میں نے ایک دفعہ مرشد کریم حضور قلندر اولیاءؒ سے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ کی سنت مشیت اور عادت رحم ہے۔ قرآن میں اگر کہیں عذاب کا تذکرہ بھی ہے تو وہاں بھی اللہ تعالیٰ نے یہ ضرور فرمایا ہے کہ اللہ رحم کرنے والا' معاف کرنے والا ہے۔ کوئی بھی آیت جہاں عذاب کا تذکرہ آیا ہے۔ وہاں اتنا رحیم و کریم اللہ ہم کمزور و ناتواں کو دوزخ میں کیسے ڈالے گا؟

مرشد کریم نے کہا کہ نہیں' اللہ تو دوزخ میں نہیں ڈالے گا۔ میں نے کہا' حضور جنت کا تو

کوئی تذکرہ ہی نہیں کرتا۔ بھی دوزخ کا تذکرہ کرتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ خواجہ صاحب! بات یہ ہے کہ جس کے اندر جو چیز ہوتی ہے وہی باہر آتی ہے۔ اگر دوزخ اندر بھڑک رہی ہے تو دوزخ ہی کی آوازیں نکلیں گی۔ اللہ نہیں دوزخ میں ڈالتا۔ اللہ کی شان کریمی سے یہ بات بعید ہے کہ وہ مکھی مچھر سے بھی چھوٹے اور کمتر بندوں کو دوزخ میں ڈالے گا۔ میں نے کہا یا مرشد پھر کیا ہوگا۔ فرمایا۔ یوم حشر میں لوگ جمع ہوں گے۔ ہر آدمی پریشان ہوگا۔ میدان حشر میں گروہی تقسیم ہوگی۔ مثلاً سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے محبت رکھنے والے لوگ ادھر ہی جائیں گے جہاں حضورﷺ تشریف فرما ہوں گے۔

سیدھی سی بات ہے آپ پہلی دفعہ لندن جائیں وہاں آپ کا کوئی عزیز دوست رشتہ دار ہے آپ اسی کے پاس جائیں گے۔ اگر بیٹی ہے تو پہلے بیٹی کے پاس اور اگر دوست ہے تو پہلے اس کے پاس جائیں گے۔ جتنا جس سے جو تعلق ہوگا اسی مناسبت سے آپ کے قدم بڑھیں گے۔

جتنے پیغمبران اب تک تشریف لائیں ہیں ان سب سے تعلق رکھنے والے گروہ در گروہ تقسیم ہو جائیں گے۔ جتنے لوگ' خوفزدہ' مصیبت زدہ اور پریشان ہیں اور شیطان کے دوست ہیں وہ شیطان صفت لوگوں کی طرف جائیں گے' روئیں گے' چیخیں گے' چلائیں گے۔ اللہ تعالیٰ پوچھیں گے کیوں شور مچا رہے ہو' کیوں رو رہے ہو' کس بات کی عاجزی انکساری ہے' کیا چاہتے ہو۔ وہاں پیغمبر اور پیغمبروں کے وارث اولیاء اللہ' اللہ کے سامنے سجدے میں گر جائیں گے پھر ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جائیں گے۔ یا اللہ یہ تیری مخلوق ہیں ان سے غلطی ہوگئی۔ غلطی کے کفارے میں پریشان ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کیا ہم نے ان کے اوپر پیغمبر بھیج کر ان کے اوپر تمام حجت نہیں کر دیا تھا۔ کیا ہم نے یہ نہیں بتا دیا تھا کہ کونسی بات ایسی ہے کہ جس سے یہ اللہ کی دوستی کے حلقے میں آجائیں گے اور کونسی بات ایسی ہے جس سے یہ اللہ کی دوستی کے حلقے سے نکل جائیں گے۔ انبیاءؑ کہیں گے یا اللہ آپ رحیم و کریم ہیں۔ یا اللہ آپ ستار العیوب ہیں ان سے غلطی ہو گئی۔ آپ انہیں معاف کر دیں۔ یہ سن کر لوگ اور زیادہ رونے لگیں گے اور شور مچائیں گے۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے چلے جاؤ تمہیں اس وقت اتنا سمجھایا تمہاری سمجھ میں نہیں آیا۔

مرشد کریم نے بڑی عجیب بات فرمائی کہ دوزخی از خود دوزخ کی طرف چلے جائیں گے اور جنت کے لوگ جنت کی طرف چلے جائیں گے۔ اللہ اکبر! اللہ کی صفت ہے عیوب کی پردہ پوشی کرنا۔ گناہوں کو معاف کرنا۔ اللہ دوزخ میں نہیں ڈالے گا۔

سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وارث ابدال حق حضور قلندر بابا اولیاءؒ سے ہماری نسبت ہے۔ یہ ہماری نسبت ہے۔ یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنے محبوبﷺ کے محبوب تک پہنچا دیا ہے اور اس محبوب بندے نے اپنی روحانی اولاد سے کوئی چیز چھپا کر نہیں رکھی۔ سب عیاں کر دیا ہے۔ کہ فلاں فائل میں یہ اسرار فائل ہیں۔ فلاں فائل میں یہ رموز ہیں۔ فلاں مقام تک پہنچنے میں یہ عمل کرنا اور فلاں مقام تک پہنچنا اس وقت ممکن ہے جب آدمی خود کی نفی کرے۔ کائنات جو کچھ ہے اس کے نقشے بنا کر سمجھایا ہے ان سب ہدایات کے ہوتے ہوئے بھی میرے دوستو' میرے بچو' میری روحانی اور جبلی اولاد۔ خدارا اللہ کی قربت کو اس طرح محسوس کرنا جس طرح اللہ خود کہتا ہے۔ میں تمہاری رگ جان سے زیادہ قریب ہوں۔ اپنے جد امجد' اپنے دادا کی طرز فکر کے مطابق اور ان کے بتائے ہوئے راستہ پر مستقل مزاجی اور یقین کے ساتھ' قدم ملا کر چلنا۔ سلسلہ عالیہ عظیمیہ اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ بیوی بچوں کو چھوڑ دیا جائے۔ کاروبار ختم کر دیا جائے۔ آدمی جنگل میں جا کر جھونپڑی ڈال کر بیٹھ جائے۔ سلسلہ عالیہ عظیمیہ سالکان طریقت کو اعتدال پر قائم رہنے کی تلقین کرتا ہے۔ نماز کے وقت پورے خشوع و خضوع سے نماز قائم کرو۔ چوبیس گھنٹے ذکر و افکار میں نہیں لگے رہو۔ چوبیس گھنٹے مراقبہ نہ کرتے رہو۔ رمضان میں روزے رکھو۔ مراقبہ کے وقت مراقبہ کرو۔ کوئی سالک اپنے والدین۔ اولاد اپنے دوست کا حق پورا نہیں کرتا تو وہ حق تلفی کرتا ہے۔ اللہ دو گناہ معاف نہیں کرتے۔ ایک شرک اور دوسرا حقوق العباد۔ اگر کوئی بندہ گھر بار چھوڑ کر جنگل میں چلا گیا ہے وہاں اس نے جھونپڑی ڈال لی بیوی بچوں اور والدین کے حقوق پورے نہیں کیے۔ اس نے حق تلفی کی۔ جو شرک کے برابر گناہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق بھرپور زندگی گزارو۔ شادی کرو۔ بچوں کی تربیت اور ان کی سرپرستی اللہ کے لئے کرو۔ اچھا کھاؤ۔ اچھا

پہنو۔ اچھے گھر میں رہو۔ لیکن اس بات کو ہمیشہ مدنظر رکھو کہ اچھا کھانا، اچھا پہننا اچھی بیوی اچھی اولاد آپ کو اللہ نے دی ہے۔ مال وزر، اولاد، جائیداد آپ کی ذاتی ملکیت نہیں ہے۔ اللہ کی دی ہوئی امانت ہیں۔ اگر اولاد کے بارے میں آپ کا یہ تصور قائم ہو جائے کہ اولاد میری ملکیت نہیں ہے اللہ کی ملکیت ہے تو وہ اولاد آپ کے لئے نعمت ہے۔ اگر آپ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ اولاد میری ملکیت ہے۔ میرے بڑھاپے کا سہارا بنے گی تو ایسی اولاد آپ کے لئے فتنہ ہے۔ آپ کے پاس پیسے ہیں تو وہ اللہ کے دیے ہوئے ہیں۔ خوب کھاؤ پیو لیکن اسراف نہ کرو۔ پڑوسیوں کا خیال رکھو۔ بڑوں کا ادب کرو۔ اور چھوٹوں پر شفقت کا ہاتھ رکھو۔ جو کھالیا جو کھلا دیا اور جو اللہ کے نام دے دیا وہ آپ کا ہے۔ اور جو چھوڑ گئے وہ آپ کے کام نہیں آئے گا۔

دنیا دیکھی بات ہے کہ ماں باپ اولاد کے لئے جائیداد چھوڑتے ہیں اور اولاد مقدمہ بازی یا لڑائی جھگڑے میں مبتلا ہو جاتی ہے جو اپنی عاقبت خراب کر کے اولاد کیلئے جائیداد چھوڑتا ہے تو اولاد کے ساتھ دشمنی کرتا ہے۔ ہمارے ایک دوست خان صاحب تھے۔ جب ان کا انتقال ہوا تو ان کی اولاد میں چار لڑکیاں اور ایک بھائی تھا۔ بیٹیاں اور داماد آ گئے کہ پہلے حساب کرو پھر لاش اٹھے گی۔ ایسی ایک نہیں ہزاروں مثالیں آپ نے سنی ہوں گی۔ اگر آپ اولاد کے لئے یہ سوچ رہے ہیں کہ میرے بعد ان کا کیا ہوگا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ پر آپ کا یقین کمزور ہے۔ اللہ نے پیدا کیا ہے۔ اللہ ہی سنبھالتا ہے۔ اللہ نے جس طرح آپ کو سنبھالا ہے اسی طرح آپ کی اولاد کو بھی سنبھالے گا۔



''ذات مطلق کی شناخت''

سوال: الشیخ عظیمی صاحب! انبیاء کرام علیہم السلام ذات مطلق اللہ تعالیٰ کو شناخت کرنے کا درس دیتے ہیں اور غیر اللہ کو مخلوق قرار دے کر اس کی نفی کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ذات مطلق کو پہنچانے کا روحانی طریقہ کیا ہے؟

جواب: انبیاء علیہم السلام کی طرز تعلیم میں یہ بات نظر آتی ہے کہ انہوں نے خالق کائنات کے حکم کا تعارف کرایا ہے۔ انبیاء کرام نے اپنی تعلیم میں زور دیا ہے کہ اسی ذات کو سمجھنے کی کوشش کی جائے جس ذات کے امر سے کائنات وجود میں آئی۔ اس لئے کہ جب تک ذات مطلق کو نہیں سمجھا جائے گا ذات مطلق کے امر یا حکم کو سمجھنا ممکن نہیں ہے۔ کچھ لوگ اس بات پر معترض ہیں کہ امر کو سمجھنا یا خالق کائنات کی ذات مطلق کے ارادے کو سمجھنا کس طرح ممکن ہے؟ اس لئے کہ امر جب تک خود کسی انسان کا ادراک نہ بنے امر کا سمجھنا ممکن نہیں ہے۔

امر کو سمجھنے کے لئے انسان کو اپنی اسی کنہہ سے وقوف حاصل کرنا ہوگا جو دراصل انسان کی صورت میں خود امر ہے۔ مقصد یہ ہے کہ انسان پہلے خالق کائنات کے امر کا تعارف حاصل کرتا ہے۔ یعنی انسان خود سے متعارف ہونا چاہتا ہے۔ کیونکہ انسان کی حیثیت خود امر ہے یا امر کے تابع ہے۔ انسان جب خود سے متعارف ہو جاتا ہے اور اپنے اندر حکم الٰہیہ سے متعارف ہو جاتا ہے تو وہ ذات مطلق کا تعارف حاصل کر لیتا ہے۔ جب تک کوئی روحانی آدمی امر کو نہیں جانتا نہ خود اپنی ذات سے واقف ہو سکتا ہے اور نہ خالق کائنات کا تعارف حاصل کر سکتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب کوہ طور پر روشنی دیکھ کر سوال کیا:

کون......؟

خالق کائنات نے جواب دیا

''میں ہوں تیرا رب''

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو روشنی دیکھی وہ روشنی امر رب تھی۔ وہ روشنی کس کی تھی؟

وہ روشنی ذات مطلق کی تھی۔ اس واقعہ سے ذات مطلق اور ذات امر کی حدود کا تعین ہو جاتا ہے۔ موسیٰ (علیہ السلام) ذات امر ہے۔ خالق کائنات ذات مطلق ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ذات امر ہونے کے باوجود امر کو روشنی میں مشاہدہ کر کے یہ سوال کیا کہ کون۔؟

یعنی امر نے اس بات کی احتیاج محسوس کی کہ وہ ذات مطلق کو پہچانے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے روشنی دیکھ کر یہ جان لیا کہ یہ میرا رب ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کو اس بات کی احتیاج ہوئی کہ روشنی امر سے اپنا تعارف کرائے۔

امر ذات مطلق کا محتاج ہے۔ اور ذات مطلق کسی چیز کی محتاج نہیں ہے۔ بعض لوگوں نے ذات مطلق کو حقیقت مطلقہ کہا اور امر مطلق کو کائنات کہا ہے۔ یہ طرز بیان ان لوگوں کا ہے جن لوگوں کی طرز تلاش یہ ہے کہ وہ پہلے ظاہر کو دیکھتے ہیں اور ظاہر جس باطن پر قائم ہے اس کو تلاش کرتے ہیں اور اس تلاش سے کسی نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کائنات میں بے شمار لا محدود چیزیں ایسی ہیں جو ظاہر نہیں ہیں۔

(آج کے سائنسی دور میں ایسی چیزوں کا انکشاف ہوا ہے اور ہو رہا ہے جو چیزیں آنکھ نے نہیں دیکھی تھیں)۔

سائنسدان جن چیزوں کی علامتیں خارج میں نہیں دیکھتے ان کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ان کے اس عمل سے کائنات کے اندر مخفی حقائق زیادہ تر انجانے رہ جاتے ہیں۔

سائنسدانوں کے برعکس انبیاء کا عمل حقیقت پر مبنی ہے۔ اس لئے کہ وہ ظاہر سے باطن کو تلاش نہیں کرتے بلکہ باطن سے ظاہر کو تلاش کرتے ہیں۔ وہ ذات مطلق کے ذریعے امر مطلق کو تلاش کرتے ہیں۔ اس طرح ان کی فکر ایسے اجزاء کو پالیتی ہے جو مظاہر کے پابند نہیں ہیں۔ انبیاء مظاہر کو نظر انداز نہیں کرتے تاہم وہ مظاہر کو اصل قرار دے کر صرف مظاہر کی روشنی میں گم نہیں ہو جاتے۔ وہ مظاہر کو بھی اتنی اہمیت دیتے ہیں جتنی مظاہر کی اصلوں کو۔ انبیاء کی فکر میں ذات مطلق ہی حیات ہے۔ اس لئے وہ حیات کو ابدی قرار دیتے ہیں اور کائنات کو ثانوی درجہ دیتے ہیں۔ انبیاء کہتے ہیں پہلے حیات ہے پھر کائنات ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ پہلے کائنات پھر

حیات ہو۔ حیات ہے تو کائنات ہے۔ اس کے برخلاف مظاہر کو اولیت دینے والے (Scientist) اس لئے حیات کی پہنائیوں اور گہرائیوں تک نہیں پہنچ سکتے کہ وہ پہلے کائنات کو اہمیت دیتے ہیں پھر حیات کو اہمیت دیتے ہیں۔ انبیاء نے یہ بات اپنی طرز فکر سے تحقیق کی ہے کہ فکر انسانی میں ایسی روشنی موجود ہے جو کسی ظاہر کے باطن کا کسی حضور کے غیب کا مشاہدہ کر سکتی ہے۔

بالالفاظ دیگر انسانی ذہن پر یہ بات منکشف ہو جاتی ہے کہ حیات کی ابتداء کہاں سے ہوئی ہے اور انتہا کہاں تک ہے۔ جب ہم ابتداء اور انتہا پر تفکر کرتے ہیں تو منکشف ہوتا ہے کہ ہر ابتداء انتہا تک پہنچنے کے لئے قائم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیائے کرام موت کے بعد کی زندگی کو سمجھنے پر زور دیتے ہیں۔

آخری نبی محمد الرسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

''مر جاؤ مرنے سے پہلے۔''

☆☆☆

"مردِ حق"

سوال: ہمارا یہ مشاہدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے انسانوں کے لئے ہدایت ورہنمائی کی تمام تر تعلیمات کی تکمیل کے باوجود انسان نے اختلاف وانتشار' خوف و بیزاری' خونریزی اور ہلاکت انگیزی مکمل طور پر ختم نہیں کی۔ اس کی بنیادی وجہ کیا ہے؟

جواب: غور وفکر سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس کی بنیادی وجہ انسان کا صرف اور صرف اپنی عقل ہی کو سب کچھ سمجھ لینا ہے۔ بلاشبہ عقل اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے لیکن لوگ یہ سمجھنے سے قاصر رہے کہ اگر انتہا عقل ہی انسان کے لئے کافی تھی تو پھر پیغمبروں کے بھیجنے اور وحی کی رہنمائی عطا فرمانے کی کیا ضرورت تھی؟ تمام مادی اشیاء کی طرح عقل کی بھی محدودیت ہیں وہ وہیں تک ان کی رہنمائی کرسکتی ہے جہاں تک اس کی حد ہے۔ مادہ **Matter** ورائے مادہ **Anti Matter** کی لامحدودیت کو کیسے پا سکتا ہے؟ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں اس عقل نے انسان کو فکر وعمل کی انتہائی بلندیوں پر پہنچایا وہیں اسے درماندگی اور پریشانیوں کے گہرے گڑھوں میں بھی دھکیلا ہے۔ آج نوع انسان ہلاکت وخونریزی اور خوف وانتشار کے عذاب میں مبتلا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہی ہے اور انسان جب تک عقل کو ہدایت الٰہی کے تابع نہیں کرے گا اس کے مسائل یونہی لاینحل رہیں گے۔

اللہ کے نیک اور برگزیدہ بندے ہر دور میں ہدایت الٰہی کی روشنی پھیلاتے رہے مگر نوع انسانی کے بیشتر افراد کو ان کی فکر کے اسی تضاد نے حقیقت تک نہ پہنچنے دیا۔ مشہور محقق اور نامور مصنف ڈاکٹر سید حسن نصر نے اپنی مشہور کتاب "**Three Muslim Stages**" میں شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کا ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ شیخ ابن عربی کا زمانہ چھٹی سے ساتویں ہجری کا ہے۔ اس زمانے میں ابن رشد کا طوطی بولتا تھا۔ جنہوں نے ارسطو کی تعلیمات کا ترجمہ کیا تھا اور وہ شیخ اکبر کے والد کے بہترین دوست تھے۔ ابن رشد نے شیخ ابن عربی کا بہت تذکرہ سنا تو ان کے والد کے ذریعے شیخ سے ملاقات کے خواہاں ہوئے چنانچہ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی

نے ابن رشد سے اپنی ملاقات کا احوال یوں بیان کیا ہے "جب میں مکان میں داخل ہوا تو اس فلسفی مرد نے مجھ سے بہت محبت اور گرمجوشی کا اظہار کیا پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہا "ہاں" میں نے جواب میں کہا "ہاں" چنانچہ وہ بہت خوش ہوئے اور یہ سمجھے کہ میں ان کی بات اچھی طرح سمجھ گیا ہوں مگر اب میں ان کی خوشی کی عادت سے آگاہ ہو چکا تھا چنانچہ ساتھ ہی میں نے "نہیں" بھی کہہ دیا۔ ابن رشد کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ جو کچھ وہ سوچ رہے تھے اس کے بارے میں انہیں شک پڑ گیا ہے چنانچہ انہوں نے مجھ سے پوچھا "تم نے اشراق والہام کے توسط سے کون سا حل معلوم کیا ہے؟ میں نے جواب دیا" ہاں" اور ناں" ہاں اور نہیں کے مابین نفوس اپنے مادے سے فرار ہوتے ہیں اور گردنیں اپنے بدنوں سے جدا ہو جاتی ہیں۔ ابن رشد یہ سب سن کر زرد پڑ گئے۔ میں نے دیکھا کہ وہ کانپ رہے ہیں ان کے منہ سے یہ کلمات بندگی نکلے "لاحول ولاقوۃ" اس لئے کہ جس امر کی جانب میں نے اشارہ کیا تھا وہ اسے سمجھ گئے تھے۔ اس کے تھوڑی دیر بعد ہماری ملاقات ختم ہو گئی۔ اس کے بعد میں کسی اور موقع پر ان سے دوبارہ ملاقات کا خواہاں ہوا' عنایت ایزدی کے باعث وہ عالم مخفی میں میرے سامنے آ گئے اور اس انداز میں کہ میرے اور ان کے درمیان روشنی کا ایک پردہ حائل تھا اور میں اس پردے میں انہیں دیکھ رہا تھا مگر وہ مجھے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ انہیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ میں وہاں ہوں۔ درحقیقت وہ غور وتامل میں یوں مستغرق تھے کہ میرے بارے میں آگاہ ہو ہی نہ سکے۔ پھر میں نے اپنے آپ سے کہا "ان کا تفکر وتامل انہیں وہاں نہیں لے جا سکتا جہاں میں ہوں" بعد ازاں ان سے میری ملاقات نہ ہو سکی۔

ابن رشد مراکش میں انتقال کر گئے ان کا جسد خاکی قرطبہ میں منتقل کر دیا گیا جہاں ان کا مقبرہ واقع ہے ان کا تابوت بار برادری کے جانور کے ایک پہلو میں لدوایا گیا تھا۔ دوسرے پہلو میں ان کی تصانیف لادی گئیں تھیں تاکہ توازن برقرار رہے۔ ابن عربی نے اس موقع پر کہا "میں اس واقعہ پر غور کرتا ہوں تو خود سے کہتا ہوں ایک جانب شیخ دوسری جانب تصانیف ہائے میں کس قدر خواہاں ہوں کہ پتہ چلے کہ اس کی امیدیں برآئیں یا نہیں؟"

موجودہ دور کے عظیم روحانی سائنسدان قلندر بابا اولیاء رحمتہ اللہ علیہ نے اس نکتہ کو دہراتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ یہی وہ انسانی ذات یا ''انا'' ہے جو رب سے جدا نہیں ہو سکتی اور یہی معرفت الٰہیہ کا پہلا قدم تو وہ معرفت الٰہیہ سے محروم ہے۔ دوسری جگہ فرمایا ''انا'' کے صفت الٰہیہ میں جذب ہونے کی کئی منزلیں ہیں اور پہلی منزل ایمان لانا ہے اور اس ایمان کے بارے میں قرآن پاک نے اپنی ابتدائی آیت میں شرائط بندی کر دی کہ ''اس عظیم المرتبہ کتاب میں کوئی شک نہیں ہے اور اس میں اللہ سے ڈرنے والوں' یعنی ان لوگوں کے لئے جو برائی سے بچنا اور نیکی کے راستے پر چلنا چاہتے ہیں' جن کے دلوں میں اس راستے پر چلنے کا رجحان Aptitude ہے صرف ان کے لئے اس میں ہدایت ہے۔ اور پھر وہ ایسے لوگ ہوتے ہیں جو غیب پر ایمان لاتے ہیں غیب پر یقین رکھتے ہیں''۔ اب اس حوالہ کے بعد قلندر باباء اولیا رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''قانون یہ ہے کہ غیب کی دنیا سے متعارف ہونے کے لئے غیب کی دنیا پر یقین رکھنا ضروری و لازمی ہے۔''

اب اس کی روشنی میں تمام بات صاف ہو جاتی ہے کہ وہ تمام لوگ جو صرف اور صرف عقل کی موشگافیوں پر یقین رکھتے ہیں اور اسی کے ذریعے اس حیات و کائنات کو سمجھنا اور اس کی گتھیوں کو سلجھانا چاہتے ہیں وہ کس قدر نادانی میں مبتلا ہیں اور کیوں اس حیات و کائنات کی صداقتوں تک نہیں پہنچ سکتے!

ابن رشد اور شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کا اس سے پہلے بیان کردہ واقعہ اس کی بہترین مثال ہے۔ عقل صرف ہاں کی نمائندگی کرتی ہے جبکہ زندگی کی حقیقت نفی اور اثبات میں مضمر ہے۔

قلندر بابا اولیاءؒ فرماتے ہیں کہ کائنات کی ساخت میں نسمہ (نظر نہ آنے والی روشنی) ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور اس کی ساخت میں موجود چھوٹے سے چھوٹے کم ترین جز کی بنیاد دو قسموں پر ہے۔ ایک منفی اور ایک مثبت اور ان ہی دو صلاحیتوں کے توازن کا نام نسمہ ہے۔ گویا نسمہ حرکت کی ان بنیادی شعاعوں کا نام ہے جو کسی بھی وجود کی ابتداء کرتی ہیں اور حرکت اس جگہ ان لکیروں کو کہا گیا ہے جو ہمارے اطراف خلاء میں اس طرح پھیلی ہوئی ہیں

کہ نہ ان میں کوئی فاصلہ ہے اور نہ وہ ایک دوسرے میں پیوست ہیں اور یہی وہ لکیریں ہیں جو تمام مادی اجسام کی بناوٹ میں اصل (Base) کا کام دیتی ہیں۔

ٹائم اسپیس کا قانون:

روحانی سائنسدان قلندر بابا اولیاء نے کائنات کی اصل کے بارے میں تمام رموز کو کھول کر عامتہ الناس کے لئے عام کر دیا۔ اب اس میں دو نکتے بہت اہم ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس سے پہلے روحانی علوم کا حصول عامتہ الناس کے لئے قریب قریب ناممکن تھا۔ دوسرے جو چند طالبان حق اس راہ میں قدم رکھتے تھے ان کو اتنی طویل صبر آزما مشقتوں سے گزرنا پڑتا تھا کہ ان میں سے بہت کم کو ہی گوہر مقصود ہاتھ آتا تھا۔ بزرگان کرام خود بھی ان علوم کی عام اشاعت سے حد درجہ احتیاط کرتے تھے۔ اس بات سے اس دور کے جبر کا بھی ایک عام اندازہ ہوتا ہے کیونکہ مطلق النان بادشاہتیں اور سلطنتیں قائم تھیں جبکہ عام مسلمان گروہوں اور ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے تھے ان کے اذہان محدود اور فرسودہ رسوم و روایات کے اس درجہ پابند ہو چکے تھے کہ نئے انداز سے کوئی بات کرنا فساد برپا کرنا ہو جاتا تھا۔

موجودہ دور میں قلندر بابا اولیاءؒ کی نگاہ حقیقت بین و زمانہ شناس نے آنے والے دور کی جھلک دیکھی تو انہوں نے ان تعلیمات کو ان کی تمام تر حقیقتوں اور سچائیوں کے ساتھ عام کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ ان کی عارفانہ نگاہ نے یہ دیکھ لیا تھا کہ مادی ترقی کے اس عروج کے بعد جو ماحول پیدا ہوا اس میں انسان روحانی سچائیوں اور اپنے خالق کی تلاش میں ضرور سرگرداں ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے اس امر کو ضروری سمجھا کہ انسان کے ایمان کی پیاس کی تشنگی کے لئے حقیقت اور سچائی پر مبنی رموز کو واضح انداز میں بیان کر کے آنے والوں کے لئے محفوظ کر دیا جائے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اپنی کتاب ''لوح و قلم'' میں ایک جگہ انہوں نے اس کا ذکر بھی کر دیا'

''مستقبل کے خوفناک تصادم چاہے معاشی ہوں یا نظریاتی' نوع انسانی کو مجبور کر دیں گے کہ وہ بڑی سی بڑی قیمت لگا کر اپنی بقاء تلاش کرے اور بقاء کے ذرائع قرآنی نظام توحید کے سوا کسی نظام حکمت میں نہیں مل سکتے۔''

آج کے حالات میں ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی بات کس قدر سچ ثابت ہو رہی ہے۔ اب آیئے ٹائم اینڈ اسپیس کے قانون کی طرف' یہ بات تو واضح ہوگئی کہ تمام اجسام نسمہ کی حرکات کا مجموعہ ہیں اور ان کی لکیریں ہی تمام مادی اجسام میں آپس کے رابطے کا کام دیتی ہیں۔ یہ لکیریں کیا ہیں؟ یہ مفرد اور حرکت کا مجموعہ ہیں۔ نسمہ کی یہ حرکت جب مفرد وضع پر رہتی ہے تو یہ اکہری حرکات پر مشتمل ہوتی ہیں اور ان حرکات کے مجموعہ میں جتنے بھی نقش و نگار بنتے ہیں وہ جنات یا جنات کی دنیا ہیں اور جب یہی حرکات تانے اور بانے کی طرح ایک دوسرے کی مخالفت میں حرکت کرتی ہیں تو ان سے جو نقش و نگار بنتے ہیں اسے انسان یا انسان کی دنیا کہا جاتا ہے۔ اب اس کے بھی دو درجہ ہیں جب تک یہ حرکات غیر محسوس درجہ میں رہتی ہیں تمثل کہلاتی ہیں اور نظر نہیں آتیں اور جب یہ حرکات محسوس دائرے میں آجاتی ہیں تو یہ جسم کی شکل اختیار کر لیتی ہیں جو مادیت یا مشاہدے کے زمرے میں آجاتی ہیں۔ پہلے مرتبے کا نام عالم ارواح ہے اور دوسرے مرتبہ کا عالم مثال۔

نیابت:

اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی ہوئی صلاحیتوں کو اللہ تعالیٰ کے بخشے ہوئے علم الاسماء کی روشنی میں سمجھنا اور اس کے مطابق دنیا و کائنات کے امور کو سرانجام دینا نیابت کہلاتا ہے۔ انسان جب نیابت کے اس درجہ کا ادراک کر لیتا ہے تو اس پر یہ منکشف ہو جاتا ہے کہ اس حیات و کائنات میں کوئی ایک چیز بھی ایسی نہیں جس کی بنیاد اللہ تعالیٰ کے نور پر قائم نہ ہو یعنی تمام کائنات میں جو کچھ بھی ہے اس کا وجود اللہ تعالیٰ کی ذات سے (Feed) ہو رہا ہے اور جب یہ تجلی اس پر سے ہٹ جاتی ہے تو وہ فنا ہو جاتا ہے وہ باقی رہ ہی نہیں سکتا! اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ہر چیز پر اللہ تعالیٰ کی تجلی اپنی پوری آن بان کے ساتھ جلوہ فگن ہے تو پھر یہ بگاڑ' یہ انتشار' یہ شر' یہ فساد کہاں سے آتا ہے؟ کیسے پیدا ہوتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ تمام حیات و کائنات میں ہر چیز کسی نہ کسی قانون کے ماتحت کام کر رہی ہے ہر کام کے لئے ایک ضابطہ مقرر ہے جب وہ اس ضابطہ سے ہٹتا ہے کسی خرابی یا عدم توجہی کی وجہ سے اس میں خلل واقع

ہوتا ہے تو اس روشنی میں جو کائنات کے محدود سے محدود ترین ذرّے تک میں گردش کر رہی ہے۔ اس کی رفتار اور (Frequency) میں خلل واقع ہوتا ہے اور اس خلل کی وجہ سے ناخوشگوار نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ مثلاً بجلی کی منفی اور مثبت برقی رو جب تک اصول اور ضابطے کی رو سے بہتی رہتی ہے' مفید اور کارآمد نتائج پیدا کرتی ہے اور جب کسی وجہ سے اس میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے تو وہی قہر بن جاتی ہے جس کو عرف عام میں ''شارٹ سرکٹ'' کے ذریعے جانا جاتا ہے۔ یہی معاملہ جب اشخاص کی طرف واقع ہوتا ہے تو اس کی وجہ ناگہانی آفت' قسمت' تقدیر کہہ کر سوچنے کی راہ بند کر لی جاتی ہے۔ حالانکہ لوح محفوظ کے قانون کے مطابق تجلی جو ہمیشہ خیر ہی خیر ہوتی ہے اس کی طرف Feed کرنے لپکتی ہے مگر جب شخص مذکور اپنے جسم کے محدود ترین خول میں تعفن یا کثافت پیدا کرتا ہے تو پھر یہی تجلی اس سے بے رخی اختیار کر کے ان قوتوں کی طرف چلی جاتی ہے جو خیر کی پاکیزگی اور نفس مطمئنہ کی حلاوت سے معمول ہوتے ہیں اور اس طرح انہیں شاد کام کرتی ہے اور خیر کا یہ (Circle) جاری و ساری رہتا ہے۔ قرآن میں سورہ مطففین میں اور حدیث میں بیان کردہ دلوں کا زنگ یہی تعفن اور کثافت ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ہم کون سا وہ کام کریں کہ ہمارے اندر وہ کثافت و تعفن پیدا نہ ہو جو خیر کی تجلی کو ہم سے دور کر دیتا ہے اور ہم محروم و مایوس و منتشر رہ جاتے ہیں۔ اس کا واحد طریقہ جیسا کہ اس سے پہلے شروع میں بیان کیا گیا اپنے اندر یقین و ایمان کا پیدا کرنا ہے یہ یقین کا (Pattern) ہی ہے جو ہماری ذات میں جتنا مستحکم ہوگا اتنا ہی ہم اللہ کی معرفت سے اور حیات و کائنات کی اصل سے واقف ہو سکتے ہیں۔ سمجھنے کی بات یہ ہے کہ یہ یقین یہ ایمان کہاں سے پیدا ہوتا ہے؟ اگر یہ ہماری عقل سے وجود میں آتا ہے تو یہ نہایت ہی ناپائیدار بنیاد پر ہے یہ وہ عمارت ہے جو کسی بھی وقت گر سکتی ہے ہاں اگر یہ ایمان ہمارے نفس ہماری ''انا'' یا روح کی گہرائی سے وجود میں آتا ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک پائیدار بنیاد ہے۔ اب یہاں سے ہمیں یہ سمجھنا ہوگا کہ روح کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ''روح ایک'' امر ربی'' ہے یعنی یہ

اللہ تعالیٰ کی طرف سے براہ راست ہمیں عطا کی گئی ہے اور یہی وہ پائیدار چیز ہے جو واپس اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹائی جائے گی جب ہم اس پر مزید تفکر کرتے ہیں اور اپنے ایمان کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی عبودیت وحقانیت پر استوار کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ یہ وہ گراں بہا عطیہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات بحد بشریت ہمیں عطا کی ہیں اور یہی وہ تحفہ ہے جس نے ہمارا رشتہ تمام کائنات سے جوڑ رکھا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ہم پر یہ شعوری طور پر واضح ہوتا ہے کہ ہمارا یہ جسم دراصل ایک عارضی لباس ہے جسے ایک وقت خاص تک ہمیں پہنے رہنا اور اس کے بعد ہماری اصل یعنی روح کو اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہونا ہے۔ جہاں اپنے اوپر گذرے ہوئے احوال کا حساب کتاب پیش کرنا ہے۔

اب یہیں پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ تخلیق آدم کا مقصد کیا تھا؟ ہمیں اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ایک حدیث قدسی ہماری رہنمائی کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا میں نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں۔'' اور اس نے اس حسین وجمیل اور محیر العقل کائنات کو بکمال محبت تخلیق فرمایا چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی تمام صفات میں رحمت اور قدرت غالب ہیں۔ چاہے وہ القیت کی صفت ہو یا رزاقیت کی۔ ان تمام میں رحمت ہی رحمت ہے اور کمال یہ ہے کہ وہ خود بے نیاز ہے' مقدم ہے' اول ہے' آخر ہے' باطن ہے' ظاہر ہے' غرض وہ کیا نہیں ہے؟ کون سی خوبی ہے جو اس میں نہیں ہے' کون سی بڑائی ہے جو اس میں نہیں سمائی ہے مگر انسان نے اس انسان نے جس کے لئے نعمتوں کا کوئی حساب نہیں' کبھی سوچا کہ یہ سب کچھ کس کے لئے ہے؟ صرف ہمارے لئے کیونکہ اس کی رحمت اس کی ہر صفت پر غالب ہے مگر ہم ہیں کہ ہمیں ہمارے آئینہ خانے ہی سے فرصت نہیں؟ خود ہی بنتے ہیں' خود ہی سنورتے ہیں اور خود ہی ان آئینوں کو توڑ دیتے ہیں جو ہماری اصل شکل ہمارے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔

کائنات کی اصل تعمیر ہے اس میں تخریب چل نہیں سکتی ہماری بھلائی اسی میں ہے کہ ہم اس کائنات کی کہنہ سے واقف ہو کر اس کی تعمیر وترقی میں اپنا حصہ ادا کریں۔ قلندر بابا اولیاءؒ ان

پاک طینت بزرگوں میں سے تھے جنہیں عقل وشعور کی آگاہی حاصل تھی۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی بقاء کے لئے ان کی تعلیمات کو نہ صرف سمجھیں بلکہ اپنے علم وعمل کے ذریعے ساری دنیا میں پھیلائیں۔ آج مادیت کے مارے ہوئے ذہنوں کو جتنی ضرورت ان تعلیمات کی ہے اتنی پہلے کبھی نہ تھی۔ قدرت اپنا کام کر کے رہتی ہے اگر ہم نے یہ کام نہ کیا تو کوئی دوسری قوم اُٹھے گی اور یہ کارنامہ ان کے سر رہے گا۔ انسان کا مستقبل توحید الٰہی کے نور میں پوشیدہ ہے جس دل میں ایمان کا کوئی بھی ذرّہ پوشیدہ ہے وہ اس نور سے منور ہو جائے تو ایک عالم روشن ہو جائے اور یہ حیات وکائنات اپنے خالق کے نور سے حیات نو کے گلزار کھلا دے گی۔ قلندر بابا اولیاءؒ کی تعلیمات پر جتنے غور وفکر کی آج ضرورت ہے اتنی پہلے کبھی نہ تھی۔ انسانیت کے در پر ایک مرد قلندر کی صدا اس کی حیات نو کی دلیل ہے۔ اے گوش حق نیوش اس صدا کو اپنے ذہن ودل میں جذب کر لے کہ یہی وقت کی ندا ہے اور اسی میں تری بقا ہے۔

اگر ہم بہ نظر غائر دیکھیں تو طرز فکر ہی کائنات کا حسن بھی ہے اور کائنات کی بدصورتی بھی ہے۔ حسن ان معنوں میں کہ طرز فکر اگر مثبت ہے تو کائنات کا ذرّہ ذرّہ روشن کرنوں کی طرح ہمارے رگ وپے میں سما کر ہمارے اعمال وکردار کو ایسے سانچوں میں ڈھال دیتا ہے جن سے محبت' خلوص وایثار اور انسان دوستی پروان چڑھنے لگتی ہے۔ اور اگر طرز فکر منفی ہے تو معاملات اسکے بالکل برعکس نمودار ہونے لگتے ہیں۔

دراصل یہ پوری کائنات ایک ایسا عکس خانہ معلوم ہوتی ہے کہ اس میں بھی عکس پڑ رہا ہے' پلٹ کر یہ وہی عکس ہمیں دکھا رہی ہے۔ اگر ہم اس کے اردگرد پھول ہی پھول بکھیر دیتے ہیں تو اس کے آئینے ہمیں پھول ہی دکھاتے ہیں اور اگر ہم اس کے سامنے کانٹوں اور خس وخاشاک کا ڈھیر لگا دیں تو ہماری نگاہیں کومل اور خوش رنگ پھول ہرگز نہ دیکھیں سکیں گی۔ ہمیں کانٹے ہی نظر آئیں گے جن کی چبھن تک ہم اپنے دلوں میں محسوس کریں گے۔

اگر ہم ذرا گہرائی میں جا کر غور کریں تو ہمارے سامنے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ انسان کے ہر عمل کی عکس بندی ہو رہی ہے۔ اور جن معاملات سے انسان نبرد آزما ہو رہا ہے وہ

تمام کے تمام اس عکس بندی کی تصویری شکلیں ہیں۔ نتائج مثبت انداز میں بھی آ رہے ہیں اور منفی انداز میں بھی آ رہے ہیں۔ یہاں یہ امر غور طلب ہے کہ نتائج کی یہ دو صورتیں کیوں ہیں؟ صرف مثبت یا صرف منفی نتائج ہی کیوں نہیں برآمد ہوتے ہیں؟ قدرت کا یہ قانون ہے کہ سورج کی شعاعوں سے تپش ہی پیدا ہوتی ہے اور چاند کی کرنیں فضا میں ٹھنڈی لہریں بکھیرتی ہیں۔ ٹھیک یہی حال انسان کی طرز فکر کا ہے کہ اگر خیالات میں پاکیزگی، محبت کی ہمہ گیری انسانی قدروں میں موجود ہوگی۔ جھوٹ، بے ایمانی، فریب اور غصے سے نفرت ہوگی، اللہ کی مخلوق کی بے لوث خدمت افراد معاشرہ کا شعار ہوگا تو یہ تمام کا تمام انداز فکر مثبت لہریں بکھیرنا شروع کر دیتا ہے اور فضا دھنک رنگوں سے معمور ہو جاتی ہے اور خود انسان چونکہ ان ہی فضاؤں کا باسی ہے لہٰذا اس کے اپنے دامن میں بھی دھنک رنگوں کی بہار بسیرا کر لیتی ہے۔ اور غم و آلام اس کے پاس بھٹکنے بھی نہیں پاتے۔

منفی طرز فکر شیطانی وسوسوں اور کثافت سے لبریز ہوتی ہے۔ جس طرح آتش فشاں پھٹ کر گرم لاوا اُنڈیلنے لگتا ہے اور آس پاس کی سرسبز و شاداب وادیوں کو جلا کر خاکستر کر دیتا ہے اسی طرح منفی طرز فکر کا حامل انسان اپنے اندر ایک بھٹی جلا لیتا ہے۔ جس میں وہ خود بھی جلتا رہتا ہے اور اپنے ماحول کو بھی اسی کی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ غصہ، مکر و فریب، بے ایمانی، ہوس زر، ظلم و ستم، منافقت اور اسی قسم کی تمام برائیاں منفی طرز فکر کے زمرے میں آتی ہیں۔ یہ منفی طرز فکر ہی تو تھی جس نے ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم برسائے اور لاکھوں انسان آن واحد میں لقمہ اجل بن گئے اور آج بھی اسی منفی طرز فکر کا حامل انسان اس کوشش میں سرگرداں ہے کہ ایسے مہلک ہتھیار بنائے جائیں جو کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ انسانوں کی جانیں لے سکیں۔

یہ کیسی بے حسی ہے کہ آدمی، آدمی کا دشمن بنا ہوا ہے۔ شعوری سطح اس قدر گر چکی ہے کہ اللہ رب العزت نے جسے اپنا نائب اور خلیفہ بنا کر اس زمین پر بھیجا وہ اپنے منصب کے تمام اختیارات بھلا بیٹھا اور اپنی ہی قبر خود اپنے ہی ہاتھوں کھودنے لگا، جس شاخ پہ بیٹھنا ہے اسے

ہی کاٹ ڈالتا ہے اور خود ہی قعر مزلت میں دھنستا چلا جا رہا ہے۔ اللہ کے بتائے ہوئے سیدھے راستے پر چلنے کے بجائے پُر پیچ گلیوں میں بھٹکتا پھر رہا ہے۔

انسانوں سے تو اللہ کی محبت کا یہ حال ہے کہ جب بھی نوع انسانی اپنے منفی ارادوں کی تکمیل میں تباہی و بربادی کے دہانے پر پہنچی اسی دم اللہ پاک نے ہدایت کے لئے کوئی پیغمبر بھیجا اور تمام پیغمبروں کی تعلیمات یہی رہیں کہ انسان صرف اور صرف مثبت طرز فکر کو ہی اپنائے اور ان ہی پر عمل پیرا ہو کر اللہ کی سرخروئی حاصل کرے تاکہ مصائب و آلام اور جملہ پریشانیوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکے۔ پیغمبروں کی آمد کا سلسلہ حضور نبی کریم احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ ﷺ کی تشریف آوری پر ختم ہوا۔ آپ ﷺ کی آمد تمام عالمین کے لئے باعث رحمت قرار پائی۔ آپ پر قرآن پاک کا نزول ہوا۔ قرآن پاک جو ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور علم کا ایک ایسا سمندر ہے کہ جس سے تفکر کی نئی راہیں کھلتی ہیں۔ یہ کتاب مبین اپنے ظاہر و باطن کی وسعت میں گوناں گوں آسمانی نعمتوں کی ایک بھرپور کائنات ہے۔ جو انوار خداوندی سے منور درخشاں اور سماوی علم و حکمت سے بھرپور ہے۔ جس میں رب جلیل و کریم نے اپنی رحمت بے پایاں سے سب کچھ عطا کر دیا ہے۔

مثبت طرز فکر کو اپنے اندر متحرک کرنے کے لئے ہمیں اپنی نفسانی خواہشات کے بے لگام گھوڑے کو سدھانا پڑے گا۔ کیوں کہ دنیائے ظاہر میں ایک بار توڑا ہوا بت پھر کبھی اپنے آپ درست، سالم اور بحال ہو کر بت نہیں بن سکتا۔ مگر آدمی کے اندر نفس یا خودنمائی کا صنم (بت) ایسا ہے کہ اسے بار بار توڑ کر ریزہ ریزہ کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس لئے کہ وہ ہر بار از خود زندہ ہو جانے والا جادوگر ہے۔ حقیقت میں ہم قرآن پاک کی روح سے بہت دور ہو گئے ہیں۔ قرآن پاک کا فہم و ادراک ہم سے چھن گیا ہے۔ اور اس محرومی نے ہمیں اپنی اصل سے جدا کر دیا ہے۔ لوگ رفتہ رفتہ اپنی اصلیت و حقیقت سے دور ہو گئے۔ باالفاظ دیگر وہ بیماری ہے۔ جن کے علاج کے لئے قرآن حکیم کا نزول ہوا تھا کہ ہر شخص اپنی اصل کی طرف لوٹ کر بحقیقت عکس آدم ہو جائے۔ مگر یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم قرآن کی روح کو سمجھ لیں اور

سمجھ کر اس پر عمل پیرا ہو جائیں۔ قرآن پاک کو صرف ثواب کی خاطر نہ پڑھا جائے بلکہ اللہ پاک کے فرمان پر غور و فکر کیا جائے۔ گہرائی میں جا کر انہیں سمجھنے کی سعی کی جائے۔ اس طرح شعور کی سکت بڑھتی جائے گی اور پھر ذہن میں قرآن پاک کی روح کے اسرار و رموز کی تجلیات جگمگا اٹھیں گی۔ اور دلوں میں یہ صدائے بازگشت سنائی دینے لگے گی کہ قرآن پاک اول تا آخر مثبت طرز فکر اور مثبت طرز عمل کی ہی دعوت دے رہا ہے اور تمام منفی اعمال سے بچنے کی تلقین کر رہا ہے۔

امام سلسلہ عظیمیہ حضور قلندر بابا اولیاءؒ کی تعلیمات کا محور یہی ہے کہ ذہن انسانی میں اللہ کی مرکزیت قائم ہو جائے اور اللہ اور بندے کے درمیان رشتے کی جو مستحکم ڈور ہے' اس ڈور کے جھول کو ختم کیا جائے۔ کسی بھی طریقے سے ذہن انسانی کو اللہ سے ہم رشتہ کر دیا جائے۔ کیوں کہ دنیاوی اسباب میں اتنی زیادہ کشش ہے کہ وہ ہر آن انسان کو اپنی طرف متوجہ رکھتا ہے۔ افکار کی تقسیم در تقسیم اور خیالات کی یلغار نے انسان کو ریزہ ریزہ بکھیر کر رکھ دیا ہے۔ اس بکھرے ہوئے انسان کی یکجائی سے اس کا تشخص اجاگر ہو کر سامنے آ سکتا ہے۔ اس یکجائی کے لئے ہمیں اللہ کی مرکزیت کی طرف رجوع ہونا پڑے گا۔ یعنی انبیاء کی طرز فکر کو اپنانا پڑے گا کہ کسی بھی شے سے انسان کا تعلق براہ راست نہیں ہے بلکہ اللہ کے توسط سے ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی طرز فکر یہ تھی کہ کسی بھی چیز کی طرف ان کا خیال جانے سے پہلے ان کے ذہنوں میں اللہ کا خیال آتا تھا۔ حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے ذہنی مرکزیت کے قیام کے سلسلے میں بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ نماز کا قیام اللہ سے ربط کا بہترین ذریعہ ہے۔ بشرطیکہ خلوص نیت سے نماز قائم کی جائے۔

☆☆☆

باب چہارم

"تعویذ اور ہندسے کیا کام کرتے ہیں"

سوال: ایک صاحب کئی سال سے خارش کے مرض میں مبتلا تھے۔ آپ کے مشوروں سے مستفید ہو کر پوری طرح صحت یاب ہو گئے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ آپ نے انہیں روزانہ ۷ عدد عناب کا پانی پینے کا مشورہ دیا تھا جبکہ وہ نہیں معلوم کتنی مصفی خون دواؤں کا استعمال کر چکے تھے۔ میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تعویذ میں ہندسہ اور دوسری مختلف شکلوں کا کیا مطلب ہے اور یہ ہندسے کیا کام کرتے ہیں۔

جواب: یہ بات ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ کائنات میں انسان اللہ تعالیٰ کی بہترین صنف ہے اور اللہ تعالیٰ خود احسن الخالقین ہیں۔ مفہوم واضح ہے یعنی دوسری مخلوق بھی اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے اختیارات کے تحت تخلیق کر سکتی ہے۔ بالالفاظ دیگر انسان اللہ تعالیٰ کی تخلیق میں مفید یا تخریبی رد و بدل کر سکتا ہے۔ مثلاً آگ اللہ کی تخلیق ہے ہم اس تخلیق سے تعمیر اور تخریب کے دونوں کام لے سکتے ہیں۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے "ہم نے حدید (لوہا' دھات) نازل کیا اور ان میں انسانوں کے لئے بے شمار فائدے ہیں۔"

مگر اسی لوہے سے جہاں انسانی فلاح و بہبود کے لئے بڑی سے بڑی مشینیں تیار کی جاتی ہیں وہاں اس دھات کو تخریب میں بھی استعمال کیا جا سکتا ہے اور کیا جا رہا ہے بعینہٖ یہی صورت کائنات میں موجود ہر اس شے کی ہے جس پر قدرت نے ہمیں اختیار دیا ہے۔

انسان کے اندر کام کرنے والی ساری صلاحیتوں کا دارومدار ذہن پر ہے۔ ذہن کی طاقت ایسے ایسے کارنامے انجام دیتی ہے جہاں شعور بھی ہراساں اور خوف زدہ نظر آتا ہے۔ انسان کی ایجاد کا یہ کتنا بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے اپنی ذہنی صلاحیتوں کو استعمال کر کے ایک معمولی ذرہ ایٹم کو اتنا بڑا درجہ دے دیا کہ اس ایک ایٹم سے لاکھوں جانیں ضائع ہو سکتی ہیں

یعنی ایٹم کو لاکھوں اشرف المخلوقات انسانوں پر فضیلت دی گئی ہے۔ جس طرح کائنات کی ہر تخلیق میں، مخفی اور پوشیدہ طاقتوں کا ایک سمندر موجزن ہے اور ان ساری طاقتوں کی اصل روشنی ہے۔

اللّٰہ نور السمٰوت والارض

عملیات اور تعویذ میں بھی یہی روشنی کام کرتی ہے چونکہ انسان اشرف المخلوقات ہے اس لئے روشنی پر اس کو تصرف کا اختیار دیا گیا ہے۔ تعویذ کے نقوش میں جو روشنیاں کام کرتی ہیں وہ ذہن انسانی کے تابع ہیں لیکن یہ بات بہت زیادہ غور طلب ہے کہ کسی بھی عمل کے صحیح نتائج اس وقت سامنے آتے ہیں جب ہماری صلاحیتیں، دلچسپی اور یکسوئی ایک جگہ مرکوز ہو۔ یکسوئی حاصل نہ ہونے کی وجہ سے روشنیاں بکھر جاتی ہیں۔ یہی حال تعویذ کے اوپر لکھے ہوئے نقوش اور ہندسوں کا بھی ہے۔ کوئی عامل جب تعویذ لکھتا ہے تو وہ اپنی صلاحیتوں کو رو بہ عمل لا کر اپنی ماورائی قوتوں کو حرکت میں لے آتا ہے۔

قرآن پاک میں ارشاد ہے ''پاک اور اعلیٰ ہے وہ ذات جس نے معین مقداروں کے تحت تخلیق کی۔''

تعویذ کے اوپر لکھے ہوئے نقوش اور ہندسے بھی اس قانون کے پابند ہیں۔

علم لدنی میں یہ پڑھایا جاتا ہے کہ یہاں ہر چیز مثلث (Triangle) اور دائرہ (Circle) کے تانے بانے میں بنی ہوئی ہے۔ فرق یہ ہے کہ کسی نوع کے اوپر دائرہ غالب ہے اور کسی نوع کے اوپر مثلث غالب ہے۔ مثلث کا غلبہ ٹائم اسپیس (Time Space) کی تخلیق کرتا ہے اور جس نوع پر دائرہ غالب ہوتا ہے وہ مخلوق لطیف اور ماورائی کہلاتی ہے جو ہمیں نظر نہیں آتی جیسے جنات اور فرشتے۔

انسان چونکہ اشرف المخلوقات اور اللہ تعالیٰ کی بہترین صناعی ہے اس لئے وہ چاہے تو خود کو مثلث کے دباؤ سے آزاد کر کے دائرہ میں قدم رکھ سکتا ہے جیسے ہی وہ دائرہ کے اندر قدم رکھ دیتا ہے اس کے اوپر جنات کی دنیا اور فرشتوں کا انکشاف ہو جاتا ہے۔

یہی دائرہ اور مثلث تعویذ میں ہندسے بن کر عمل کرتے ہیں جو نقطہ سے شروع ہو کر ۹ (نو) کے ہندسے پر ختم ہو جاتے ہیں اب ہم مثلث دائرہ اور نقطہ کی تشریح کرتے ہیں۔

نقطہ (۰):

ذہن میں ایک لفظ ہوتا ہے اس میں کوئی لمبائی چوڑائی نہیں ہوتی بلکہ وہ نقطہ کے تصور کی اصل ہے۔ جب کسی طاقت کو یا کسی عمل کو مضاعف کرنا ہو (مضاعف کرنے سے مراد یہ ہے کہ طاقت یا کسی عمل کی طاقت کو دوگنا، بیس گنا، دس ہزار گنا، ایک لاکھ گنا یا اس سے بھی زیادہ گنا کرنا ہو) تو ایسی صورت میں سیدھی طرف ایک نقطہ لکھتے ہیں۔

ایک کا ہندسہ (۱):

اگر یہ طاقت کسی چیز کو کمزور کرنے کے لئے استعمال کی جائے تو ایک لکیر اوپر سے نیچے کی طرف یعنی ایک کا ہندسہ (۱) استعمال کیا جاتا ہے۔

دو کا ہندسہ (۲):

اگر اس طاقت کو تعمیر اور تخریب دونوں کے لیئے استعمال کیا جائے یعنی صفر کو ختم کرنے کیلئے اور مفید کو تخلیق کرنے کے لیئے تو اس لکیر کے اوپری سرے میں نصف دائرہ بنایا جاتا ہے اس سے دو کا ہندسہ بن جاتا ہے۔

تین کا ہندسہ (۳):

اگر بہت ساری چیزیں غلط ہیں۔ ان کو مٹانا ہے اور صرف ایک کو مفید میں تخلیق کرنا ہے تو دو نصف دائرے، سیدھی لکیر یعنی ایک کے ساتھ شامل کر دیئے جائیں گے۔ اور یہ تین کا ہندسہ بن جائیگا۔

چار کا ہندسہ (۴):

اگر ایک غلط کو حذف کرنا ہے اور دوسری بہت سی مفید طاقتیں تخلیق کرنی ہوں تو الف مقصورہ اور نصف دائرہ کو ایک کے ہندسے میں ملائیں گے۔ یہ چار کا ہندسہ (۴) بن جائیگا۔

یانچ کا ہندسہ (۵):

اگر صرف مفرت رساں حالات پیش نظر ہیں اور صرف مشکلات ہی مشکلات درپیش ہیں۔ یعنی خارجی دنیا سے حوادث پے در پے جمع ہو رہے اور تسلسل کے ساتھ آ رہے ہیں تو آنے والے واقعات کو روکنے کیلئے دریائے ذہن کی طاقت استعمال کرنی پڑے گی۔ اس کا طریقہ یہ ہوگا۔

دو نصف دائروں کو اس طرح ملایا جائے جس میں مثلث نمایاں ہو یہ پانچ کا ہندسہ (۵) بن گیا۔

چھ کا ہندسہ (۶):

اگر ذہن کے اندر تعمیر کی صلاحیتیں معطل ہیں تو انکو حرکت میں لانے کے لیئے ایک (۱) کے ساتھ بائیں طرف اوپری حصہ پر نصف دائرہ کا اضافہ کر دیں گے۔ یہ چھ کا ہندسہ (۶) بن گیا۔

سات کا ہندسہ (۷):

مشکلات و ناساز گار حالات اگر طبیعت اختراع کر رہی ہے اور انسان کام کرتے کرتے صحیح کام کو خود ہی لگاؤ دیتا ہے یا کوئی ایسی حرکت کر بیٹھتا ہے کہ اس کے مفید نتائج نہ نکلیں تو اس کے لیئے دو خط استعمال ہوتے ہیں ایک سیدھا اور ایک آڑا۔ دونوں کو ملا دیا جائے تو سات کا ہندسہ بن جائیگا۔ اس سے ذہن کی تخریبی حرکات' اشتعال اور تباہی کے رجحانات مسدود ہو جاتے ہیں۔

آٹھ کا ہندسہ (۸)

تخریبی حرکات' اشتعال اور تباہی کا رجحان اور اس قبیل کی دوسری چیزیں اگر ماحول سے آ رہی ہیں اور طبیعت ان کا اثر قبول کرنے پر اس لیئے مجبور ہے کہ وہ ماحول کی پابند ہے اس قسم کے آنیوالے بیرونی حملوں کو روکنے کے لیئے دو آڑے خط استعمال ہوتے ہیں۔ ان سے آٹھ کا ہندسہ (۸) وجود میں آتا ہے۔

مثلث (∆):

گھر میں یا وراثتاً تخریبی آثار ملیں ان کو ختم کرنے کے لئے تین آڑے، خط تعویذ پر لکھے جاتے ہیں۔ جو مثلث ∆ شکل اختیار کر لیں گے۔

∆

اسلاف میں ورثہ میں ملی ہوئی بیماریاں۔ بری عادتیں ختم کر کے تعمیر مقصود ہو تو اس مثلث میں ایک نقطہ ∆ لگا دیا جاتا ہے اور ان تخریبی ورثوں کے علاوہ آسمانی بلائیں آسیب' گیس' ہوا کے زہریلے جراثیم' مونو گیس' وبائی لہریں وغیرہ وغیرہ کی روک تھام ہو جاتی ہے۔

∆

خون میں سقم واقع ہو جائے۔ کینسر لاحق ہو جائے تو ایک سیدھی لکیر ایک (۱) کے اوپری سرے کو کو کاٹتے ہوئے نصف تک مثلث ∆ بنا دیا جاتا ہے۔ یہ کینسر اور کینسر کی قبیل کے دوسرے امراض کا شافی علاج ہے۔

نو کا ہندسہ (۹):

اب رہ گیا نو کا ہندسہ ۹ کا ہندسہ چھپی ہوئی چیزیں اور وسائل معلوم کرنے کے لیئے یعنی روپیہ پیسہ' ضروریات کی چیزیں' کھانے پینے کی چیزیں حاصل کرنے کے لیئے کئی طریقوں سے لکھا جاتا ہے۔ کاغذ کے اوپر' دھات کی پتریوں کے اوپر' جھلی کے اوپر' بھوج پتر کے اوپر' کھال کے اوپر ہڈی کے اوپر۔ یکساں سطح کے اوپر گولائی کے اوپر' ناخن کے اوپر سونے چاندی اور انگوٹھی میں نگینہ کے اوپر۔

جو مسائل سمجھ میں نہ آئیں ان کو حل کرنے کے لیے بھی ۹ کا ہندسہ استعمال ہوتا ہے۔ جو امراض بہت پیچیدہ ہوں انکو دفع کرنے کیلئے بھی یہی ۹ کا ہندسہ لکھا جاتا ہے' خاص طور پر پاگل پن' مرگی' مالیخولیا' مایوسی' احساس کمتری' کند ذہنی کو دور کرنے اور حافظہ بحال کرنے میں ۹ کا ہندسہ عجیب وغریب صفات کا حامل ہے۔ ۹ کا ہندسہ غلط تحریکات کو رفع کرتا ہے اور ذہن کے اندر مفید تحریکات کو جنم دیتا ہے۔

''عالم اعراف اور عالم برزخ میں فرق''

سوال: عالم اعراف اور عالم برزخ میں کیا فرق ہے؟

جواب: عالمین کے تین رخ ہیں۔ ایک رخ نورانی عالم ہے۔ دوسرا رخ روشنی کا عالم ہے۔ تیسرا رخ تخلیط یا عالم ناسوت کا عالم ہے۔ کائناتی فارمولوں کو سمجھنے کے لئے یہ بات ذہن نشین ہونا ضروری ہے کہ جب کائنات میں خدوخال ظاہر ہوتے ہیں تو زمان پردے میں چلا جاتا ہے اور جب کائنات کے اندر موجودات کی تصویریں خدوخال سے ماوراء ہو جاتی ہیں تو مکان، زمان میں پیوست ہو جاتا ہے۔ کائنات زمانیت میں ظاہر ہوتی ہے تو اسے نزولی حرکت کہا جاتا ہے۔ جب مکانیت پس منظر میں چلی جاتی ہے تو اسے عودی حرکت کہا جاتا ہے۔ نزول وصعود کا پورا سلسلہ لوح محفوظ پر نقش ہے۔ لوح محفوظ اور عالم ناسوت کے درمیان جو پردہ (Screen) واقع ہے اس کو برزخ کیا جاتا ہے۔ لوح محفوظ سے چلنے والی تصویریں جب عالم ناسوت میں خدوخال کے ساتھ مظہر بنتی ہیں اور مظہر بن کر لوح محفوظ کی طرف صعود کرتی ہیں تب لوح محفوظ اور عالم ناسوت کے درمیان ایک پردہ (Screen) آتا ہے جسے عالم اعراف کے نام سے جانا جاتا ہے۔

ہم اس بات کو اس طرح سمجھ سکتے ہیں کہ خالق کائنات کے ذہن میں یہ بات آئی کہ اپنے تعارف کے لئے ایسی تخلیق عمل میں لائے جس تخلیق میں حافظہ ہو، فکر ہو، بصیرت ہو اور علوم سیکھنے کی تمام تر صلاحیتیں موجود ہوں۔ تاکہ مخلوق اپنے خالق کو پہچان سکے۔

تمثیلاً ہم اس بات کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

اللہ ایک ذات ہے۔ اس کے ذہن میں خیال آیا کہ ایسی کائنات بنانی چاہئے جو مکمل ہو اور کائنات کے افراد میں ایسے منتخب افراد ہوں جو مجھے پہچان سکیں اور ان افراد کا میرے ساتھ تعلق قائم ہو۔ جب اللہ نے ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ کے ذہن میں جو کچھ جس طرح موجود تھا عمل میں آ گیا۔ پروگرام کا پہلا مرحلہ عالم ارواح عمل میں آیا۔ عالم ارواح کے بعد دوسرا عالم ''لوح

محفوظ'' وجود میں آیا۔ لوح محفوظ پر کائنات کی ہر حرکت، کائنات کا ہر ہر لمحہ اور کائنات کے اندر جتنی نوعیں ہیں۔ اس نوع کے ہر ہر فرد کی اجتماعی فلم بن گئی۔ پھر اس پروگرام کو حرکت کے ساتھ مظاہراتی شکل وصورت دے دی گئی۔ جس عالم میں کائنات نے نوعی اعتبار سے مظاہراتی خدوخال اختیار کئے یعنی فلم کا یکجائی پروگرام نوعی اعتبار سے الگ الگ ہوا اس عالم کو عالم مثال یا برزخ کہتے ہیں۔ عالم مثال کی فلم جب انفرادی صورت میں ظاہر ہوئی اور جہاں نوعی پروگرام انفرادی صورت میں نشر ہو رہا ہے یہ عالم ''عالم ناسوت'' ہے۔ عالم ناسوت نزولی حرکت کی انتہا ہے یہاں سے نزولی حرکت صعودی حرکت میں بدل جاتی ہے جسے عالم اعراف کہتے ہیں۔



''جنات کی حقیقت''

سوال: بھوت پریت' آسیب اور ڈائن وغیرہ کے الفاظ عام طور سے بولے جاتے ہیں' لیکن اس کی تحقیق کی طرف کسی نے دھیان نہیں دیا یہ سب بالآخر ہیں کیا؟

جواب: آپ نے قبرستان میں دیکھا ہوگا کہ جب قبر تختوں سے بند کردی جاتی ہے تو میت کے ساتھ جانے والے سوگوار ہاتھوں میں مٹی لے کر قبر کے اندر ڈالتے ہیں' مذہب کا کوئی عمل لایعنی اور زائد نہیں ہوسکتا' مٹی ڈالتے وقت جو آیت تلاوت کی جاتی ہے' وہ بھی اپنے مفہوم کے اعتبار سے انتہائی توجہ طلب ہے۔

انسان تین پرت کا مجموعہ ہے' ہر پرت متعین صفات رکھتا ہے' ہم ان پرتوں میں سے ایک پرت کو ہمزاد' ہیولیٰ' ہیلر جسم مثالی اور نسمہ کہتے ہیں' جس وقت گوشت پوست کے آدمی کو قبر کے اندر اتارا جاتا ہے اس وقت نسمہ بھی اس کے ساتھ چپکا ہوتا ہے اور چونکہ وہ باشعور' باصلاحیت اور بااختیار ہوتا ہے' اس وجہ سے فرشتے ایک خاص انتظام کے تحت اس بات کی نگرانی کرتے ہیں کہ یہ نسمہ راہ فرار نہ اختیار کرلے' بعض انسان (نسمہ) اتنے چالاک ہوتے ہیں کہ وہ فرشتوں کو چکمہ دے کر اعراف کی حد بندی سے آزاد ہوجاتے ہیں اس عمل سے ان کی کوئی جائے قیام متعین نہیں ہو پاتی' اور وہ آوارہ اور در بدر کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں' طبیعت میں شرارت کی وجہ سے لوگوں کو پریشان اور ہراساں کر کے خوش ہوتے ہیں' ان کو ہمیشہ ایسے لوگوں کی تلاش رہتی ہے جو دماغی اعتبار سے کمزور ہوتے ہیں' جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ اس آدمی کے نسمہ میں قوت مدافعت نہ ہونے کے برابر ہے تو یہ ان کو اپنا معمول بنا لیتے ہیں' دماغی عارضہ' مالیخولیا وغیرہ بھی نسمہ میں قوت مدافعت نہ ہونے کی وجہ سے ہوتے ہیں' لیکن ان بیماریوں کا سایہ آسیب سے کوئی تعلق نہیں۔

عرض یہ کرنا ہے نوع انسانی نے نادیدہ مخلوق جنات کو بدنام کرنے کے لیے یہ ڈھونگ رچایا ہے کہ انسان کے اوپر جن سوار ہوجاتا ہے' انسان کے اوپر جن نہیں بلکہ خود انسان (بھٹکا

ہوا نسمہ) سوار ہوتا ہے۔ نوع اجنہ کے حق میں انسان کی یہ بہت بڑی زیادتی اور ظلم ہے کہ بغیر تحقیق و تدقیق کے پوری نوع کے اوپر بہتان تراشی کیا جائے' میں نوع' جنہ سے واقفیت کی بنا پر بات یقین کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ جنات ہم انسانوں سے زیادہ سنجیدہ' رحم دل' ہمدرد' ایثار پیشہ اور غم خوار ہوتے ہیں' جنات کے بارے میں اس قسم کی جتنی کہانیاں مشہور ہیں ان سب کے راوی' ایسے انسان ہیں جو احساس کمتری میں مبتلا ہیں' ہوتا یہ ہے کہ جب ہم کسی مسئلہ کو حل نہیں کرسکتے تو اس کے لیے قیاس کو استعمال کر کے غلط فیصلہ صادر کردیتے ہیں۔

موت کیا ہے:

عرف عام میں جسے ہم مرنا یا مردہ ہونا کہتے ہیں اس کے بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ انسان مرنے کے بعد اپنی صلاحیتوں کو کھو بیٹھتا ہے' حالانکہ ایسا نہیں ہے' واقعہ یہ ہے کہ:۔

بیداری مرنے کے بعد ہوتی ہیں' موت بظاہر بھیانک لیکن باطن اس قدر خوشنما اور حسین شے ہے کہ جس کے اوپر ہزار جانیں قربان کی جاسکتی ہیں' انسانی زندگی میں موت ہی ایسا عمل ہے جس کو حاصل زندگی قرار دیا جاسکتا ہے مرنے کے بعد انسان زماں اور مکاں کی قید و بند سے آزاد ہوکر تصور اور خیال کی رفتار سے سفر کرتا ہے' اس کو نہ ہوائی جہاز کی ضرورت پیش آتی ہے اور نہ خلائی جہاز (Space Ship) کی۔ اس کی وجہ خفیہ صلاحیتیں جو بیداری میں اس کے لیے لاینحل تھیں سب کی سب بیدار ہوجاتی ہیں۔

اگر کسی انسان میں صلاحیت موجود ہے کہ وہ ایک ٹن وزن اٹھا سکتا ہے تو وہ اس عالم آب و گل میں مہینوں اور برسوں ریاضت اور مشقت کر کے اس پر دسترس حاصل کرتا ہے اور اس کے لیے بھی ہرگز یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ مستقل ہے اگر کوئی انسان قوت ارادی کی مشقوں پر عبور حاصل کرلینے کے بعد کسی آدمی کو متاثر کرسکتا ہے تو اس کے لیے کم و بیش تیس سال کا کورس ہے۔ لیکن یہ پھر بھی ضروری نہیں ہے کہ وہ ہر آدمی کو متاثر ہی کرسکے اگر کوئی عامل عمل و شغل کے نتیجہ میں کسی فرد کو اپنا معمول بنالیتا ہے تو اس بات کی کوئی ضمانت نہیں دی جاسکتی کہ اس کی نوع کا ہر ذی نفس اس کا معمول بن جائے گا' برخلاف اس کے مردہ جسم (گوشت

پوست کا جسم نہیں) میں یہ صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے کہ وہ بغیر کسی مشق اور عمل و شغل کے کسی بھی شخص یا حیوان کو متاثر کرسکتا ہے۔

ارشاد ربانی ہے۔ **یُخرِجُ الحیَّ مِنَ المیّتِ وَ یُخرِجُ المَیتَ مِنَ الحَیّ۔**
یعنی ہم زندگی موت سے نکالتے ہیں اور موت زندگی سے نکالتے ہیں۔

آیت مقدسہ ہمیں تفکر کی دعوت دیتی ہے مفہوم بالکل صاف ہے موت اور زندگی کوئی الگ الگ شئے نہیں ہیں' موت اور زندگی نام ہے انسانی صلاحیتوں اور اوصاف کا' ایک وصف زندگی ہے اور دوسرا وصف موت' اس زندگی سے پہلے ہم جہاں بھی تھے اس کو موت کے علاوہ کچھ نہیں کہا جاسکتا' اور اس زندگی کو گذار کر دوسری زندگی کو اپنانے کا نام بھی موت ہے' انسانی زندگی کا وصف جس کا نام موت ہے سب کا سب غیب ہے' یہ وصف انسانوں کو زمانی اور مکانی قید سے آزاد ایسی کیفیات سے روشناس کراتا ہے جہاں انسان کا ارادہ حکم کی حیثیت رکھتا ہے' انسان کی خواہش اگر یہ ہے کہ وہ سیب کھائے تو اس کے لیے صرف سیب کھانے کا ارادہ کر لینا ہی سیب کی موجودگی کا سبب بن جاتا ہے۔ موت کی دنیا میں مظاہر وسائل کے پابند نہیں ہوتے عالم قید و بند (دنیا) میں کوئی انسان اس وقت تک سیب نہیں کھا سکتا تاوقتیکہ سیب کو وجود میں لانے والے پورے وسائل بروئے کار نہ آجائیں' یہاں تخم ریزی سے پھل بننے تک کے پورے مراحل سے گذرنا ضروری ہے۔

ان طویل اور تکلیف دہ مراحل کا انتظار (اگر محسوس کیا جائے) کتنا صبر آزما اور کس قدر شدید ہے' سیب کے حصول کے لیے ہمیں اتنا وقت گذارنا لازمی ہے جو سیب کی موجودگی کے لیے متعین ہے اگر ہم کسی طرح سے مرنے کے بعد کی زندگی کا سراغ لگالیں تو ہم اس زندگی میں بھی صبر آزما اور ہمت شکن انتظار سے نجات پاسکتے ہیں' حضور سرور کائنات رسول اللہ ﷺ نے ایسی زندگی کے اپنانے کے لیے فرمایا ہے۔ **موتو قبل انت موتو**۔ مرجاؤ مرنے سے پہلے یعنی اسی زندگی میں موت کے بعد والی زندگی حاصل کرکے اپنے اوپر سے قید و بند کی تہہ در تہہ اور دبیز چادر کو اتار پھینکو۔

حضور سرور کونین علیہ صلوٰۃ والسلام کے اس حکم پر عمل کرنے والے ہر زمانے میں موجود رہتے ہیں' یہی وہ لوگ ہیں جن کے دماغ' پس پردہ عمل میں آنے والے مناظر کو براہ راست دیکھتے اور سمجھتے ہیں۔ ان کا ذہن خیال اور تصور کے اندر بھی قدرت کے اشارے تلاش کر لیتا ہے ایسے حضرات کے اندر غیر معمولی صلاحیتیں کام کرتی ہیں' اتنی غیر معمولی کہ جو چیزیں سامنے نہیں ہوتیں وہ ان کو بھی سامنے لے آتی ہیں' مرنے سے پہلے مرجانے والے یعنی اس دنیا میں موت کی زندگی سے روشناس اور متعارف لوگ اتنی زبردست صلاحیت اور قوت کے مالک ہو جاتے ہیں کہ کائنات میں ہر شے ان کے ذہن کے ساتھ حرکت کرتی ہے' فی الواقع یہ صلاحیتیں حیرت انگیز نہیں ہیں البتہ ان کا تلاش کرنا بڑا اور بہت بڑا کارنامہ ہے۔

بات جنات سے شروع ہوئی تھی' جنات آسیب اور بھوت پریت کا عقدہ اس لیے اچنبھہ ہے کہ ہم نے اس زندگی سے راہ فرار اختیار کررکھا ہے جو اس قسم کے تمام معمول کو حل کرتی ہے' یہ زندگی (ہماری زندگی کا نصف حصہ) خواب ہے' جس کو ہم خواب دیکھنا کہتے ہیں' وہ ہمارے اوپر روح کی صلاحیتوں کا انکشاف کرتا ہے' سونے کی حالت میں تمام اعضاء معطل ہونے کے باوجود انسان چلتا بھی ہے' کھاتا' پیتا' غم زدہ اور خوش بھی ہوتا ہے' باتیں بھی کرتا ہے اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی کام کرتی ہے۔

بیداری کا کوئی کام ایسا نہیں جو انسان خواب میں نہ کرتا ہو' یہ بات کہ خواب خیال چیز اور خیالی حرکات ہیں بالکل لایعنی ہے' ہر انسان زندگی میں ایک دو ایسے خواب ضرور دیکھتا ہے جن کا اثر بیداری کے بعد بھی اس پر مسلط رہتا ہے جاگ اُٹھنے کے بعد نہانے اور غسل کرنے کی ضرورت پڑتی ہے یا کوئی دہشت ناک خواب دیکھ کر اس کے دل و دماغ پر خوف اور ڈر کے پورے اثرات مرتب ہوجاتے ہیں' ہم خواب اور بیداری کے اعمال میں کوئی حد فاصل قائم نہیں کرسکتے' فرق صرف یہ ہے کہ خواب اور بیداری کی حرکات میں ہم ترتیب اس لیے قائم نہیں رکھ سکتے کہ خواب میں کیے ہوئے اعمال کو یا تو ہم بھول جاتے ہیں یا نظر انداز کردیتے ہیں۔

جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ ہم جو کچھ بیداری میں کرتے ہیں من وعن وہی سب خواب

میں بھی کرتے ہیں، تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ خواب ہماری زندگی کا نصف حصہ ہے۔ بیداری میں ہم روح کی صلاحیتوں کو پابند سلاسل بنا کر ان صلاحیتوں سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔

خواب میں روح کی صلاحیتیں زمان اور مکان کی قیود سے آزاد ہونے کی وجہ سے ہمیں یہ اطلاع فراہم کرتی ہیں کہ ہم ہر وہ عمل کر سکتے ہیں، جو بیداری کے حواس میں نہیں کر سکتے مرنے کے بعد انسان خواب کے حواس میں زندگی گزارتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس سے ایسی غیر معمولی حرکات سرزد ہوتی ہیں۔ جس کو ہم ناسمجھی کی بنا پر آسیب، سایہ اور جن وغیرہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

☆☆☆

''اہرام مصر کیا ہیں''

سوال: اہرام مصر کب اور کیوں تعمیر ہوئے؟ وہ کون سی ٹیکنالوجی تھی جس کے ذریعے لاکھوں پتھروں کو پانچ سو میل دور سے لا کر تراشا گیا۔ انہیں تیس چالیس فٹ کی بلندی پر نصب کیا گیا۔

جواب: خیالات کی لہروں کے علم سے واقف سائنسدان ''رمپا'' (Rampa) نے آثار قدیمہ کے ماہرین کے اصرار پر یہ انکشاف کیا ہے کہ بیس ہزار سال پہلے کے وہ لوگ جنہوں نے اہرام مصر بنائے ہیں آج کے سائنسدانوں سے زیادہ ترقی یافتہ تھے اور وہ ایسی ایجادات میں کامیاب ہو گئے تھے جن کے ذریعے پتھروں سے کشش ثقل ختم کر دی جاتی تھی۔ کشش ثقل ختم ہو جانے کے بعد پچاس ٹن وزنی چٹان ایک آدمی اس طرح اٹھا سکتا تھا جیسے پروں سے بھرا ہوا ایک تکیہ۔

اس طرح اوکلٹ (Occult) سائنس کی دنیا میں ایک شخصیت ایڈگر کیسی کے مطابق ان پتھروں کو ہوا میں تیرا کر (Float) موجودہ جگہ پر بھیجا گیا ہے۔

اہرام مصر کے سلسلے میں ان دانشور بزرگوں نے جو کچھ فرمایا ہے وہ لہروں کی منتقلی کے اس قانون کے مطابق ہے، جس کو ٹیلی پیتھی کہا جاتا ہے۔

☆☆☆

باب پنجم

"اللہ کی جان"

برس ہا برس سے میرے ساتھ یہ ہو رہا ہے کہ جب لوگ تقریریں سنتے سنتے تھک جاتے ہیں تو میری باری آتی ہے۔ اپنے بڑوں سے سنا ہے کہ اگر کوئی کام خالی الذہن ہو کر کیا جائے تو اس کے نتائج اچھے مرتب ہوتے ہیں۔ تجربہ بھی یہی ہے کہ آدمی دن بھر کام کر کے تھک جاتا ہے تو اعصاب جواب دے جاتے ہیں۔ دماغ ماؤف ہونے لگتا ہے اور آدمی سو جاتا ہے۔ صبح کو جب اٹھتا ہے تو تازہ دم ہوتا ہے۔ اعصاب شکنی نہیں ہوتی اور وہ تیار ہو کر نئے کام شروع کر دیتا ہے۔ پھر تھک کر سو جاتا ہے اور صبح کو پھر تازہ دم ہو کر کاموں میں مشغول ہو جاتا ہے۔

لیکن میرے ساتھ عجیب صورتحال ہے۔ مجھے صدر بنا دیا جاتا ہے۔ صدر کی یہ مجبوری ہے کہ بات اس کی سمجھ میں آئے نہ آئے لیکن جب تک پروگرام کے تمام مقررین اس کو اپنی تقریر نہیں سنا دیتے وہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتا۔ اور وہ اس بات کا بھی منتظر رہتا ہے کہ جب سب لوگ اپنی باتیں سنا دیں گے تو میری باری آئے گی۔ مشاعرے کی حد تک تو یہ بات ٹھیک ہے کہ ایک شاعر اس انتظار میں بیٹھا رہتا ہے کہ میں کسی کا شعر سنوں گا تو کوئی میرا شعر سنے گا۔ لیکن تقریر کا مسئلہ عجیب ہے کہ محترم صدر تقاریر سنتے سنتے یہ بھول جاتے ہیں کہ مجھے کیا کہنا ہے۔ پھر بھی انہیں نئے نئے موضوعات مثلاً سائنس، ادب، کواکب، شمس و قمر، زمین و آسمان، ہجر و فراق، عشق و مستی، جسم و روح اور فلسفہ حیات و ممات سننا پڑتا ہے۔ سامعین کی سمجھ میں کوئی بات نہ آئے تو اونگھ لیتے ہیں۔ مگر صدر اونگھ بھی نہیں لے سکتا کہ یہ آداب محفل اور صدر کے وقار کے خلاف ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ پوری تقریر لطیفہ ہوتی ہے۔ مگر کیا مجال ہے کہ صدر تیوری پر بل ڈالے یا ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جائے......

کیوں......؟

اس لئے کہ وہ ذی احترام صدر ہے۔

بہرحال جو بھی رسم و رواج ہو میں آپ خواتین و حضرات کے سامنے ہوں۔ سوچ رہا ہوں کہ شروع کہاں سے کروں۔ سب کچھ ہمارے مقررین کہہ چکے ہیں۔ اگر میں آپ کے سامنے معزز خواتین و حضرات کی تقاریر کے اقتباس پیش کروں تو یقیناً وہ ناراض ہو جائیں گے کہ اتنے انتظار کے بعد آموختہ سنا دیا۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ انتظار موت سے زیادہ شدید ہوتا ہے۔

"روحانیت میں خواتین کا مقام" کے موضوع پر ماشاء اللہ بڑی اچھی اچھی تقریریں ہوئیں۔ میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مقررین نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اللہ میاں مردوں سے زیادہ عورتوں کو پسند کرتے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دو۲ بیویاں تھیں۔ سب جانتے ہیں کہ ان کی ایک زوجہ محترمہ مکہ میں تھیں اور ایک فلسطین میں تھیں۔ وہ بیچارے چھ مہینے سفر میں رہتے۔ چھ مہینے دونوں بیویوں کے پاس رہتے تھے۔ سال بھر اسی طرح گزر جاتا تھا اور ان کی بڑی بیگم صاحبہ شرائط عائد کرتی تھیں کہ حضرت ہاجرہ کے پاس جا تو رہے ہو لیکن اونٹ سے نہیں اترنا۔ حضرت ابراہیمؑ وعدہ کر لیتے تھے۔ پہنچتے تو اونٹ پر بیٹھے بیٹھے باتیں کرتے تھے۔ اونٹ پر بیٹھے بیٹھے حضرت ہاجرہ ان کے ہاتھ پیر دھلاتی تھیں۔ اونٹ پر بیٹھے بیٹھے وہ کھانے کو دیتی تھیں۔ اس صورت حال سے جب بہت زیادہ پریشان ہوئے اور کوئی ایسا طریقہ سمجھ میں نہ آیا کہ اس سے آزادی حاصل ہو جائے۔ انہوں نے سوچا کہ اس مسئلے کا حل اللہ تعالیٰ سے معلوم کرنا چاہیئے۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ یا اللہ دو۲ بیویوں میں جو میرا حال ہے وہ آپ کے سامنے ہے کوئی ایسا بندوبست کر دیجئے کہ مجھے بھی سکون مل جائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"اے ابراہیمؑ تم مرد ہو کر عورتوں کی شکایت کرتے ہو۔"

دوسری بات یہ ہے کہ ہمیشہ سے یہی سنتے آئے ہیں کہ اللہ میاں مخلوق سے ستر۰۷ ماؤں سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔ اللہ معاف کرے کبھی کبھی مجھے یہ خیال بھی آتا ہے کہ کبھی اللہ میاں یہ بھی کہہ دیتے کہ میں دو۲ باپ سے زیادہ محبت کرتا ہوں۔

حضور پاک ﷺ کی خدمت میں ایک صحابی حاضر ہوئے۔ انہوں نے پوچھا کہ سب سے اچھا عمل بتائیے جو اللہ کو پسند ہو۔ اور آپ کو بھی پسند ہو۔ حضور پاک ﷺ نے فرمایا' ماں کی خدمت۔ انہوں نے کہا اگر ماں نہ ہو تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ خالہ کی خدمت۔ ان صحابی نے پھر فرمایا کہ اگر خالہ بھی نہ ہو۔ تب حضور پاک ﷺ نے فرمایا باپ کی خدمت۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ باپ کا مقام خالہ کے بعد آتا ہے۔ جتنا بھی آپ غور کریں ایک ہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ ماں ہی سب کچھ ہے۔ آپ نے یہ نہیں سنا ہوگا کہ باپ کے قدموں میں جنت ہے۔ ہر مرد و عورت نے ہمیشہ یہی سنا ہے کہ ماں کے قدموں میں جنت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ایک نظام اور سسٹم بنایا ہے اور یہ سسٹم عورت کے اردگرد گھومتا ہے۔ عورت اللہ کی ایسی تخلیق ہے جو خود تخلیق کرتی ہے۔ جس طرح ایک عورت اپنے بچے کو نو ماہ پیٹ میں رکھتی ہے اور ۹ ماہ پیٹ میں رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ ہر ماں بچے کو نو مہینے اپنا خون پلاتی ہے۔ کیونکہ ماں کے پیٹ میں کوئی دوسری غذا خون کے علاوہ اسے نہیں ملتی۔ پیدائش کے وقت جن مراحل سے عورت گزرتی ہے۔ مرد اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ سوا دو۲ سال تک دودھ پلانا یہ بھی ماں کا خون دودھ کی شکل میں بچے کے لئے غذا بنتی ہے۔ یعنی ۹ مہینے تک ماں اپنے بچے کے اندر براہ راست خون انڈیلتی رہتی ہے اور پیدائش کے بعد سوا دو سال تک دودھ کی شکل میں اپنا خون پلاتی رہتی ہے۔ ہم جب غور کرتے ہیں تو بچہ ماں کے علاوہ کچھ نہیں نظر آتا۔ بچہ دراصل ماں کا ایک حصہ ہے۔ جو قطرہ قطرہ خون جمع ہو کر شکل و صورت بنتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ'

''وہ ماں جو خود گیلے میں سوتی ہے تمہیں سوکھے میں سلاتی ہے۔''

میری ماں جی کہتی تھیں کہ حضرت موسیٰ ایک دن کوہ طور پر تشریف لے گئے تو اللہ نے کہا کہ'

''اے موسیٰ! اب سنبھل کے آنا۔''

موسیٰ علیہ السلام کو بڑا تعجب ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ایسا کیوں کہا شاید کوئی گستاخی یا بے ادبی ہوگئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا'

''تمہاری والدہ کا انتقال ہوگیا ہے۔ جب تم ہمارے پاس کوہ طور پر آتے تھے تمہاری ماں سجدے میں گر جاتی تھیں اور جب تک تم واپس نہیں چلے جاتے وہ ہم سے تمہارے لئے عافیت مانگتی رہتی تھیں اور کہتی تھیں کہ یا اللہ میرے بچے سے اگر غلطی ہو جائے تو گستاخی اور بے ادبی کو معاف کردیں۔ اس کے اوپر اپنی عافیت اور رحمت رکھیں۔

ماں ایک ایسی ہستی ہے جو بچے کا گہوارہ ہے۔ ہمیشہ یہی کہا جاتا ہے کہ بچہ مادری زبان بولتا ہے۔ آپ نے کبھی سنا ہے کہ بچہ پدری زبان بولتا ہے؟ ماں کی جو طرز فکر ہوتی ہے وہی بچے کی طرز فکر بن جاتی ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا جس گھر میں لڑائی فساد زیادہ ہوتا ہے اس گھر کے بچے بھی جھگڑالو اور فسادی ہوتے ہیں۔ جس گھر میں ماں چیخ کر بولتی ہے اس گھر کے بچے بھی چیخ کر بولتے ہیں۔ جس گھر میں ماں کے لہجے میں حلاوت ہے نرمی ہے' ٹھنڈک ہے' بردباری ہے' محبت اور شفقت ہے اس گھر کے بچوں میں ادب و احترام ہوگا۔ الفت ہوگی۔ زمین پر اللہ کا سارا نظام ماں کے دم سے ہے۔ میں آپ کے سامنے بیٹھا ہوں۔ ماں نہ ہوتی تو میرا وجود ہی نہ ہوتا۔ ماں کا کردار دراصل یہ اللہ تعالیٰ کی ان صفات کا مظہر ہے جن صفات سے اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت کو تخلیق کیا ہے۔ مرد کی اپنی جگہ اہمیت ہے۔ مثلاً اگر آدم علیہ السلام کے اندر سے حوا پیدا نہ ہوتی تو حوا کا وجود نہ ہوتا۔ آدم کے اندر سے حوا پیدا ہوئی۔ دنیا میں حوا کے اندر سے آدم پیدا ہوا۔ آدم ہو یا حوا۔ دونوں تخلیق کے ایسے راز و نیاز ہیں کہ جن کے بارے میں یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ جب تک آدم و حوا کے دو۲ رخ موجود نہیں ہوں گے تخلیقی نظام نہیں چلے گا۔

چرندوں میں نر و مادہ ہوتے ہیں' پرندوں میں نر و مادہ ہوتے ہیں' درختوں میں بھی نر و مادہ ہوتے ہیں' تخلیق کا فارمولا یہ ہے کہ جب تک دو۲ رخ موجود نہ ہوں اور دونوں رخ ایک دوسرے کے اندر جذب ہو کر رد و بدل نہ ہوں اور ان میں سے کوئی ایک رخ غالب اور مغلوب نہ ہو تخلیقی نظام اور نسل کش کا سلسلہ قائم نہیں ہوگا۔ خالی مرد ہی مرد ہوں تو تولید کا سلسلہ ختم ہو جائے گا۔ دنیا میں اگر مرد ختم ہو جائیں خواتین ہی خواتین ہوں تب بھی تخلیق کا

سلسلہ ختم ہو جائے گا۔ یہ بالکل ایسی بات ہے کہ اگر گاڑی کے دو۲ پہیے نہ ہوں گاڑی نہیں چلتی۔

اللہ تعالیٰ نے آدم کو تخلیق کیا۔ اللہ نے آدم کو بجنی مٹی سے بنایا یعنی پتلا بنایا اور اس پتلے میں اپنی روح پھونک دی۔ روح سے مراد اللہ تعالیٰ کا امر ہے۔ جب ہم اس آیت پر غور وفکر کرتے ہیں کہ پتلے کے اندر اللہ کی روح ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہاں پر جو کچھ بھی ہے چاہے وہ مرد ہو یا عورت۔ دراصل وہ اللہ کی جان ہے۔ جان کا حصہ ہے۔ یہ ہرگز نہ سمجھیے کہ میں نعوذ باللہ شرک کر رہا ہوں۔ میں اللہ کی بات دہرا رہا ہوں۔ قرآن میں ہے۔

''اور ہم نے اپنی روح میں سے روح ڈال دی۔''

مثال سے سمجھیے! سمندر کا ایک قطرہ سمندر کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ سمندر کا قطرہ سمندر بن گیا۔ اسی طرح جب اللہ کی روح یعنی اللہ کی جان جسم میں ڈالنے کا تذکرہ ہوگا تو یہ مفہوم نہیں نکلے گا کہ انسان نعوذ باللہ خدا بن گیا۔ یا اس کے اندر وہ تمام صفات پیدا ہو گئیں جو اللہ کی ذاتی صفات ہیں۔ انسان کے اندر وہی صفات منتقل ہوئی ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر منتقل کر دیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ۔

''میں نے انسان کو اپنی صورت پر بنایا ہے۔''

اس کا مطلب بھی یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کی طرح ہیں۔ انسانوں کی طرح ان کی آنکھیں ہیں۔ کان ہیں۔ اگر صورت سے مراد انسانی صورت لے لی جائے تو یہ بھی سوچنا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ سوتے ہیں جاگتے ہیں۔ کھانا کھاتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ جبکہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے اسے نیند نہیں پکڑتی اور نہ اسے اونگھ آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اللہ کو کوئی احتیاج نہیں ہے۔ اللہ ہر چیز سے بے نیاز و بے احتیاج ہے۔ صورت پر تخلیق کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ نے اپنی لامحدود صفات میں سے تقریباً ساڑھے گیارہ ہزار صفات انسان کے اندر منتقل کر دی ہیں اور ہر صلاحیت سمندر کی طرح محدود تو ہے لیکن لامحدود بھی ہے۔ لامحدود کو کتنا بھی محدود کر دیا جائے۔ اس کی اصل لامحدود رہتی ہے مرد اور عورت کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی جان

یعنی روح ہے۔ جب تک روح انسان کے اندر رہتی ہے۔ جسم میں حرکت رہتی ہے۔ اور جیسے ہی روح اس مادی جسم کو چھوڑ دیتی ہے۔ یہ جسم بے جان ہو جاتا ہے۔ عورت اور مرد دراصل ایک کھلونا ہے جو چابی سے چلتا ہے جب تک کھلونے کے اندر چابی رہتی ہے کھلونا چلتا رہتا ہے اور چابی ختم ہو جاتی ہے کھلونا نہیں چلتا۔ ایک مردہ جسم کی حیثیت ایسے کھلونے کی ہے جس میں روح نہ ہو۔ انسان کی مشینری اور مشینری کے کل پرزے دماغ، دل، گردے اور پھیپھڑے اس وقت تک قابل ذکر ہیں جب تک ان کے اندر روح ہے۔

آج صبح میں سوچ رہا تھا کہ مجھے تو یاد بھی نہیں کہ میں کتنی تقریریں کر چکا ہوں۔ عوام کا حافظہ کمزور ہوتا ہے جو سنتے ہیں وہ بہت کم یاد رہتا ہے لیکن جو تقریر کرتا ہے اسے یاد رہتا ہے۔ میں نے اپنے پیارے اللہ سے عرض کیا۔ اللہ میاں یہ لوگ آپ کے نام پر یہاں جمع ہوئے ہیں۔ آپ کے حبیب محمد الرسول اللہ ﷺ کا پیغام سننے کے لئے یہاں آئے ہیں۔ میرے اللہ میرا سینہ کھول دے۔ میرے اندر ایسی روشنی اتار دے کہ میں تیرے بندوں کے سامنے کچھ عرض کر سکوں۔ میرے ذہن میں قرآن پاک کا یہ ترجمہ آیا۔ دماغ میں اک جھماکا ہوا اور آواز ایکو Echo ہوئی۔

''اللہ وہ ہے جو آسمان سے پانی نازل کرتا ہے اور پانی میں رزق نکالتا ہے۔''

ہم جانتے ہیں کہ پانی برستا ہے تو کھیتی باڑی ہوتی ہے۔ لیکن جہاں پانی نہیں برستا وہاں بھی درخت اُگتے ہیں۔ سندھ کے علاقے تھر میں جہاں بارش شاذ و نادر ہی برستی ہے۔ وہاں کیکر ہے۔ تھور ہے۔ کیکٹس ہے۔ پانی کے بغیر بھی یہ چیزیں زمین پر ہیں۔ آسمان سے پانی برسنے کا مفہوم کیا ہے؟ اگر اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ آسمان سے پانی برسے گا تو ہمیں رزق ملتا رہے گا تو ایسی زمین جس پر پانی نہیں برستا۔ کیکر اور دوسرے درخت کیوں اُگتے ہیں؟ میں نے غور کیا کہ ''انزل من السماء ماء'' اللہ اعلیٰ و ارفع ہے اور قادر مطلق ہستی ہے جو آسمان سے پانی برساتی ہے اور پھر اس پانی سے نوع انسانی کے لئے نوع اجنہ کے لئے نوع جمادات کے لئے نوع نباتات کے لئے رزق پیدا کرتی ہے۔ جب میں نے اس بات پر غور کیا تو میری

سمجھ میں ایک بات یہ آئی کہ اللہ کی جتنی بھی مخلوق ہے اس میں نقش و نگار ہوتے ہیں۔ چھ ارب کی آبادی بغیر نقش و نگار کے نہیں ہے۔ کسی کی ناک چپٹی ہے تو کسی کی ناک کھڑی ہوتی ہے۔ کسی کی ناک چھوٹی ہوتی ہے کسی کی بڑی ہوتی ہے۔ اسی طرح کسی کی آنکھ گول ہے کسی کی مخروطی ہے اور کوئی غزالی چشم ہے۔ لیکن انسانی ڈائی مینشن (Dimension) دنیا کے کسی خطے پر بھی اس کو انسان دکھاتے ہیں۔ اگر آپ ایک چینی کو دیکھیں تو اس کا قد چھوٹا ہوگا۔ اس کی ناک چپٹی ہوگی اس کا رنگ پیلا ہوگا۔ اس کی آنکھ گول ہوں گی لیکن اسے آپ انسان ہی کہتے ہیں۔ اسی طرح ایک قد آور آدمی کو دیکھ کر آپ کہتے ہیں کہ یہ انسان ہے۔ اسی طرح آپ کبوتر کو دیکھیں گے، دنیا کے کسی بھی خطے میں آپ چلے جائیں کبوتر کالا ہو، کبوتر سفید ہو، کبوتر فاختائی رنگ کا ہو کیسا ہی ہو اسے آپ کبوتر ہی کہتے ہیں۔ بات یہ سمجھ میں آئی کائنات میں جتنی بھی نوعیں ہیں، پرندے ہوں چرندے ہوں حشرات الارض ہوں ان کے اپنے مخصوص خدوخال ہیں اور اپنے مخصوص خدوخال سے ہی وہ پہچانے جاتے ہیں۔

"ہم آسمان سے ماء نازل کرتے ہیں۔"

ماء کا ترجمہ پانی ہے لیکن پانی کی صفات یا پانی کی خصوصیات پر ہم غور کریں تو ہمیں یہ بات نظر آتی ہے کہ پانی ایسی مائع شے ہے جو بہتی ہے۔ نہ صرف بہتی ہے بلکہ جس جگہ وہ ٹھہرتی ہے اس جگہ کے ہر ہر پہلو میں سرائیت کر کے اس کو سیراب کر دیتی ہے۔ کبوتر کی ڈائی بنائیں اور اس میں پانی ڈال دیں اس کو ڈیپ فریزر میں رکھ دیں۔ وہاں سے نکال کر اسے کھولیں تو آپ کو کیا چیز ملے گی؟ کبوتر ملے گا۔ اسی صورت سے قلفی کی ڈائی میں پانی دودھ چینی ملا کر اسے جما دیں۔ باہر نکالیں گے تو قلفی ملے گی۔ اللہ نے پانی کی خاصیت یہ رکھی ہے کہ پانی میں ماہیت قلب کی صفات ہیں۔ پانی جس ڈائی میں جاتا ہے ڈائی کی مناسبت سے خود کو تبدیل کر لیتا ہے۔ پانی نشیب میں بہتا ہے۔ پانی میں طاقت (Energy) ہے جس سے آپ بڑے بڑے ٹربائن چلا کر بجلی حاصل کر لیتے ہیں۔ پانی منہ زور ہو جائے تو بڑے بڑے شہر سیکنڈوں میں تباہ و برباد ہو جاتے ہیں یعنی پانی کا مطلب ہے توانائی، توانائی کا مطلب ہے

روشنی۔ اللہ تعالیٰ آسمان سے روشنیاں نازل کرتا ہے۔

"اللہ نور السموت والارض"۔

یعنی اللہ آسمان و زمین کی روشنی ہے۔ زمین میں شجر حجر پانی سب روشنی ہے۔ آسمانوں میں فرشتے ہیں۔ عرش و کرسی ہے۔ بیت المعمور ہے۔ سدرۃ المنتہیٰ جنت سب روشنی ہے۔ اللہ تعالیٰ آسمان سے روشنی نازل کرتا ہے اور اس روشنی کا وصف یہ ہے کہ جس ڈائی میں جاتی ہے وہی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اور جس ڈائی سے وہ روشنی نکل آتی ہے وہ ڈائی خول رہ جاتا ہے۔ اس میں حرکت نہیں رہتی۔ روشنی اللہ کی صفات ہیں۔ ان ہی صفات کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا "میں نے انسان یعنی مرد اور عورت دونوں کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے"۔ یعنی انسان کے اندر اللہ نے اپنی صفات منتقل کر دیں۔ ان صفات کی بنیاد انسان کا اللہ سے رابطہ ہے۔ رشتہ اور تعلق ہے۔ اگر انسان ان روشنیوں سے واقف نہیں ہے جن صفات یعنی روشنیوں کو اللہ نے بندے کے اندر منتقل کیا ہے اور جو صفات ڈائی مینشن (Dimension) بن کر انسان کو خدوخال بخش رہی ہیں تو انسان کبھی خدا رسیدہ نہیں ہو سکتا۔

ہر مذہب نے یہ اعلان کیا ہے کہ بندے کا اللہ کے ساتھ رشتہ قائم ہے۔ ہم سب انسان ہوں حیوانات ہوں، نباتات ہوں، جنات ہوں، فرشتے ہوں، جو بھی ہوں اسی وقت تک متحرک ہیں جب تک ہمارا اللہ سے رشتہ قائم ہے۔

غور فرمائیے! روح چیونٹی میں داخل ہو گئی تو چیونٹی بن گئی۔ مثال کے طور پر اگر آپ چیونٹی بنا لیں اور اس میں جو بھی مصالحہ ڈالیں گے چیونٹی بن جائے گی۔ اسی طرح روح اونٹ میں چلی گئی اونٹ بن گیا۔ روح مور میں داخل ہو گئی مور بن گیا۔ روح انسان میں چلی گئی۔ انسان بن گیا۔ لیکن جب ان سب چیزوں میں سے روح نکل گئی تو کیا رہ گیا کچھ بھی نہیں۔ تو آپ کی اصل روح ہے۔ اصل انسان روح ہے۔ جب تک روح ہے آپ کو بھوک بھی لگے گی۔ جب تک روح ہے آپ کو پیاس بھی لگے گی۔ جب تک آپ کے اندر روح ہے آپ کا دل چاہے گا شادی کروں آپ کا دل چاہے گا میرے بچے ہوں۔ کیا آپ نے کبھی دیکھا ہے

کہ مردہ جسم نے کبھی شادی کی ہو۔ کیا آپ نے کبھی دیکھا ہے؟ مردہ جسم سے کبھی ولادت ہوئی ہو۔

تو اصل چیز کیا ہے.....؟ اصل چیز روح ہے۔ اگر اصل چیز روح ہے تو پھر ہم کیا ہیں.....؟ ہم کہاں بھٹک رہے ہیں.....؟ ہم تو اصل جسم کو کہہ رہے ہیں۔ ہم تو اصل مادیت کو کہہ رہے ہیں۔ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ اگر آدمی روٹی نہیں کھائے گا تو مر جائے گا۔ لیکن یہاں صورتحال یہ ہے کہ اگر روح نہ ہو تو آدمی کو بھوک ہی نہیں لگتی۔ اس سبق کو اچھی طرح یاد کر لیجئے کہ انسان روح کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ آیئے ہم سب آج کی اس روحانی مجلس میں یہ طے کر کے اٹھیں کہ مادی جسم کی کوئی حیثیت نہیں۔ اصل حیثیت روح کی ہے۔ جب اصل حیثیت روح کی ہے تو ہم جس طرح مادی جسم کی پوجا کر رہے ہیں یا مادی جسم کے لئے قوانین توڑ رہے ہیں۔ جس طرح ہم نے مادی جسم کے ساتھ تعلق قائم کیا ہوا ہے۔ کیا انصاف پر مبنی ہے.....؟ ہرگز یہ انصاف نہیں۔

کتاب لوح وقلم میں سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے روحانی علوم کے وارث ابدال حق حضور قلندر بابا اولیاء رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں؛

انسان کی مجبوری یہ ہے کہ سردی گرمی سے حفاظت کے لئے وہ لباس بناتا ہے۔ گرمیوں میں بھی اسے لباس چاہیئے۔ سردیوں میں بھی اسے لباس چاہیئے۔ اس لئے کہ اگر وہ لباس سے آزاد ہو جائے گا تو اس میں اور حیوان میں کوئی فرق ہی نہیں رہے گا۔ انسان کو مادی اعتبار سے حیوانات سے جو چیز ممتاز کرتی ہے وہ لباس ہے۔ جانوروں کو ستر پوشی کا احساس ہی نہیں ہے۔ انسان کو ستر پوشی کا احساس دلایا جاتا ہے۔ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو سب سے پہلے بچے کے شعور میں جو چیز منتقل کی جاتی ہے وہ ستر پوشی کا احساس ہے۔ بہن، بھائی، دوست احباب ہر آدمی کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ بچہ کو ستر پوشی کی عادت ڈال دی جائے۔

میں نے جو کرتا پہن رکھا ہے۔ میں چاہوں بھی کہ ہاتھ ہلائے بغیر آستین حرکت کرے تو ایسا نہیں ہوسکتا۔ اس طرح اگر انسان کے اندر روح نہیں ہے تو انسان کا ہاتھ بھی نہیں ہلتا۔

جس طرح انسان اُون کا یا سوت کا لباس بناتا ہے اور لباس کی حرکت جسم کے تابع ہے۔ اسی طرح جسم کی حرکت روح کے تابع ہے۔ روح ہوگی تو ہاتھ ہٹے گا روح نہیں ہوگی ہاتھ نہیں ہٹے گا۔ مادی خول کو یعنی کھال کو پٹھوں کو ہڈیوں کو ہم لباس قرار دے کر روح کو سمجھیں گے تو بات آسانی سے ذہن نشین ہو جائے گی۔

سیدنا حضور علیہ الصلوۃ والسلام کا ارشاد ہے جس نے اپنے نفس (روح) کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا کیونکہ روح اللہ کی جان ہے۔

اللہ ایک دائرہ ہے جس کے اندر تم بند ہو ''**نحن اقرب الیہ من حبل الورید**'' ''میں تمہاری جان سے بھی زیادہ تم سے قریب ہوں۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں'' **وفی انفسکم افلا تبصرون** '' یعنی میں تمہارے اندر ہوں تم مجھے دیکھتے کیوں نہیں۔

روح اندر ہی تو ہے آپ کو پتھر اٹھانے کی مشقت نہیں کرنی۔ آپ کو کوئی پہاڑ نہیں توڑنا صرف اتنا کام کرنا ہے کہ اپنے اندر دیکھنے کی پریکٹس کریں۔ اپنے اندر جھانکنے کی کوشش کریں۔ جب آپ اپنے اندر جھانک لیں گے تو روح نظر آجائے گی۔ اور جب روح نظر آجائے گی تو روح تو اللہ کو پہلے ہی دیکھ چکی ہے۔ اللہ کی آواز پہلے ہی سن چکی ہے۔

ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں اور ان کے فیض یافتہ اولیاء اللہ نے ایک ہی بات بتائی کہ مادی جسم روح کا لباس ہے۔ اصل انسان روح ہے۔ مادی جسم کی حفاظت اس لئے کرو کہ مادی جسم روح کے لئے پردہ ہے۔ اس لباس کو زندگی کا مقصد نہ بناؤ۔ یہ جسم گھٹنے بڑھنے والی چیز ہے۔ آدمی ہر روز پیدا ہوتا ہے۔ ہر روز مرتا ہے۔ ایک دن کے بچہ پر موت وارد نہ ہو وہ دو۲ دن کا بچہ نہیں ہوسکتا۔ ایک سال کے بچے پر فنائیت غالب نہ آئے تو وہ دو سال کا نہیں ہو سکتا۔ اگر جوانی کو بڑھاپا نہ نگل لے تو کوئی آدمی بوڑھا نہیں ہوسکتا۔ ہر چیز فنا ہو رہی ہے۔ موت زندگی کو کھا رہی ہے۔ اور زندگی موت کو کھا رہی ہے۔ یہاں کا ہر لمحہ موت وزیست کے دوش پر رقصاں ہے۔ اگر روح سے واقفیت نہیں ہوگی تو ساری زندگی گھاٹے اور خسارے کی زندگی ہے۔

سلسلہ عالیہ عظیمیہ کا یہ پیغام ہے کہ نوع انسان کو یہ بتا دیا جائے کہ مادی زندگی عارضی زندگی ہے۔ مادی زندگی فکشن (Fiction) زندگی تراش ہے خراش ہے۔ ڈسٹربنس (Disturbance) ہے پریشانی ہے۔ اضطراب ہے۔ بے چینی ہے بے قراری ہے۔ ردعمل ہے اور روحانی زندگی میں ردعمل نہیں ہے۔ بے چینی نہیں ہے۔ بے قراری نہیں ہے۔ اضطراب نہیں ہے۔ خوف نہیں ہے۔ غم نہیں ہے۔

اصل یہ ہے کہ یہاں کوئی انسان مادی وجود میں اصل انسان نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں ہر مادی وجود اس لئے قائم ہے کہ اس کے اندر روح موجود ہے۔

سلسلہ عالیہ عظیمیہ کے کارکنان کی یہ کوشش ہے کہ حضور قلندر بابا اولیاء رحمۃ اللہ علیہ نے جس طرح اپنے شاگردوں کو ان کی روح سے واقف کرا دیا۔ اسی طرح ہم بھی اپنی بہنوں اور اپنے بھائیوں کو بلا تخصیص مذہب وملت روح سے متعارف کرا دیں۔ آمین یا رب العالمین۔
شکریہ۔



''اللہ ستر ماؤں سے زیادہ محبت کرتا ہے''

سوال: جناب آپ نے ہمیں بتایا ہے کہ ''اللہ اپنے بندوں سے ستر ماؤں سے زیادہ محبت کرتا ہے''۔ اللہ کہتا ہے ''مجھ سے مانگو میں تمہیں دوں گا'' لیکن جناب میں تو ایک ماں کی محبت سے بھی محروم ہوں۔

میں سمجھتی تھی کہ اللہ میری دعاؤں کو سنتا ہے اس لئے میں نے جو بھی مانگا ایک حد میں رہ کر مانگا ہے۔ اللہ وہ ہستی ہے جس نے کن کہہ کر تمام عالم کو تخلیق کر دیا۔ اللہ ایسا بادشاہ ہے کہ اس دنیا میں اور اس دنیا کے علاوہ تمام دنیاؤں میں اس کے حکم کے بغیر پتہ نہیں ہلتا۔ میں سوچتی ہوں کہ میری دعائیں قبول کیوں نہیں ہوتیں۔ اللہ کے خزانے میں تو کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ ہر وقت اللہ کا نام جپتی رہتی ہوں۔ میں اللہ کے ذکر کے بغیر ایک پل بھی زندہ نہیں رہ سکتی۔

عظیمی صاحب! لوگ آپ کو اللہ کا دوست کہتے ہیں۔ مجھے وہ راستہ بتایئے کہ اللہ میری بات کا جواب دے۔ میں اس کی بندی ہوں اس کا در چھوڑ کر آخر کہاں جاؤں؟

جواب: اللہ کی نشانیوں پر غور وفکر کرنے سے بندہ اللہ سے قریب ہو جاتا ہے۔ قرآن پاک میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ پڑھیں اور اس کی حکمت پر غور کریں، سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی غار حرا کی سنت پر عمل کریں۔ اللہ مخلوق کی رگ جان سے زیادہ قریب ہے۔ پہلے اپنی جان کے بارے میں تفکر کریں کہ جان کیا ہے، کہاں ہے کس طرح اس کا سراغ مل سکتا ہے۔ جب بندہ خود کو پہچان لیتا ہے تو رب کو پہچان لیتا ہے۔ اللہ کو ازل میں روح دیکھ چکی ہے۔ اللہ کو مادی آنکھ سے نہیں روح کی آنکھ سے دیکھا جاتا ہے اور روح کے کانوں سے اللہ کی آواز سنی جاتی ہے۔ روح کے دل سے اللہ کی تصدیق کی جاتی ہے۔ یوم ازل اللہ نے جب روحوں کو مخاطب کر کے کہا:

''میں تمہارا رب ہوں'' تو روح کے کانوں نے آواز سنی۔ روح کی آنکھوں نے اللہ کی تجلی کا دیدار کیا۔ دل نے اقرار کیا اور روحوں نے کہا:

"جی ہاں آپ ہمارے رب ہیں۔"

اپنی روح سے متعارف ہونے کے لئے اپنے اندر جھانکئے۔ اس روح سے تعارف حاصل کیجئے جس کے بغیر آپ کھانا کھا سکتی ہیں نہ پانی پی سکتی ہیں اور جس کے بغیر آپ حرکت نہیں کر سکتیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

"میں تمہارے اندر ہوں تم مجھے دیکھتے کیوں نہیں؟"

☆☆☆

"نفس کی خواہشات"

سوال: آپ اپنی تحریروں میں زور دیتے ہیں کہ انسان اللہ تعالیٰ کو اپنی زندگی میں اس طرح شامل کرے کہ کسی بھی چیز سے اسی کا رشتہ اللہ تعالیٰ کے توسط سے قائم ہو۔ جنسی جذبہ ایسا جذبہ ہے کہ جب انسان اس جذبہ میں ہوتا ہے تو اس کو اس وقت کسی دوسری چیز کا خیال نہیں آتا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اس جذبہ میں بھی اللہ تعالیٰ کی ذات کو شامل کر لیا جائے اور کس طرح۔

جواب: ہر ذی روح اپنے مادّی جسم کی فنا کے بعد کسی نہ کسی شکل میں بقا کا خواہش مند ہوتا ہے۔ یہ جذبہ ادنیٰ سے ادنیٰ ذی حیات کی زندگی میں بھی موجود ہوتا ہے' درخت' جڑی بوٹیاں' چرند پرند حیوانات' کیڑے مکوڑے اور انسان سب ہی اس جذبے کے حامل ہیں۔ اور بقائے نسل کا انحصار بہت حد تک ذی روح کی کوششوں پر منحصر ہے۔ عام حالتوں میں ہر پھل کی گٹھلی اگر اپنی حالت پر چھوڑ دی جائے تو ضرور ایک بڑا پھل دار درخت بن جائے گا۔ اگر اسے جلا دیا جائے یا اسے نشوونما دینے والی طاقتوں سے محروم کر دیا جائے تو وہ مرجھا کر مٹی میں مل جائے گی اس طرح زندگی جسم کے فنا ہونے کے بعد بھی نسل شکل میں قائم رہتی ہے۔

زندگی کے ارتقاء پر تحقیق کرنے والے ماہرین کا انحصار بڑی حد تک اسی اصول کو معلوم کرنا تھا جن کی بنا پر حیات مختلف زمانوں میں مختلف شکلیں اختیار کرتی رہی ہے۔ حیات کا مقصد "دوام" ہے اور حیات دوام اس لئے چاہتی ہے کہ خود اس کی ہستی میں خالق حقیقی موجود ہے جو دائم و قائم ہے اور ایک مشترکہ جزو خالق ومخلوق میں ایک رشتے کی حیثیت سے موجود ہے۔

مادّہ کے ازلی اور ابدی ہونے کے بارے میں تو فلسفیوں نے بہت کچھ لکھا ہے لیکن درحقیقت بالکل مادّی اشیاء میں بھی نسلی اور جنسی بقا کا جزبہ پایا جاتا ہے اس بنا پر اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ان کی نسل کی بقا کا وعدہ کیا تھا۔

رسول اکرم ﷺ سے قرآن مجید نے جو وعدہ فرمایا تھا کہ "تحقیق تیرا دشمن بے نسل رہے گا۔" تو اس کی وجہ یہی تھی کہ حضور ﷺ کی تعلیم اور زندگی کا مقصد خداوند عالم کے مقاصد کے

مطابق تھا۔ وہ لوگ جن کا رشتہ اپنے خالق کے مقاصد کے سامنے ہمیشہ دیوار بن کر کھڑے ہو جائیں تو ان کی فنا لازمی ہے۔ ان کی نسلیں منقطع ہو جاتی ہیں۔ قرآن پاک میں جو مختلف قوموں کی بربادی کا ذکر کیا گیا ہے اس کی وجہ بھی ان قوموں کے اپنے انبیاء اور ناصحین کی مخالفت قرار دیا ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ جنسی کشش اس کا علم اس کا مقصد یعنی بقائے نسل مکمل طور پر روحانی قانون پر منحصر ہے جو مخلوق کے اندر خالق کی طرف توجہ کرنے اور اپنی خواہشات کو فنا کر دینے میں پوشیدہ ہے۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ جنسی جذبہ ایک حیوانی جذبہ ہے اور اس کی کشش غیر شعوری جذبے کے متعلق بقائے نسل کے سوا کچھ نہیں، اگر اسے ٹھیک بھی مان لیا جائے تو اس کے معنی اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ نسلی بقا کا جذبہ انسانوں میں صرف حیوان ہونے کی حیثیت سے غیر شعوری طور پر پایا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ یہ جذبہ انسانوں میں عام طور پر بالکل غیر شعوری طریقے سے موجود ہے۔

ماہرین علم غیر شعوری مثلاً فرائڈ وغیرہ اسے تسلیم کرتے ہیں کہ ہر ایک آدمی اپنے بچپن کے غیر شعوری تاثرات کے زیر اثر اپنی ماں جیسے اوصاف کی عورت کو اپنی بیوی بنانے کی خواہش رکھتا ہے اور ہر عورت اپنے باپ سے مشابہ مرد کو اپنا شوہر بنانے کی خواہش مند ہوتی ہے اس میں تھوڑی بہت صداقت ضرور ہے لیکن مکمل طور پر اسے درست نہیں کہا جا سکتا۔ اس انتخاب کی وجہ روحانی قوت ہے۔ جو خالق حقیقی ہر مخلوق شے کی تخلیق کے وقت اپنے جزو کی حیثیت سے اس کی روح میں رکھ دیتے ہیں۔

جنسی کشش میں ایسے اخلاق کی یگانگت کا بھی اثر پڑتا ہے جو روحانی طور پر ایک دوسرے سے زیادہ مشابہ ہوتے ہیں۔ قرآن پاک نے یہ اصول بیان کیا ہے کہ نیک بیویاں نیک مردوں کے لئے ہیں۔ اس اصول کو دوسرے انداز سے دیکھیئے تو یہی ثابت ہوگا کہ جنسی کشش جسے کبھی عشق کبھی محبت کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ درحقیقت اس کشش کی ایک قسم

ہے جو سب مخلوق اشیا میں پائی جاتی ہے خواہ یہ کشش باہمی سیاروں میں ہو یا زمین یا چاند یا سورج میں درحقیقت اس ذات خداوندی کی تخلیق کی ایک بنیادی صفت ہے۔ جس بنا پر ہر شے اپنی تخلیق کے مقصد کو پورا کرتی ہے۔

رسول اکرم ﷺ نے جو روحانی حقیقتوں کے بہترین سمجھنے والے تھے عورت کے پسندیدگی کا اظہار فرمایا اور اس کے ساتھ ہی صلوٰۃ کو اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک کہا تو اس میں بھی یہی راز مضمر تھا کہ جنسی کشش روحانی جذبہ ہے جو خالق کی دی ہوئی قوت تخلیق کے اظہار کا ایک ذریعہ ہے۔

یگانگت یا وحدت کے لئے ایک مرکز کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس قدر نفس ایک مرکزی مقصد کے حصول کے لئے وحدت کے ساتھ عمل کرے گا اسی قدر روحانی ترقی زیادہ ہو گی۔ تحقیق سے یہ بھی ثابت ہوا ہے کہ جس قدر نفس کا زیادہ اثر خواہشات' جذبات اور عملیات پر ہو گا اسی طرح شخص اپنے افعال زندگی کو بہت طریقے سے ادا کر سکے گا۔ ازواجی تعلقات کو بھی اگر ایک جسمانی اور حیوانی فعل تصور کر لیا جائے تو بھی اس کے ادا کرنے کا بہترین طریقہ نفس کو اس طرح سدھارتا ہے کہ وہ اپنی خواہشات پر پورا قابو پا لے اور ان کی ادائیگی میں اس طرح عمل کرے کہ اس قدرتی فعل سے جسم کو نفع ہی نفع حاصل ہو۔

نسلی بقا ہر نفس کی خواہش ہے خواہ وہ حیوانات کی طرح بالکل غیر شعوری ہو یا انسانوں کی طرح سے شعوری درجہ اختیار کر لے۔

☆☆☆

''رُوح اَمرِ الٰہی ہے''

سوال: من عَرَفَ نَفْسَہ' فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہ' کی روحانی توجیہہ بیان فرمادیں۔

جواب: من عَرَفَ نَفْسَہ' فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہ'

''حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے کہ جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا' پس تحقیق اس نے اپنے کو پہچان لیا۔''

اپنا عرفان رکھنے والا شخص ہی خالق کائنات کا عرفان حاصل کرسکتا ہے اور عرفان نفس کے مراتب ہیں۔

من عرف نفسہ فقد عرفہ ربہ' کے تحت ہم اس کی وضاحت کریں گے کہ عرفان نفس سے اللہ تعالیٰ کے عرفان کا کیا تعلق ہے؟ اور اللہ تعالیٰ سے متعارف ہونے کے لیے پہلے اپنے نفس سے متعارف ہونا کیوں ضروری ہے'اس سلسلے میں قرآنی تعلیمات کے نقطہ نظر سے انسان کے مندرجہ ذیل اوصاف زیر بحث کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا' میں ارض میں اپنا نائب بنانے والا ہوں' ملائکہ نے عرض کیا' یہ تو خون خرابہ اور فساد کرے گا' اللہ تعالیٰ نے فرمایا جو ہم جانتے ہیں وہ تم نہیں جانتے اور پھر آدم کو علم الاسماء عطا فرما کر فرشتوں سے اس بات کا اقرار کرالیا کہ جو علم آدم کو عطا کیا گیا' فرشتے اس علم سے ناواقف ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں' ہم نے انسان کو کھنکھتی مٹی (خلا رکھنے والی) سے پیدا کیا' ہم نے اس میں اپنی روح پھونکی' انسان ہماری ہی سماعت سے سنتا ہے' ہماری ہی بصارت سے دیکھتا ہے اور ہمارے دیئے ہوئے فواد (ذہن) سے سوچتا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ کے تحت مندرجہ ذیل باتیں زیر بحث آتی ہیں:

۱۔ آدم کی خلافت اور نیابت

۲۔ نیابت اور خلافت کا علم

۳۔ اس علم (ایڈمنسٹریشن) کو استعمال کرنے کے لیے اختیارات۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں' ہم نے اپنی امانت (نیابت) سماوات' ارض اور جبال کو پیش کی' سماوات ارض اور جبال نے اس امانت (نیابت) کو قبول کرنے سے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ ہم اس بار کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ مگر انسان نے اس کو بے سوچے سمجھے قبول کرلیا پس تحقیق یہ ظالم اور جاہل تھے۔

قرآن پاک ہمیں عرفان نفس کے سلسلے میں جن علوم سے روشناس کراتا ہے وہ دو ہیں' ایک وہ علم جو معاشرتی اقدار کو قائم رکھنے کے لیے قانون کی حیثیت رکھتا ہے اور دوسرا علم وہ ہے کہ جس میں تخلیق کائنات اور اس تخلیق میں عمل درآمد کرنے والے قانون کی وضاحت ہوتی ہے' معاشرتی اقدار کو قائم رکھنے والا علم سب کا سب علم شریعت کے نام سے موسوم ہے' تخلیق کائنات میں عمل درآمد کرنے والا علم (علم نیابت) سب کا سب علم تکوین ہے۔

کوئی بھی انسان جب تک علم شریعت اور علم تکوین کے ابتدائی مراحل سے نہ گذرے عرفان نفس حاصل نہیں کرسکتا' شریعت میں علم پہلے اور عمل بعد میں آتا ہے' شریعت میں ذہن اور شعور کسی عمل کو اختیار کرنے یا نہ کرنے پر مختار ہے' تکوین میں شعور انسانی کی جگہ شعور کائنات (انسانی لاشعور) کام کرتا ہے اس عالم میں وہی اختیارات استعمال ہوتے ہیں جو قدرت کی طرف سے ودیعت کیے گئے ہیں' ان کا استعمال منشاء قدرت اور مشیت الٰہی کے تحت ہوتا ہے۔

شریعت اور طریقت دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں' شریعت نام ہے معاشرتی پروگرام (علم) کا اور طریقت نام ہے اس پروگرام پر عمل پیرا ہونے کا البتہ تکوین بالکل الگ علم کی حیثیت رکھتا ہے' علم نبوت میں اس علم کا نام لدنی ہے اور یہ وہی علم ہے جس کی بناء پر آدم علیہ السلام کو فرشتوں نے سجدہ کیا' یہی وہ علم ہے جس کو قبول کرنے سے سماوات' ارض اور جبال نے معذرت ظاہر کی۔ اور یہی وہ علم ہے...... جو کائنات میں انسان کے علاوہ کبھی دوسری مخلوق کو نہیں دیا گیا' قرآن پاک میں اس علم کی نشان دہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں وضاحت کے ساتھ کی گئی ہے' حضرت موسیٰ علیہ السلام صاحب شریعت اور صاحب طریقت

تھے، علم شریعت یہ کہ ان کے پاس قوم کی رہنمائی کا پروگرام تھا اور طریقت یہ کہ اس پروگرام کے تحت ان کو اللہ تعالیٰ کا عرفان حاصل تھا۔

نفس کا عرفان دو طرح ہوتا ہے' پہلا یہ کہ ہمارا تخلیق کرنے والا کون ہے اور اس تخلیق میں خالق کی کیا کیا نشانیاں موجود ہیں' ہم ان نشانیوں سے کس طرح وقوف حاصل کر کے خود کو پہچان سکتے ہیں خود کو پہچاننا یہ ہے کہ انسان اس کو تلاش کرے کہ اس کی تخلیق کا منشا اور مقصد کیا ہے' یہ بات ہم پہلے کسی مضمون میں سمجھا چکے ہیں کہ انسان کی حیثیت' خیالات' تصورات اور احساسات سے باہر کچھ نہیں ہے' خیالات اور تصورات ہی زندگی ہیں اگر زندگی میں سے تصورات اور خیالات کو نکال لیا جائے تو زندگی کی حیثیت معدوم ہو جائے گی۔ یہ بات معلوم کرنا کہ خیالات اور تصورات کا منبع (Source) کیا ہے اور یہ کس طرح بنتے اور عمل کرتے ہیں یعنی قدرت کا کونسا نظام اس میں عمل کر رہا ہے' زندگی کہاں سے شروع ہوتی ہے اور کہاں ختم ہو جاتی ہے انسان کیوں مجبور اور کیوں با اختیار ہے' کیوں وہ خود پیدائش پر دسترس نہیں رکھتا اور کیوں مرنے پر مجبور ہے اس کی تخلیق کا مقصد کیا ہے۔ فرشتوں اور جنات کی موجودگی اس کی پیدائش کے پس پردہ اللہ تعالیٰ کی کونسی مشیت کام کر رہی ہے' زمین' ملائکہ' چاند سورج اور بے شمار کہکشانی نظام اس کی خدمت کے لیے کس قانون کے زیر اثر پابند ہیں۔

وَسَخَّرَ لَكُم ما فی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَمِيعًا مِنْهُ اور ہم نے مسخر کر دیا تمہارے لیے سماوات اور ارض کو اور اس کے اندر جو کچھ ہے سب کا سب **وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ** اور ہم نے مسخر کر دیا تمہارے لیے سورج اور چاند کو **وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ** اور مسخر کر دیا تمہارے لیے رات اور دن کو انسان احسن تقویم ہوتے ہوئے کیوں **اَسْفَلَ سَافِلِيْن** میں پڑا ہوا ہے؟ **وَلَقَدْ خَلَقْنَا الانسان فِي اَحْسَنِ تَقْوِيم ثُمَّ رَدَدْنَاهُ اَسْفَلَ سَافِلِيْن**) عرفان نفس سے یہ سارے نکات واضح ہو جاتے ہیں۔

جب کوئی انسان ان حقائق کو سمجھنے لگتا ہے کہ ارض اور اس کے اندر کل اشیاء تسخیر قمر، تسخیر شمس اور تسخیر لیل و نہار میں اللہ تعالیٰ کا کونسا قانون کام کر رہا ہے تو اس کے سامنے یہ بات آ

جاتی ہے کہ انسان اور کائنات میں ہر موجود شے اللہ تعالیٰ سے ایک رشتہ مشترک رکھتی ہے اسی رشتہ مشترک کی بناء پر کائنات میں ہر شئے ایک دوسرے سے کسی نہ کسی عنوان سے روشناس ہے ایک بچہ ستارہ کو اس لیے پہچانتا ہے کہ بچے اور ستارہ کا ذہن تخلیقی رشتہ میں ایک ہی خالق کے ساتھ منسلک اور مربوط ہے' ایک بکری' انسان اور بھیڑیے کو اس لیے پہچانتی ہے کہ بھیڑیا' انسان اور بکری ایک خالق اور مالک کی تخلیق ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے سے ہم رشتہ ہیں' رشتہ انسان کو عرفان نفس اور خالق کائنات کے عرفان کا وجدان عطا کرتا ہے' اور یہ وجدان اللہ تعالیٰ کی صفت خالقیت سے قریب ہونے کا سبب بن جاتا ہے۔

عرفان نفس کا دوسرا مرتبہ:

اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے ارشاد فرمایا' مجھ کو بنانا ہے زمین میں خلیفہ' فرشتوں نے عرض کیا یا اللہ یہ فساد اور خون خرابہ کرے گا اور دیکھئے ہم آپ کی حمد وثنا میں لگے ہوئے ہیں' اللہ تعالیٰ نے فرمایا جو کچھ میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے اور پھر آدم کو علم الاسماء (صفات الٰہیہ کا علم) عطا فرمایا' پھر فرشتوں سے دریافت فرمایا کہ اگر تم سچے ہو تو بتاؤ یہ علم کیا ہے' فرشتوں نے اپنی لاعلمی کا اعتراف کرنے کے بعد کہا ہم وہی جانتے ہیں جو آپ نے ہمیں سکھایا ہے۔ اور آدم نے اللہ تعالیٰ کے ودیعت کردہ علم الاسماء کو بیان کر دیا' اس کے بعد فرشتوں کو حکم دیا گیا کہ آدم کو سجدہ کریں' سب کے سب سجدے میں گر گئے مگر ابلیس نے نافرمانی کی اور وہ اللہ کے حکم سے منکر ہو گیا۔ سورۃ بقر۔ اور جب کہا کہ تیرے رب نے فرشتوں سے میں تخلیق کروں گا' ایک بشر بجنی مٹی (خلاء) سے پھر جب مکمل کر لوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم سجدہ کرنا اس کو' جیسے ہی اللہ تعالیٰ نے بشر (آدم کا پتلا) میں اپنی روح پھونکی' سجدہ کیا سب فرشتوں نے ایک ساتھ مگر ابلیس سجدہ کرنے والوں میں نہ ہوا اور اس کو وہاں سے نکال دیا گیا لعنت اور پھٹکار کے ساتھ۔ سورہ حجر۔

آیات مندرجہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ آدم جس وقت تک پتلا (خلا) ہے اس کو اللہ تعالیٰ بشر فرماتا ہے' جب اس خلاء کو روح سے پُر کر دیا گیا۔ تو اس کا نام آدم ہوگیا' قرآن پاک کے ارشاد کے مطابق چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی کوئی بات ایسی نہیں ہے جس کی

قرآن نے وضاحت نہ کی ہو (سورۂ کہف) آیئے قرآن پاک کی تعلیمات کی روشنی میں یہ معلوم کریں کہ روح کیا ہے؟

روح کی تعریف:

قرآن پاک میں ارشاد ہوا ہے' اے رسول ﷺ آپ سے سوال کرتے ہیں کہ روح کیا ہے؟ آپ فرما دیجئے کہ روح میرے رب کا امر ہے (سورہ بنی اسرائیل)

اب دیکھئے قرآن پاک امر کی تعریف کن الفاظ میں کرتا ہے۔

''اللہ کا امر یہ ہے کہ جب وہ (امر) کسی چیز کو وجود میں لانے کا ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے کن وجود میں آجا' فیکون وہ وجود میں آجاتی ہے' اس کی وضاحت اس طرح کی جاسکتی ہے:۔

بشر پتلا ہے' پتلا خلاء ہے' خلاء یا بشر میں اللہ تعالیٰ کا امر (روح) ہے۔ جس کو اللہ تعالیٰ آدم فرماتے ہیں' روح اللہ کا امر ہے اور اللہ کا امر یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کے تخلیق کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے۔ عدم سے وجود میں آجا اور وہ ہو جاتی ہے۔

☆☆☆

باب ششم

''حضور غوث پاک''

سوال: بڑے پیر صاحب حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ کی ذات بابرکات ''غوث پاک'' کے نام سے جانی اور پہچانی جاتی ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟

جواب: حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ ان بزرگوں میں ہیں جن کی کرامات بے شمار ہیں اور لوگ ان کرامات کا تذکرہ تو بہت کرتے ہیں لیکن حضرت کی تعلیمات کا پہلو کم بیان ہوتا ہے۔ پیران پیر دستگیر کے شاگرد' متوسلین' مریدین اور عقیدت مندوں کا یہ مشن رہا ہے کہ ان کے علوم کو آگے بڑھائیں اور تسخیر کائنات کے فارمولے آشکار کریں۔

صاحب کشف و شہود حضرات جانتے ہیں کہ حضرت شاہ جیلانؒ اس وقت سرور کائنات رسول اللہ ﷺ کے دربار عالی مقام میں ''وزیر حضور'' کے منصب پر فائز ہیں۔ یہ ایک ایسا عہدہ ہے جس کی عظمت و جلالت کا اندازہ مشکل ہے۔ کسی صاحب کشف والہام سے کوئی خرق عادت صادر ہوتی ہے تو ہم اسے مافوق الفطرت کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ حالانکہ کوئی چیز فطرت کے قانون سے باہر نہیں ہے۔ یہ ایک ایسی کم فہمی ہے جس کی بناء پر ہم حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے علوم سے بھرپور فائدہ نہیں اٹھا سکے۔ آج کی سائنس مادے کی بھول بھلیوں سے نکلنے کے لئے ہاتھ پیر مار رہی ہے۔ وہی بات جو قدسی نفس روحانی لوگ مختلف انداز میں بیان کر چکے ہیں آج آئن اسٹائن اور وائن برگ کی تھیوری کے خوشنما پردے میں سائنس کی علمی کاوشوں کا محور بن گئی ہے۔

آسمانی صحائف کی روشنی میں اللہ کا کوئی بندہ جب یہ کہتا ہے کہ ایک ہی طاقت جو محیط ہے۔ وہی طاقت ابتداء ہے انتہا ہے' اول و آخر ہے تو یہ بات مادہ پرست علماء کے پیچیدہ ذہن قبول نہیں کرتے۔ لیکن اسی بات کو جب سائنس دان جوہری توانائی (ایٹم) کے حوالے سے

بیان کرتے ہیں تو یہ ایک اچنبھے کی بات بن جاتی ہے۔

ایٹم کی تھیوری اور نظریہ اضافیت سے ہمارے سامنے ریاضی کے مختلف فارمولے آ جاتے ہیں اور جب ہم سے اسلاف سے صادر شدہ کرامات کی تشریح طلب کی جاتی ہے تو ہم گونگے بہروں کی طرح مخاطب کا منہ تکتے رہ جاتے ہیں۔ حالانکہ کرامات بھی ماورائی علوم کی ایک قد آور شاخ ہے۔ جس کے پس منظر میں قدرت کی واضح نشانیاں ہیں۔ حق یہ ہے کہ خرق عادت اور کرامات بھی قدرت کے قوانین کی بنیاد پر ظہور میں آتی ہیں۔ روحانی انسان ایک ایسا سائنسداں ہوتا ہے جو نہ صرف قدرت کے فارمولوں کو ان کی اصل صورت میں جانتا ہے بلکہ وسائل اور وقت کو درمیان میں لائے بغیر ماہیت قلب (Transformation) کر کے توانائی کو مادے کی شکل وصورت بخش دیتا ہے۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی تعلیمات کو فروغ دے کر اور ان پر خلوص نیت سے عمل پیرا ہو کر ہم جہنم زار زندگی سے محفوظ و مامون ہو سکتے ہیں اور اپنے اندر کی آنکھ سے سماوات میں موجود اللہ کی نشانیوں کا مشاہدہ کر کے اس آیت کی عملی تفسیر بن سکتے ہیں۔

الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیھم و لا ھم یحزنون o

ترجمہ: ''اللہ کے دوستوں کو خوف ہوتا ہے اور نہ وہ غم آشنا زندگی سے مانوس ہوتے ہیں۔''



''روشنی + نور (نور مطلق)''

سوال: تاریخ گواہ ہے کہ چار برس کی عمر میں ہمارے پیارے رسول مقبول محمد مصطفیٰ ﷺ کے پاس دو فرشتے آئے اور ان کا سینہ مبارک چیر کر دل صاف کیا۔ برائے کرام اس واقعہ کی روحانی توجیہہ فرمادیں۔

جواب: مکہ کی زمین جب گرمی کی شدت سے بانجھ بن گئی اور اس کے اوپر لو آگ بن کر برستی رہی۔ اور زمین کی کوکھ سے ریت کے گرم ذرات ابلنے لگے تو قدرت کو زمین کی حالت زار پر رحم آ گیا۔ بچوں کو جھلستی اور تپتی لو کے تھپیڑوں سے بچانے کے لیئے قدرت نے ابر کرم کو آواز دی کہ وہ اس مفلوک الحال پژمردہ چہروں کی شادابی کے لیے پھوار ٹپکائے ایسی پھوار جو گداز سے معمور ہو۔ جن کے اندر زندگی کا لہو دوڑتا ہو اور جو پھوار سایہ بن کر سر زمین حجاز کو اپنی آغوش میں لے لیں۔

قدرت کے اس انعام کے لیے سیدہ آمنہ کا انتخاب ہوا۔ سیدہ آمنہ کی آنکھوں کو ٹھنڈک ملی اور سینہ نور سے بھر گیا تو حلیمہ دائیؒ کا نصیب جاگ گیا۔ حلیمہؓ کی تقدیر نے معراج کو چھولیا۔ لوح وقلم نے ان کے نصیب میں یہ لکھ دیا تھا کہ حلیمہؓ اللہ کے محبوب ﷺ کو دودھ پلائیں اللہ کے ایسے محبوب ﷺ کو جن کے لیے اللہ نے یہ ساری کائنات بنائی ہے حلیمہؓ کی چھٹی حس نے حلیمہؓ کے کان میں سرگوشی کی۔ اے حلیمہ! تو نواز دی گئی ہے۔ تیرے مقدر کا ستارہ چاند سورج سے زیادہ روشن ہے۔ اے بنی سعد کی گمنام عورت! تیرا نام تاریخ دنیا میں ثبت ہو گیا ہے۔ تجھے وہ ابدی شہرت مل گئی ہے کہ قیامت تک یہ دنیا اور اس دنیا سے اس پار دوسری دنیائیں اور عالمین تجھے ابد تک یاد رکھیں گے۔ تیرے نام کے ساتھ عزت و احترام ایک امر حقیقی بن گیا ہے۔ شہر بھر میں، گلی کوچوں میں، امرا کے دروازوں پر دستک نہ دے۔ تو کیوں فکر کرتی ہے کہ میرے اردگرد قحط سالی ہے کیا ہوا کہ آمنہ کا لال یتیم ہے۔ تو یہ کیوں نہیں دیکھتی کہ تیرے بھاگ جاگ گئے ہیں۔ خالق کائنات کا محبوب ﷺ تیرے سینے سے لگا ہوا تیرا دودھ چوس رہا

ہے۔ ہاتف غیبی نے پکارا' اے حلیمہ سن! تجھے اگر کوئی بچہ نہیں ملا ہے تو ملال کیوں کرتی ہے۔ جا اور اطمینان قلب کے ساتھ جا۔ دل کے اندر سے نکلنے والی لہروں کے دوش پر جا اور آمنہ کے لال ﷺ کو اپنی گود میں اٹھا لے۔

حلیمہؓ ماں اللہ کے محبوب ﷺ کے دادا عبدالمطلب کے پاس گئیں۔ عبدالمطلب کو دیکھا تو ان کے دبدبے سے مرعوب ہو گئیں۔ لوگوں سے پوچھا' یہ کون بزرگ ہیں؟ کسی نے بتایا کہ مکے کے سردار عبدالمطلب ہیں۔ خدا ترس آدمی ہیں شریف اور اعلیٰ نسب ہیں۔

حلیمہ کہتی ہیں ''میرے دل کو قرار آ گیا۔ اور بچے کے نہ ملنے سے مایوسیوں کا اندھیرا میرے اوپر سے چھٹ گیا۔ میں نے عبدالمطلب کو سلام کیا اور عرض کیا۔

''میں آپ کے بچے کو لینے آئی ہوں۔''

پوچھا ''تمہارا نام کیا ہے؟''

بولیں۔ ''میرا نام حلیمہ سعدیہ ہے۔''

ننھے محبوب ﷺ کے دادا خوش ہوئے اور کہا ''اچھا نام ہے۔ مجھے حلیمی اور سعادت کی مبارک صفات پسند ہیں۔''

اور دعا کی۔ ''یا اللہ! خاتون حلیمہؓ کو محمد ﷺ کی سعادت سے سرفراز فرما۔''

حلیمہ کہتی ہیں۔ ''میں جب سیدہ آمنہ کے حضور حاضر ہوئی تو میں نے دیکھا کہ سیدہ آمنہ کا چہرہ چودھویں کے چاند کی چاندنی کو شرما رہا تھا پیشانی پر نور اور روشنی کی ایک قندیل تھی جس سے روشنیاں نکل کر ماحول کو منور کر رہی تھیں۔

تعارف ہونے کے بعد مبارک وسعید بچے کی مبارک اور سعید ماں مجھے ایک کمرے میں لے گئیں۔ کمرے میں سکون کا سماں تھا۔ انوار وتجلیات کی بارش برس رہی تھی۔ ہر طرف سکون تھا۔ سفید براق کپڑوں میں لپٹے ہوئے ننھے محبوب ﷺ سبز رنگ کے نرم وملائم بستر پر پہلو کے بل سو رہے تھے۔ لگتا تھا کہ چاند آسمان سے زمین پر اُتر آیا ہے۔ خوشبو سے کمرہ مہک رہا تھا باریک ململ کا دوپٹہ چہرے پر سے سرکایا تو دل کی کلی کھل گئی' آنکھوں میں چراغاں ہو گیا۔ رنگ

رنگ نکھر گیا۔ لگتا تھا کہ لطیف جسم کو چھونے سے میرا جسم بھی لطیف ہو گیا ہے۔ میں نے خود کو آسمان کی وسعتوں میں محو پرواز محسوس کیا۔ میں نے ننھے محبوب ﷺ کے سینے پر ممتا بھرا ہاتھ رکھا۔ ہاتھ رکھتے ہی اس دریتیم ﷺ نے آنکھیں کھول دیں۔ مجھے مسکرا کر دیکھا نظروں میں ایک پیغام تھا اور پیغام یہ تھا۔ اے حلیمہ سعید خاتون! میں اللہ کا محبوب قول کرتا ہوں کہ تو میری ماں ہے۔ میں جھکی' تعظیم اور احترام سے جھکی' میں نے اپنے بیٹے کا ماتھا چوما اور گود میں اٹھا لیا۔ نرم ونازک اور ملائم بیٹے کو گود میں لیا تو دیکھا کہ پوری کائنات سمٹ کر میری بانہوں میں آ گئی ہے۔ پھر کیا ہوا کہ اچانک میرا خشک سینہ دودھ سے بھر گیا۔ دودھ نے اتنا جوش مارا کہ دودھ ٹپکنا شروع ہو گیا۔ میرے بیٹے نے پیٹ بھر کر دودھ پیا۔ ان کے رضاعی بھائی نے بھی پہلی مرتبہ شکم سیر ہو کر دودھ پیا۔

مائی حلیمہ جب ننھے محبوب ﷺ کو لیکر عازم سفر ہوئیں تو سیدہ آمنہ نے دست دعا دراز کیئے اور بولیں ''اے خدا! اپنے بچے کو تیری حفاظت میں دیتی ہوں۔ ہر قسم کی مصیبتوں' آفتوں' پریشانیوں' بیماریوں سے اسے محفوظ رکھ۔ اے خدا! میرے اس لخت جگر کو نیکی اور بھلائی کا پھیلانے والا بنا دے۔ اے خدا! میری التجا ہے کہ اس بچے پر اپنا سایہ اس طرح ڈال دے کہ تو رب العالمین ہے اور میرا بچہ عالمین کے لیے رحمت بن جائے۔

دائی حلیمہ کہتی ہیں کہ میں نے ننھے محبوب ﷺ کو اپنے شوہر کو دکھایا تو اس نے پھول جیسے مکھڑے پر نظریں گاڑ دیں اور حسن جمال کی اس مرقع اور مرصع تصویر پر فریفتہ ہو گیا۔ کچھ دیر گم سم رہنے کے بعد کہا تو اتنا کہا۔

''حلیمہ! میں نے اتنا خوبصورت بچہ نہیں دیکھا'' حلیمہ گھر پہنچیں تو گھر میں برکتیں داخل ہو گئیں۔ ابر کرم نے خوشی کے آنسو بہا کر اس پوری سرزمین کو سرسبز وشاداب اور گل گلزار بنا دیا۔ وہ دائیاں جنھوں نے مکہ کے دولت مند خاندانوں کے بچوں کو لے کر مال وزر کے خواب دیکھے تھے وہ بھی ابر رحمت کے صدقے میں تشنہ کام نہ رہیں۔ سرسبز وشاداب خنک اور فرحت بخش ہواؤں سے ساری بستی پر کیف نشہ سے جھوم جھوم اٹھی۔

ننھے محبوب ﷺ کی عمر چار برس ہوئی تو اپنے بھائی عبداللہ اور بہن شیما کے ساتھ گھر سے باہر آنے جانے لگے۔ محلے کے قریب ایک جگہ جہاں بھیڑ بکریوں کا باڑہ تھا دو فرشتے آئے اور ننھے محبوب ﷺ کا سینہ مبارک چاک کیا' دل باہر نکالا اور اس میں سے ایک سیاہ رنگ قطرہ خون نکال کر پھینک دیا۔ دل کو دھویا اور دھونے کے بعد سینے کو ہموار کر دیا۔

ننھے محبوب ﷺ کا بھائی روتا ہوا مائی حلیمہ کے پاس پہنچا اور کہا۔

''اماں جلدی چلو! بھائی محمد ﷺ کو دو آدمی قتل کر رہے ہیں۔''

دائی حلیمہ ہانپتی کانپتی وہاں پہنچیں تو دیکھا کہ ننھے محبوب ﷺ کا رنگ پیلا پڑ گیا ہے۔

حلیمہ اور ان کے شوہر نے محبوب ﷺ رب العالمین کو گود میں اٹھا لیا رخسار چومے اور پوچھا۔

''پیارے بیٹے! تمہارے اوپر ہم دونوں جاں نثار ہوں۔ بتاؤ تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے؟''

ننھے محبوب ﷺ نے فرمایا۔

''دو فرشتے آئے۔ انہوں نے میرا پیٹ چاک کیا۔ کوئی چیز ڈھونڈھی اور پیٹ دوبارہ برابر کر کے چلے گئے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔''

نور نبوت کا علم اللہ کے جن بندوں کو عطا ہوا ہے وہ اس کی روحانی تشریح اس طرح کرتے ہیں:

انسان ستر ہزار پرت کا مجموعہ ہے۔ جب اللہ کے قانون کے مطابق کوئی انسان عالم سماوات سے عالم عنصری پر آتا ہے تو اس کے اوپر ایک پرت ایسا غالب آ جاتا ہے جس میں سر کشی' بغاوت' عدم تعمیل' کفران نعمت' ناشکری' جلد بازی' شک' بے یقینی اور وسوسوں کا ہجوم ہوتا ہے۔ یہی وہ ارضی زندگی ہے جس کے بارے میں قرآن پاک کہتا ہے کہ پھر پھینک دیا اسفل سافلین میں۔

انبیاء چونکہ نوع انسان کا جوہر ہوتے ہیں ان کے اوپر اللہ کی خصوصی نعمتیں' عنایتیں اور نوازشیں ہوتی ہیں۔ ان میں ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انبیاء کے دل کو اسفل خامیوں سے

پاک کر کے دنیاوی لالچ اور حرص و طمع سے بے نیاز کر دیا جاتا ہے جس کے نتیجے میں انبیاء کے قلوب ایمان وایقان' علم و دانش' عرفان و آگہی اور انوار الٰہیہ سے منور ہو جاتے ہیں۔ ہدایت' معرفت' عظمت' اخلاص' رحمت' علم و حکمت اور نبوت کے لیے ان کے دلوں کو کشادہ اور وسیع کر دیا جاتا ہے بچپن کے اس واقعہ کو سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک دوسری روایت کے مطابق اس طرح بیان فرمایا ہے۔

''میں دس برس کا تھا کہ میدان میں دو آدمی (ماورائی مخلوق) میرے سر پر آ کھڑے ہوئے۔ ان میں سے ایک نے پوچھا۔

''کیا یہ وہی ہیں؟''

دوسرے سے کہا۔ ''ہاں یہ وہی ہیں۔''

پھر دونوں نے مجھے پیٹھ کے بل بچھاڑ دیا۔ اور میرے پیٹ کو چیرا۔ ان میں سے ایک تو سونے کے طشت میں پانی لاتا رہا اور دوسرا پیٹ کو دھوتا رہا اور پیٹ میں سے جمے ہوئے خون کے دو کالے قطرے نکال ڈالے۔ پھر پیٹ کو برف کے ٹھنڈے پانی سے دھویا۔ اس کے بعد ان میں سے ایک نے کہا۔

''تسکین قلب لاؤ۔''

پھر وہ لا کر میرے سینے پر چھڑک دی اور وہ دونوں مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ میں ڈر گیا اور اپنی رضاعی ماں حلیمہ کے پاس گیا اور ان سے سارا حال بیان کیا۔ وہ ڈر گئیں اور مجھے دعا دی۔ بولیں۔ ''میں تمہیں خدا کی پناہ میں دیتی ہوں۔'' پھر وہ مجھے اونٹ پر بٹھا کر میری ماں کے پاس مکہ لے گئیں۔ میری والدہ یہ سارا واقعہ سن کر نہ تو ڈریں اور نہ گھبرائیں۔ انہوں نے فرمایا۔

''جب یہ میرا بچہ محمد ﷺ پیدا ہوا تو میں نے دیکھا کہ میرے بدن میں سے ایک نور نکلا اور اس سے شام کے محلات روشن ہو گئے۔''

حضرت انسؓ کہتے ہیں:

''حضور اقدس ﷺ لڑکوں کے ساتھ کھیل رہے تھے کہ حضرت جبرائیلؑ آئے اور ان کو

پکڑ کر زمین پر لٹا دیا اور قلب مبارک کو چیرا اور اس کو نکال کر اس میں سے جما ہوا خون الگ کر دیا پھر دل کو طشت میں رکھ کر آب زمزم سے دھو کر اس کو جگہ پر رکھ دیا اور شگاف شدہ جگہ کو سی دیا۔

لڑکے بھاگم بھاگ دائی حلیمہ کے پاس پہنچے اور کہا۔ "محمد ﷺ کو قتل کر دیا گیا" (خاکم بدہن)

لوگ آپ ﷺ کے پاس پہنچے تو چہرے کا رنگ بدلا ہوا تھا۔ دائی حلیمہ کا کلیجہ دھک سے رہ گیا کہ یہ کیا غضب ہوا۔ ان کے شوہر کے اوسان بھی جاتے رہے شوہر نے کہا۔

"بیوی! مجھے ڈر ہے کہ بچے پر ایسا ویسا اثر نہ ہو گیا ہو اس لیے مناسب یہی ہے کہ ہم محمد ﷺ کو ان کے گھر پہنچا دیں۔"

دائی حلیمہ ننھے محبوب ﷺ کو لیکر مکہ پہنچیں، وہاں بھرے بازار اور لوگوں کے ہجوم میں وہ ننھے محبوب ﷺ کو نظروں سے اوجھل کر بیٹھیں۔ کہرام مچ گیا چاروں طرف دوڑتی پھریں۔ کعبے میں آوازیں دیں۔ چیخیں چلائیں، تڑپیں، بے قراری کے عالم میں کونا کونا چھان مارا۔

محبوب ﷺ نہ ملے تو دنیا آنکھوں میں اندھیر ہو گئی۔ آخر تھک ہار کر ان کے دادا کو خبر دی۔ دادا کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی کہ یہ بیٹھے بٹھائے کیا افتاد پڑی۔ پھر انہوں نے ڈھونڈا۔ چاروں طرف آدمی دوڑائے، جب کچھ بس نہ چلا تو کعبے کے پاس جا کر ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ بھیگی آنکھوں سے صدا لگائی۔

"اے دو جہانوں کے مالک، میرے اور میرے باپ دادا کے پروردگار! مجھے میرا محمد ﷺ دے دے۔ اے خدا! ہم پر اپنا فضل و کرم فرما۔ اے خدا! تو نے ہمارے اوپر انعام و اکرام رحمت و شفقت کی بارش برسائی ہے، مجھ سے میرے محمد ﷺ کو جدا نہ کر۔ اے میرے اللہ! تو نے ہی اس کا نام محمد ﷺ رکھا ہے تو نے ہی اس کی تعریف کی ہے۔"

دادا کی خدا کے حضور آہ و زاری قبول ہوئی اور ننھے محبوب ﷺ دادا کو مل گئے۔ دادا جان کی بے قراری کو قرار آ گیا۔ ننھے محبوب ﷺ کو گود میں لے کر پیار کیا اور کندھے پر بٹھا کر کعبے میں چاروں طرف گھومتے جاتے اور دعائیں کرتے جاتے۔ پھر انہیں ان کی ماں آمنہ کے پاس

بھیج دیا۔ سیدہ آمنہ نے اپنے نور نظر ﷺ کو گود میں اٹھا لیا اور گلے لگا کر خوب پیار کیا۔ دائی حلیمہؓ نے بھی محبت سے سرشار ہو کر ننھے محبوب ﷺ کی پیشانی چوم لی۔

نور نبوت ﷺ کے زیر اثر روحانی علم مشاہداتی علم ہے۔ اس علم کی روشنی میں انسان کی تخلیق کے بنیادی عناصر نور اور روشنی سے مرکب ہیں۔ دنیا چھ سمتوں پر قائم ہے۔ یہ چھ سمتیں روشنی اور نور کے ہالے میں بند ہیں۔ چھ سمتیں دراصل تین یونٹ ہیں اور ہر یونٹ کے دو رخ ہیں۔ روشنی مرکب، روشنی مفرد، روشنی مطلق، نور مرکب، نور مفرد اور نور مطلق۔ اسفل زندگی روشنی مرکب ہے اور اس کا مخزن پیٹ میں ناف کے مقام اور سینے میں قلب کی جگہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب ﷺ بندے کے اوپر چونکہ تمام نعمتیں پوری کرنا تھیں اور ان کے اوپر دین کی تکمیل کرنا تھی اس لیے اسی عمر میں جب شعور اسفل زندگی کو سمجھنے کے قابل ہوتا ہے اور اسفل زندگی میں دلچسپی لینا شروع کرتا ہے، اللہ تعالیٰ نے دو فرشتے بھیجے اور ننھے محبوب ﷺ کے اسفل خیالات کے پیٹرن کو خالی کر کے اعلیٰ علیین خیالات سے بھر دیا۔

قرآن کہتا ہے۔

انوار الٰہی کے ذریعے محمد ﷺ کا سینہ مبارک اطمینان اور سکون سے بھر دیا گیا اور اللہ پاک نے سچائیوں، نیکیوں اور پاکیزہ خیالات کو قبول کرنے اور ان پر عمل کرنے کے لیے سرور قلب عطا فرمایا۔ (سورۃ انشراح)

تطہیر قلب و جان اور خاص نگرانی و نگہبانی کے ساتھ ننھے محبوب ﷺ کی پرورش اور تربیت ہوتی رہی۔ دنیا کے نشیب و فراز سے وقوف حاصل کر کے ننھا محبوب سچائی، پاکیزگی اور یقین کے پیکر کی صورت میں جلوہ گر ہوا۔

پاکیزگی اور تقدس کی یہ روشن قندیل محمد ﷺ اپنے دادا حضرت ابراہیمؑ کی طرز فکر کے مطابق اللہ تعالیٰ کی تلاش میں غور و فکر کے لیے غار حرا میں تشریف لے گئے۔

حضرت جبرائیلؑ اللہ کے اس تربیت یافتہ بندے کے پاس آئے اور کہا۔

"پڑھ اپنے رب کے حکم سے۔"

رسول اللہ ﷺ کے حالات زندگی ہمیں اس بات پر تفکر کی دعوت دیتے ہیں کہ ایک نبی ﷺ اور نبیوں میں خاتم الانبیا ﷺ اور باعث تخلیق کائنات ﷺ کی تربیت کا دور بچپن سے شروع ہوا ہے۔ پانچ برس کی عمر میں روح القدس فرشتے کے ذریعے قلب مبارک کی صفائی اس بات کی نشاندہی ہے کہ حضور ﷺ کا ہر امتی اس قانون کا پابند ہے کہ وہ اپنے بچوں کی نگہداشت میں اس قانون کا پابند رہ کر اپنی تطہیر اور پاکیزگی قلب کا اہتمام کرے۔ تاکہ اسفل حواس شعوری زندگی پر غالب نہ آئیں اور بچے کے اندر پیغمبرانہ طرز فکر مستحکم طریقے پر منتقل ہو جائے۔

جب ہم پیغمبرانہ طرز فکر پر غور کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ سورج زمین سے نو کروڑ میل کے فاصلے پر ہے۔ جب کوئی شخص سورج کو دیکھتا ہے تو اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ ہر آدمی کے اندر نو کروڑ میل دور دیکھنے کی صلاحیت موجود ہے۔ خاتم النبیین ﷺ نے پانچ برس کی عمر میں حضرت جبرائیلؑ کو دیکھا۔ پھر غار حرا میں مراقبہ فرمایا اور وہاں حضرت جبرائیلؑ قرآن لیکر نازل ہوئے۔

قرآن پاک کہتا ہے۔ ہم نے قرآن کو لیلۃ القدر میں نازل کیا۔ لیلۃ القدر بہتر ہے ہزار مہینوں سے۔ اترتے ہیں اس میں ملائکہ اور روح اپنے رب کے حکم سے۔ یہ رات رہتی ہے طلوع فجر تک۔
روحانی قانون کے مطابق لیلۃ القدر میں حواس کی رفتار ساٹھ ہزار گنا ہو جاتی ہے اور جب حواس کی رفتار ساٹھ ہزار گنا ہو جاتی ہے تو نظروں کے سامنے فرشتے اور جبرئیل ﷺ آ جاتے ہیں۔
نبی برحق ﷺ کی یہ فضیلت ہے کہ عام انسانی حواس کی رفتار سے حضور نبی مکرم ﷺ کی ذہنی صلاحیت ساٹھ ہزار گنا سے زیادہ ہے۔

آیئے دعا کریں کہ ہمارے اندر بھی نبیوں کی طرز فکر پیدا ہو اور ہم بھی اپنے آقا ﷺ کے نور نبوت سے سرفراز ہو کر اپنی ذہنی رفتار کو تیز کریں تاکہ امتی ہونے کی حیثیت سے ہمیں ہمارے نبی ﷺ کا ورثہ منتقل ہو جائے۔ آمین یارب العالمین۔

☆☆☆

”کرامات اور سائنس“

سوال: پیران پیر حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کی ذات مبارکہ اور ان کی کرامات پر بے شمار تحریریں لکھی جا چکی ہیں مگر آج تک ان کی سائنسی توجیہہ کسی نے بھی نہیں کی۔ عظیمی صاحب آپ اللہ کے خاص فضل و کرم سے علمی بصیرت رکھتے ہیں۔ آپ سائنسی نقطہ نظر سے آج بڑے پیر صاحب کی کرامات کے بارے میں کچھ فرمایئے۔

جواب: قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اس میں کوئی سورت کوئی آیت اور کوئی نقطہ مفہوم اور معانی سے خالی نہیں ہے۔ قرآن پاک میں جن علوم کا تذکرہ ہوا ہے اور انبیاء سے متعلق جتنے بھی واقعات بیان ہوئے ہیں ان میں ہمارے لئے اور تمام بنی نوع انسانی کے لئے ہدایت اور روشنی ہے۔

تفکر کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ قرآن پاک میں کوئی تذکرہ ایسا نہیں کیا گیا جو محض کہانی یا تاریخ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اُس کے پس پردہ نوع انسانی کے لئے ایک لائحہ عمل اور ایک ایسا پروگرام ہے جس میں مخلوق اور خالق کے ربط کی تشریح کی گئی ہے۔
نیز تخلیق کائنات کے فارمولوں سے ہمیں روشناس کرایا گیا ہے۔ تخلیقی فارمولوں کا تجزیہ کیا جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ”علم الکتاب“، تخلیق کے بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے زاویوں پر محیط ہے۔ علم کی تشریح کے لئے دو رخ یا دو طرزیں قائم کی جائیں گی۔
تصوف کی زبان میں ان دو طرزوں کو ”علم حضوری“ اور ”علم حصولی“ کہا جاتا ہے اور علم حضوری اور علم حصولی میں فرق یہ ہے کہ علم حصولی کے دائرہ کار میں جتنی چیزیں وجود میں آتی ہیں وہ وسائل کی پابند ہیں اور ”علم حضوری“ وسائل کی احتیاج سے بے نیاز ہے۔

سائنس کے اس ترقی یافتہ دور میں ان دو طرزوں کے لئے دو اصطلاحیں وضع کی گئی ہیں۔ ایک کا نام ”فکر جدید“ اور دوسری کا نام ”فکر قدیم“ رکھا گیا ہے۔ وہ باتیں جو عقل و شعور کے احاطہ میں آ سکیں۔ آنکھ مظاہراتی طور پر اُن کا ادراک کر سکے اور فہم خدوخال

یا (Dimensions) کے ساتھ اس کے اندر معانی پہنا سکے فکر جدید سے ہم رشتہ ہیں۔ وہ علم جو عقل و شعور کے دائرے میں نہیں آتے اور جن کے رموز و نکات عام طور سے بیان نہیں کئے جا سکتے۔ ''فکر قدیم'' کے دائرۂ عمل میں آتے ہیں۔

آج کی نشست میں حضرت پیران پیر دستگیر، عارف اسرار رموز، شہنشاہ ہفت اقلیم، حامل علم لدنی، ابدال حق، وزیر حضور سیدنا حضرت شیخ عبدالقادر محی الدین جیلانیؒ کے باطنی اور قلبی علوم اور ان علوم کی روشنی میں اُن سے صادر ہونے والی کرامات کو ساوی علوم اور جدید نظریات کے نقطہ نظر سے بیان کرنا ہمارے پیش نظر ہے۔

قرآن پاک میں بیان کیا گیا ہے کہ اللہ کی سنت میں نہ تبدیلی ہوتی ہے اور نہ تعطل واقع ہوتا ہے۔ اس قانون کے تحت ازل سے ابد تک اللہ کی سنت کا جاری رہنا ضروری ہے۔ چوں کہ حضور خاتم النبیین ﷺ پر پیغمبری ختم ہو چکی ہے اس لئے فیضان نبوت کو جاری و ساری رکھنے کے لئے سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وارث اولیاء اللہ کا ایک سلسلہ قائم ہوا۔

آج کے لاسلکی دور میں ٹائم اسپیس کی آہنی دیواریں منہدم ہو گئیں، ذہنی رفتار اتنی بڑھی کہ تین میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کرنے والا شعور ہزاروں میل فی گھنٹہ سفر کرنے کے قابل ہو گیا۔ فاصلے سمٹ گئے۔ آواز ہزاروں میل کو محیط ہو گئی۔ وسائل میں بند اس ترقی کی علمی توجیہہ ہمارے سامنے یہ آئی کہ آواز کے قطر بہت چھوٹے اور بہت بڑے ہوتے ہیں جن کو طول موج (Wave Length) کا نام دیا گیا۔ سائنس دانوں نے اندازہ لگایا ہے کہ آدمی چار سو (۴۰۰) قطر سے نیچے اور ایک ہزار چھ سو قطر سے اوپر کی آوازیں نہیں سن سکتا۔ لیکن یہ آوازیں جب برقی رو کے دوش پر سفر کرتی ہیں تو آدمی کے لئے ان آوازوں کا سننا ممکن ہو جاتا ہے۔ فکر جدید یا سائنس کی اس ترقی کو سامنے رکھ کر ہم جب اپنے اسلاف کی طرف نظر اٹھاتے ہیں تو ہمارے اوپر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ آوازیں برقی رو، آلہ سماعت یا کسی میڈیم (Medium) کے بغیر بھی سنی جا سکتی ہیں۔

حضرت عمرؓ مدینہ منورہ میں خطبہ دے رہے تھے۔ دوران خطبہ بلند آواز میں فرمایا۔

''یا ساریۃ الجبل'' حضرت عمرؓ کے ہونٹوں سے نکلی ہوئی یہ آواز ہزاروں میل دور سنی گئی اور حضرت ساریہ نے اس آواز کا پورا پورا مفہوم سمجھ کر اس پر عمل کیا۔ زمان اور مکان اور ٹائم اسپیس کی نفی کی مثال حضرت سلیمانؑ کے واقعہ میں بھی مذکور ہے۔ حضرت سلیمانؑ نے اپنے درباریوں سے فرمایا۔

''میں چاہتا ہوں کہ ملکہ سبا کے پہنچنے سے پہلے اس کا تخت دربار میں موجود ہو تم میں سے کون اس خدمت کو انجام دے سکتا ہے۔''

عفریت نے جو قوم جنات میں سے ایک فرد تھا، کہا۔

''اس سے پہلے کہ آپ دربار برخاست کریں میں یہ تخت لا سکتا ہوں۔ عفریت کا یہ دعویٰ سن کر ایک انسان جس کے پاس ''کتاب کا علم'' تھا یوں گویا ہوا۔''

''اس سے پہلے کہ آپ کی پلک جھپکے ملکہ سبا کا تخت میں آپ کی خدمت میں پیش کر سکتا ہوں۔''

حضرت سلیمانؑ نے رخ پھیر کر دیکھا تو دربار شاہی میں ملکہ سبا کا تخت موجود تھا۔ غور طلب بات یہ ہے کہ یمن سے بیت المقدس کا فاصلہ تقریباً ۱۵۰۰ میل ہے اور یہ ۱۵۰۰ میل کا فاصلہ پلک جھپکتے طے ہو گیا۔ یہ محض خیالی بات نہیں ہے بلکہ ایک مجسم تخت بغیر کسی وسیلہ کے ایک ملک سے دوسرے ملک میں منتقل ہو گیا۔

حضرت سلیمان کے اس واقعہ میں یہ حکمت پوشیدہ ہے کہ زماں و مکاں کی نفی کا یہ عمل ایک ایسے انسان سے سرزد ہوا جس کے پاس ''کتاب کا علم'' تھا۔

سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا سارا کا سارا علم ''علم الکتاب'' ہے اور یہی علم حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وارث اولیاء اللہ کو منتقل ہوتا ہے اور اسی علم کے ذریعے اُن سے کرامات صادر ہوتی ہیں۔ یہ ایک ایسی سائنس ہے

جو روحانی لوگوں کا ورثہ ہے۔

حضرت شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ علم لدنی یعنی علم الکتاب کے جید عالم ہیں۔ علم

لدنی میں وہ تمام علوم زیر بحث آ جاتے ہیں جن علوم کی بناء پر کائنات کی تخلیق عمل میں آئی ہے۔علم لدنی کائناتی تخلیقی فارمولوں سے مرکب ہے حضرت پیران پیر دستگیر کی کرامات کا تذکرہ صدیوں سے سینہ بسینہ کتاب در کتاب جاری و ساری ہے۔ بے شمار تصنیفات کے لاکھوں صفحات ان کے حالات و واقعات اور کرامات سے بھرے ہوئے ہیں تاہم اب تک ہماری نظر سے کوئی کتاب ایسی نہیں گذری جس میں پیران پیر دستگیر کے مخفی علوم اور کرامات کی علمی توجیہہ بیان کی گئی ہو۔ حالانکہ موجود سائنسی دور میں ان حقائق کا منکشف ہونا ضروری تھا تا کہ فکر جدید کی پیروکار نوجوان نسل دلیل و براھین کے ساتھ پیش کئے گئے ان علوم سے استفادہ حاصل کر سکے۔

اللہ تعالیٰ نے پیران پیر دستگیرؒ کو اپنی رحمت خاص سے تسخیر کائنات کے جو علوم عطا کئے ہیں اُن کا ثبوت خود اُن کے اپنے اقوال و افکار سے ملتا ہے۔ حضرت محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ فرماتے ہیں۔

''میری تلوار مشہور ہے' میرا تیر کمان پر چڑھا ہوا ہے' میرا نیزہ بے خطا ہے' میرا گھوڑا زین کسا ہوا ہے' میں خدا کی روشن آگ ہوں میں حالات سلب کرنے والا ہوں''۔

مزید ارشاد فرماتے ہیں۔

''میں وہ سمندر ہوں جس کا کوئی کنارہ نہیں' میں وقت ہوں اور وقت کی دلیل ہوں' میں محفوظ ہوں اور مامون ہوں کھڑے ہوئے لوگو! پہاڑوں کے رہنے والو! تمہارے پہاڑ ٹوٹ گئے۔ گرجا والو! تمہارے گرجا گر گئے۔ تم خدا کی طرف آؤ میں خدا کے احکام میں سے ہوں۔ راستہ بتانے والے مردو! بہادر! بچو! جو کچھ لینا ہے سمندر سے لے لو۔ اے عزیز! تو اکیلا ہے آسمان پر اور میں اکیلا ہوں زمین پر۔ مجھ سے ایک رات اور ایک دن میں ستر مرتبہ کہا جاتا ہے کہ ہم نے تجھے اپنے لئے پسند کر لیا ہے تا کہ تو ہماری آنکھوں کے سامنے پرورش پائے۔ مجھ سے کہا جاتا ہے۔ تجھے ہمارے حق کی قسم ہے ہمارے حق کی قسم ہے پی! تجھے ہمارے حق کی قسم ہے کلام کر کیوں کہ ہم نے تجھے ہلاکت سے بے خوف کر دیا ہے۔

سیدنا پیران پیرؒ کا یہ ارشاد کہ ہم نے تجھے ہلاکت سے بے خوف کر دیا ہے قرآن پاک کی آیت......

اَلَا اِنَّ اَوْلِيَاءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ٥

اللہ کے دوستوں کو نہ خوف ہوتا ہے اور نہ غم .... کی عملی تشریح ہے۔

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

''اور ہم نے تمہارے لئے مسخر کر دیا جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب کا سب اور ہم نے تمہارے لئے مسخر کر دیا سورج اور چاند اور ستارے۔''

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی پذیرائی میں وزیر حضور سیّدنا عبدالقادر جیلانیؒ جذب و جلال میں فرماتے ہیں۔

''آفتاب مجھے سلام کہتا ہوا طلوع ہوتا ہے۔ سال میرے پاس آتا ہے اور مجھے سلام کرتا ہے اور ان باتوں کی خبر دیتا ہے جو اس سال میں رونما ہوں گی۔''

پیران پیر دستگیرؒ کی تمام کرامات کو سمیٹ لینا تو ممکن نہیں بہر کیف چند نہایت محیر العقول کرامات اور اُن کی علمی توجیہہ بیان کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔

ایک شخص نے خدمت مبارک میں حاضر ہو کر عرض کیا۔ ''یا شیخ! فرزند ارجمند کا خواستگار ہوں۔''

آپ نے فرمایا۔

''میں نے دعا کی ہے خدا تمہیں فرزند عطا کرے گا۔''

اس کے ہاں لڑکے کی بجائے لڑکی پیدا ہوئی تو وہ لڑکی کو لے کر شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ عرض کیا۔ شیخ نے فرمایا تھا لڑکا پیدا ہوگا۔ یہ تو لڑکی ہے۔''

شیخ نے فرمایا۔

''اس کو کپڑے میں لپیٹ کر گھر لے جا اور دیکھ پردہ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔''

گھر میں جا کر دیکھا تو وہ لڑکا تھا۔ اس کرامت کی علمی توجیہہ یہ ہے۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے۔ ومن کل خلقنا زوجین اثنین o
اور ہم نے تخلیق کیا ہر چیز کو جوڑے دوہرے۔

فارمولا یا (Equation) یہ بنی۔ ہر فرد دو پرت سے مرکب ہے۔ ایک پرت ظاہر اور غائب رہتا ہے اور دوسرا پرت مغلوب اور چھپا ہوا رہتا ہے۔ عورت بھی دو رخ سے مرکب ہے اور مرد بھی دو رخ سے مرکب ہے عورت میں ظاہر رخ وہ ہے جو صنف لطیف کے خدوخال میں جلوہ نما ہو کر ہمیں نظر آتا ہے اور باطن رخ وہ ہے جو ہماری ظاہر آنکھوں سے پوشیدہ ہے اسی طرح مرد کا ظاہر رخ وہ ہے جو مرد کے خدوخال میں نظر آتا ہے اور باطن رخ وہ ہے جو ہمیں نظر نہیں آتا۔ اس کی تشریح یہ ہوئی کہ مرد بحیثیت مرد کے جو نظر آتا ہے وہ اس کا ظاہر رخ ہے اور عورت بحیثیت عورت کے جو نظر آتی ہے وہ اس کا ظاہر رخ ہے (Equation) یہ بنی کہ مرد کے ظاہر رخ کا متضاد باطن رخ عورت مرد کے ساتھ لپٹا ہوا ہے اور عورت کے ظاہر رخ کے ساتھ اُس کا متضاد باطن رخ مرد چپکا ہوا ہے۔

آئے دن جنسی تبدیلی کے واقعات ہمارے مشاہدے میں آتے رہتے ہیں۔ اس کی وجہ بھی یہی ہوتی ہے کہ باطن رخ کی تحریکات اتنی زیادہ سریع الاثر اور غالب ہو جاتی ہیں کہ ظاہر رخ کی اپنی تحریکات معطل اور معدوم ہو جاتی ہیں یہ تبدیلی اس طرح واقع ہوتی ہے کہ مرد کے اندر عورت کا باطن رخ غالب ہو جاتا ہے اور ظاہر رخ مرد مغلوب ہو جاتا ہے نتیجہ میں کوئی مرد عورت بن جاتا ہے اور کوئی عورت مرد بن جاتی ہے۔

چونکہ صاحب بصیرت اور صاحب تصرف بزرگ اس قانون کو جانتے ہیں اس لئے تخلیقی فارمولے میں رد و بدل کر سکتے ہیں۔ وزیر حضوری پیران پیر دستگیرؒ عالم علم لدنی ہیں اور انہیں کائنات میں جاری و ساری تخلیقی قانون کا علم حاصل ہے انہوں نے جب لڑکی کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ یہ لڑکا ہے تو دراصل انہوں نے تصرف کر کے لڑکی کے اندر باطن رخ مرد کو غالب کر دیا اور وہ لڑکی سے لڑکا بن گیا۔

ایک روز حضرت شیخ ایک محلّہ سے گذرے۔ ایک عیسائی اور ایک مسلمان دست و گریبان

تھے۔ پوچھا ''کیوں لڑ رہے ہو؟''

مسلمان نے کہا۔ ''یہ کہتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ رسول اللہ ﷺ سے افضل ہیں اور میں کہتا ہوں کہ ہمارے نبی ﷺ سب سے افضل ہیں۔''

حضرت شیخ نے عیسائی سے دریافت کیا۔ ''تم کس دلیل کے ساتھ حضرت عیسیٰؑ کو ہمارے نبی پر فضیلت دیتے ہو؟''

عیسائی نے کہا۔ ''حضرت عیسیٰؑ مردوں کو زندہ کر دیتے تھے۔''

شیخ نے فرمایا۔

''میں نبی نہیں ہوں بلکہ اللہ کے نبی ﷺ کا غلام ہوں۔ اگر میں مردہ زندہ کر دوں تو کیا تم حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لے آؤ گے۔''

عیسائی نے کہا۔ ''بے شک۔''

اس کے بعد دین کو زندہ کرنے والے قادر کے بندے جیلانیؒ نے فرمایا۔

''مجھے کوئی پرانی قبر دکھاؤ تاکہ میں مردہ زندہ کروں اور تمہیں ہمارے نبی ﷺ کی فضیلت ہو۔''

عیسائی انہیں اپنے پرانے قبرستان میں لے گیا اور ایک نہایت پرانی قبر کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''اس قبر سے مردہ کو زندہ کرو۔'' حضرت شیخ نے فرمایا۔

''قبر کے اندر یہ شخص دنیا میں موسیقار تھا۔ اگر تم چاہو تو یہ قبر میں سے گاتا ہوا باہر نکلے۔''

عیسائی نے کہا۔ ''ہاں! میں یہی چاہتا ہوں۔''

حضرت شیخ قبر کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا۔ ''قُمْ بِاذْنِ اللّٰہِ''

قبر پھٹ گئی اور مردہ گاتا ہوا قبر سے باہر آ گیا اور عیسائی حضرت شیخ کی یہ کرامت دیکھ کر مسلمان ہو گیا۔ اس واقعہ کو علمی توجیہہ کے لئے بے شمار صفحات درکار ہیں۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ۔

ہم جس کو آدمی کہتے ہیں وہ گوشت پوست کے پنجر سے بنا ہوا ایک پتلا ہے۔ اس پتلے کی

حیثیت اور اہمیت اسی وقت تک برقرار ہے جب تک کہ پتلے کے اندر روح رہتی ہے۔ روح نکل جائے تو ہم اس کو آدمی نہیں لاش کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

انسان ناقابل تذکرہ شئے تھا۔ ہم نے اس کے اندر اپنی روح پھونک دی اور یہ بولتا' سنتا' دیکھتا' چکھتا اور محسوس کرتا انسان بن گیا۔

روح امر رب ہے۔ سورہ یٰسین میں اللہ تعالیٰ نے امر رب کی تعریف اس طرح کی ہے۔

اس کا امر یہ ہے کہ وہ جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے "ہوجا" اور وہ ہوجاتی ہے۔

"(Equation) یہ بنی۔ آدمی پتلا ہے' پتلا خلا ہے' خلاء میں روح ہے' روح امر رب ہے اور امر رب یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے "ہو" اور وہ چیز مظہر بن جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ کو روح اور تخلیقی فارمولوں کا علم عطا کیا ہے۔ حضرت شیخ نے اس اسرار و رموز الٰہیہ کے فارمولے کو جب نافذ کیا تو مردہ قبر میں سے باہر نکل آیا۔

ایک ولی سے ولایت چھن گئی جس کی وجہ سے لوگ اسے مردود کہنے لگے۔ بے شمار اولیاء اللہ نے اس کا نام لوح محفوظ پر اشقیاء کی فہرست میں لکھا ہوا دیکھا۔ وہ نہایت سراسیمگی اور مایوسی کے عالم میں پیران پیر دستگیرؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور رو رو کر اپنی کیفیت بیان کی۔ حضرت نے اس کے لئے دعا کی۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آواز آئی۔

"اسے میں نے تمہارے سپرد کیا۔ جو چاہے کرو۔"

حضرت نے اسے منہ دھونے کا حکم دیا اور اس کا نام بدبختوں کی فہرست سے دھل گیا۔

اس کی توجیہہ یہ ہے۔

ایک کتاب المبین ہے اور تیس کروڑ لوح محفوظ ہیں۔ ہر لوح محفوظ میں اسی ہزار حزیرے ہیں۔ ہر حزیرے میں تقریباً مستقل اور غیر مستقل ۹ کھرب نظام شمسی کام کرتے ہیں۔ کتاب المبین کے علوم اور اسرار و رموز حضرت شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ کو حضور علیہ الصلوٰۃ

والسلام سے ورثتاً منتقل ہوئے ہیں۔ ایسے وارث' مقدس مطہر او نفوس قدسی حضرات کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وسیلہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور خاص وہ اختیارات تفویض ہوتے ہیں جن کے بارے میں ارشاد ہے۔

"میں اپنے بندہ کو دوست رکھتا ہوں اور میں اُس کے کان' آنکھ اور زبان بن جاتا ہوں پھر وہ میرے ذریعے سنتا ہے' میرے ذریعہ بولتا ہے اور میرے ذریعہ چیزیں پکڑتا ہے۔" سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وارث دربار رسالت مآبؐ میں وزیر حضور کے عہدے پر فائز' ابدال حق شاہ عبدالقادر جیلانیؒ چونکہ اسرار و رموز کے حامل ہیں اس لئے جب انہوں نے کسی ایک بدبخت کو سعادت مند بنانے کے لئے اپنے اختیارات استعمال فرمائے تو وہ بندہ مردود سے مسعود بن گیا۔



”ذات کا عرفان“

سوال: جب ہم دنیا میں اپنی پیدائش کا مقصد تلاش کرتے ہیں تو ہمیں اللہ سے ڈر کی وجہ سے عبادت کرنے کی تلقین ملتی ہے جس کے نتیجہ میں ہمیں جنت دوزخ ملے گی۔ جو شخص بچپن سے عبادت کر رہا ہو وہ بھی جنت کے ملنے پر شک میں پڑا ملتا ہے۔ آپ سے سوال ہے کہ دنیا اور آخرت میں انسان کی کامیابی کا دارومدار کس چیز پر ہے۔

جواب: قسم ہے زمانہ کی انسان خسارہ اور نقصان میں ہے۔ مگر لوگ اس سے مستثنٰی ہیں جو رسالت اور قرآن کی تعلیمات کو اپنا کر اس پر عمل پیرا ہو گئے۔ (قرآن)

آیئے اس آیت کریمہ کی روشنی میں یہ تلاش کریں کہ انسان خسارہ میں کیوں ہے؟ رسالت اور واحدانیت پر ایمان اور یقین رکھنے کی صورت میں وہ نقصان اور خسارہ سے نجات پا جاتا ہے۔

آج کی دنیا جس دور سے گزر رہی ہے وہ سائنس کا دور ہے۔ یہاں ہر بات کو حجت اور دلیل کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ اگر دلائل کے بغیر کوئی بات کہی جائے تو اس کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔

پیش نظر مضمون میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ جو بات بھی کہی جائے موجود دور کی طرز کے مطابق دلائل اور حقائق پر مبنی ہو۔ زمین و آسمان کے فاصلے ناپنے' چاند سورج کی گردش معلوم کرنے اور چاند کو مسخر کرنے کے خواب دیکھنے والی قوم ایک عرصے سے اس کوشش میں ہے کہ زمین کے اوپر اور زیر زمین پھیلے ہوئے وسائل کو زیادہ سے زیادہ استعمال کے قابل بنا دیا جائے بڑے بڑے جہاز' آواز سے تیز رفتار طیارے' دیوہیکل مشین' ریڈیو' ٹیلیویژن' ایٹم اور ہائیڈروجن بم' خلائی سیارے اور اسپیس شپ وغیرہ' یہ سب انہی کوششوں کا نتیجہ ہیں جہاں تک وسائل اور ان کی صلاحیت کے علم کا انکشاف ہوتا ہے۔ وسائل کے پھیلاؤ اور وسائل کی زندگی یا حرکت میں کس حقیقی فارمولے کا عمل دخل ہے۔ اور اس فارمولے کے پیچھے کون سی

طاقت کام کر رہی ہے اور اس طاقت سے کام لینے والی ہستی کون ہے' سائنس اس مقام پر خاموش ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ مادی دور کی اس ترقی میں براہ راست قدرت کی پیدا کردہ اشیاء کا دخل ہے۔ مثلاً لوہا ہماری ہر ترقی میں داخل ہے آپ اسے کسی جگہ نہ پائیں گے ریل کی پٹڑی میں' جہازوں کی تہہ میں مشینوں کے کل پرزوں میں وائرلیس اور خلائی سیاروں میں' اونچی اونچی بلڈنگوں' سائنس کی بے شمار مصنوعات میں مسجدوں' مندروں اور گرجاؤں میں کون سی ایسی جگہ ہے جہاں (کسی نہ کسی صورت میں ہی سہی اس کے وجود سے انکار کیا جا سکتا ہو۔ قرآن پاک کی زبان میں بتایا گیا ہے۔ ”اور ہم نے پیدا کیا لوہے کو بے شمار صلاحیتوں کے ساتھ اور تحقیق اس میں انسانی دنیا کی ترقی کے لئے بڑے امکانات ہیں۔ ہماری ذہنی کاوش ہمیشہ یہ رہی ہے کہ ہم لوہے یا لوہے کی قسم کی دوسری دھاتوں اور ارض پر موجود وسائل سے کس طرح فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ذہن کو جس طرح حرکت دی جاتی رہی۔ ہمارے سامنے فوائد یا نقصان آتے رہے اور ہم نئی سے نئی اختراع کرنے پر قادر ہو گئے مگر انسان نے اس تلاش میں ہمیشہ کوتاہی کی جس ہستی نے وسائل میں اتنی زبردست صلاحیتیں ذخیرہ کی ہیں وہ کون ہے۔ اور ان وسائل کی پیدائش سے اس ہستی کا منشاء اور مقصد کیا ہے؟ ہم نے یہ بھی معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی ان چیزوں کے کار آمد بنانے کی صلاحتیں ہمارے ذہن میں کس طرح اور کہاں سے آتی ہیں؟ ذہن اور وسائل کی صلاحیتوں کا باہمی اشتراک کن خطوط پر قائم ہے؟

ایک طرف خود لوہے کی صلاحیت ہے اور دوسری طرف انسان کے ذہن میں اس صلاحیت سے حسب منشاء فائدہ اٹھانے کی صلاحیت موجود ہے۔

قرآن کریم کا یہ ارشاد کتنا واضح ہے کہ ہم نے لوہے کو بے شمار صلاحیتوں کے ساتھ اس لئے پیدا کیا کہ انسان اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکے اللہ تعالیٰ انسان کی صلاحیت کا تذکرہ فرما کر یہ بتا رہا ہے کہ انسان قدرت کی ودیعت کردہ صلاحیتوں اور قوتوں کو کام میں لانا چاہے تو وہ ہر چیز پر قادر ہو سکتا ہے آیت مقدسہ میں تفکر کے بعد یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے

کہ موجودات میں ہر شے اپنے اندر دو(۲) وصف رکھتی ہے ایک وصف ظاہری اور دوسرا باطنی۔ مثلاً پانی ظاہری طور پر رقیق اور سیال مادہ کی حیثیت رکھتا ہے لیکن اس کی باطنی قوت باوصف اسٹیم ہے جو بڑی سے بڑی مشین کو معمولی جھٹکے کے ساتھ حرکت میں لے آتی ہے کسی بھی درخت کا کوئی بیج باطنی طور پر اپنے اندر بہت بڑا درخت رکھے ہوئے ہے۔ کوئی بھی پھل اور اس کے اندر خوشبو اور ذائقہ۔ کائنات میں کوئی وجود اس وصف سے خالی نہیں ہے۔ اور ہر موجود شے دو اوصاف سے مرکب ہے کوئی بھی شخص جب اپنی ذہنی فکر اور کوششوں سے کسی نئی چیز کو عالم وجود میں لے آتا ہے تو اس کی پہلی اور آخری خواہش یہ ہوتی ہے کہ یہ چیز اس کے تعارف کا سبب بن جائے۔ یہ وصف انسان کو اللہ تعالیٰ سے ملا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ''میں چھپا ہوا خزانہ تھا' میں نے محبت کے ساتھ مخلوق کی تخلیق اس لئے کہ میں پہچانا جاؤں۔ حدیث قدسی۔'' اس فرمان خداوندی کے تحت ہر چیز کو وجود میں لانے والی ہستی کا منشاء اور مقصد یہ ہے کہ کائنات میں جس قدر مصنوعات ہیں وہ اس کے تعارف کا ذریعہ قرار پائیں۔ رسالت کا اقرار اور تعلیم ہمیں اس بات کی طرف متوجہ کرتی ہے کہ انسان اگر اپنے باطنی وصف کے علم کو حاصل کر لے تو وہ موجودت کو وجود میں لانے والی ہستی کو پہچان سکتا ہے۔ جب تک انسان اس مقصد کو پورا نہ کر دے بیشک وہ خسارے اور نقصان میں ہے۔

ذکر کردہ حقائق کی روشنی میں ہمارے لئے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم انسان کے باطنی وصف کی تشریح کریں اور یہ بتائیں کہ باطنی وصف سے مراد کیا چیز ہے اور اس علم کو ہم کیسے حاصل کر سکتے ہیں۔ کسی بھی حقیقت کو پوری طرح اس وقت سمجھا جا سکتا ہے جب کہ اس کی اصل سے واقفیت ہو' اصل سے وقوف اس ہی وقت ممکن ہے جب ہم اس کی جزئیات کا پورا پورا علم رکھتے ہوں۔

یہاں زیر بحث انسان اور اس کا باطنی وصف ہے۔ ذہن کا یہ تجسس فطری ہے کہ انسان کیا ہے۔ دنیا میں آنے سے پہلے کہاں تھا۔ یہاں پہنچنے تک اسے کن منازل سے گزرنا پڑا۔ اور پھر ایک وقت معینہ کے بعد کسی دوسری منزل کی طرف لوٹ جانے پر کیوں مجبور ہے نہ خود

پیدائش پر اس کی اپنی مرضی کا انحصار ہے اور نہ ہی وہ موت پر کسی قسم کی دسترس رکھتا ہے۔ آخر وہ کون سا نظام ہے جس کی گرفت اتنی مضبوط اور مستحکم ہے کہ کائنات کی ہر شے مقید اور محکوم نظر آتی ہے اس کا حل قرآن پاک کی تعلیم میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔ ''کن'' یعنی کسی ہستی نے' فرمایا عالم وجود میں آ جا جیسا کہ ہمارے ارادہ میں ہے۔ ''فیکون' پس وہ کائنات موجود ہو گئی۔ ہمارے سوچے سمجھے پروگرام اور منشاء کے مطابق۔ مگر وہ ہم سے اور ہمارے پروگرام سے بے خبر تھی اور اس پر حیرانی کا عالم طاری تھا۔ جب ہم نے چاہا کہ اس کی (کائنات) حیرانی ختم ہو جائے تو ہم نے فرمایا'' اَلَستُ بِرَبِکُم'' اے موجودات اس بات کا عہد کر کہ میں تیرا رب ہوں۔

''قالو بلٰی'' موجودات یا کائنات اور انسان نے کہا جی ہاں ہم اس بات کا عہد کرتے ہیں کہ آپ ہمارے رب ہیں'' عالم موجودات میں جن نے ربانیت اور وحدانیت کا عہد کر کے اپنے مخلوق ہونے کا اعتراف کیا تھا۔ وہی اصل انسان اور اس کا باطنی وصف ہے اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ انسان ازل میں ہی منشا الہی پورا کرنے کا اقرار اور عہد کر چکا ہے یہ دیکھنے کے لئے کہ انسان اپنے عہد کو کہاں تک پورا کرتا ہے۔ اسے مختلف منازل سے گزر کر باطنی وصف کے ساتھ ایک اور ظاہری وصف (جسم) دے کر اس دنیا میں بھیجا گیا اور ساتھ ہی بے شمار وسائل (مخلوقات) بطور نشانی پھیلا دیئے تا کہ انسان تفکر کے ذریعہ اس بات کو سمجھ سکے کہ جب اس کے استعمال کی کوئی بھی چیز (وسائل) اس قانون سے باہر نہیں ہے کہ ہر شے دو اوصاف سے مرکب ہے تو پھر انسان اس قانون سے مستثنیٰ کیسے ہو سکتا ہے۔ جس طرح درخت کا کوئی بیج اپنے اندر ایک درخت رکھے ہوئے ہے اسی طرح انسان کا یہ مادی جسم اپنے اندر موجود باطنی صلاحیتوں کا تابع ہے جنہیں ہم روح کی صفات سے تعبیر کرتے ہیں۔ روح کی حرکت ہی دراصل انسانی حرکات وسکنات کا سبب بنتی ہے۔ اگر کسی وجہ سے یہ حرکت معطل ہو جائے تو انسان کی کوئی بھی حرکت عمل میں نہیں آئے گی۔ عام مشاہدہ یہ ہے کہ جسم ایک وقت معینہ کے بعد معطل اور بے کار ہو جاتا ہے۔ حالانکہ جسمانی طور پر اس میں کسی قسم کی کوئی

کی واقع نہیں ہوتی۔ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھنے والا ہر فرد جسم کے اس تعطل کو موت کا نام دیتا ہے۔ یعنی یہ کہ جسم کو حرکت دینے والی شئے نے اس جسم سے اپنا رشتہ منقطع کر لیا ہے۔ یہی وہ باطنی رخ یا انسان کا باطنی وصف ہے جس کو ہم روح کہتے ہیں۔

ان حقائق کی روشنی میں ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ پیدائش کے بعد انسان کا تعلق تین نظاموں سے ہے۔ پہلا نظام وہ ہے جہاں اس نے خالق حقیقی کو دیکھ کر اس کے منشاء کو پورا کرنے کا عہد کیا۔ دوسرا نظام وہ ہے جس کو ہم عالم ناسوت' دار العمل یا امتحان گاہ کہتے ہیں۔ اور تیسرا نظام وہ ہے جہاں انسان کو امتحان کی کامیابی یا ناکامی سے باخبر کیا جاتا ہے انسان کی کامیابی کا دارومدار اس پر ہے کہ وہ اپنی ذات اور اس وصف کا عرفان تلاش کر لے جس نے اللہ تعالیٰ کے روبرو اس بات کا عہد کیا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے منشا کو پورا کر کے اللہ تعالیٰ کا عرفان حاصل کر لے گا۔

رسالت و نبوت اس تعلیم کو تصوف یا طریقت کا نام دے کر ہمارے سامنے ان الفاظ میں پیش کرتی ہے من عرف نفسہ 'فقد عرف ربہ'' مقصد حقیقی کو وہی شخص پا سکتا ہے جو اپنی ذات' باطنی رخ یا روح کا عرفان رکھتا ہو۔ ورنہ قرآن پاک کے ارشاد کے مطابق وہ خسارہ اور نقصان میں رہے گا۔

حضرت عبداللہ حنیف کے دو مرید تھے۔ ایک کو احمد کہہ اور دوسرے کو احمد مہہ کہہ کر پکارتے تھے۔ اور احمد کہہ کے حال پر زیادہ شفقت تھی۔ دوسرے مریدان سے حسد کرنے لگے حضرت عبداللہ نے نور فراست سے اُن کے دلوں میں بھرے ہوئے غبار کو دیکھ لیا۔ ایک دن اپنے سب مریدوں کو جمع کر کے اپنے سامنے بٹھا لیا۔ پہلے احمد مہہ (جو بڑا تھا) سے کہا کہ خانقاہ کے دروازے پر اونٹ بیٹھا ہوا ہے۔ اس کو مکان کی چھت پر پہنچائے اس نے کہا حضرت اونٹ جیسا قوی الجثہ جانور مکان کی چھت پر کیسے لے جایا جا سکتا ہے۔ یہ بات تو ناممکن ہے۔ آپ نے فرمایا اچھا بیٹھ جاؤ۔ اتنے میں احمد کہہ آ گیا۔ اس سے بھی حضرت نے یہی بات فرمائی کہ اونٹ کو چھت پر پہنچا دے۔ احمد کہہ آستین چڑھا کر تعمیل حکم میں لگ گیا۔ ہر

چند کوشش کی کہ اونٹ کو گود میں اٹھا کر چھت پر لے جائے۔ مگر وہ کسی طرح اٹھا نہیں سکا حضرت شیخ نے فرمایا۔ کہ بس اب بیٹھ جاؤ۔ پھر سب کو مخاطب کر کے فرمایا کہ آپ سب صاحبان نے دیکھ لیا کہ احمد کہہ کے اوپر میں کس لئے زیادہ شفقت کرتا ہوں۔ اس نے میرے حکم کے امکان یا ممکن ہونے پر غور ہی نہیں کیا اور نہ بحث کر کے باتوں میں وقت ضائع کیا۔ مگر بڑے احمد نے ایسا نہیں کیا۔ آپ سب ایسی بات سے اپنے اپنے باطن کا حال سمجھ لیں۔ یاد رکھیں۔ بارگاہ الٰہی میں تعمیل حکم کی قدر کی جاتی ہے۔ عبادت و ریاضت یا کج بحثی کی اللہ تعالیٰ کو ضرورت نہیں ہے' اور یاد رکھو کہ تعمیل حکم ہی اصل عبادت ہے۔

حضرت منصور حلاج' عاشق الٰہی تھے' ہر وقت سوز و فراق میں مست و بے قرار رہتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ جنید بغدادیؒ کی مجلس میں تشریف لائے۔ اور حضرت جنیدؒ سے کوئی مسئلہ دریافت کیا۔

مگر حضرت جنیدؒ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور فرمایا۔ منصور تم بہت جلد قتل کر دیئے جاؤ گے' حضرت منصور حلاج نے کہا۔ میں اس دن قتل کیا جاؤں گا' جس دن آپ اپنی مسند سے اُتر کر اہل ظاہر کا لباس پہن لیں گے۔ چنانچہ ''انا الحق'' کہنے پر جب آپ کو گرفتار کیا گیا اور علما ظاہر نے فتویٰ پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ خلیفہ وقت نے اس بات پر اصرار کیا کہ آپ کو ہر حال میں فتویٰ پر دستخط کرنا ہوں گے۔ حضرت جنیدؒ نے خانقاہ کی سکونت ترک کر کے علمائے حق (صوفیوں) کا لباس اتار دیا۔ اور مدرسہ میں جا کر علماء ظاہر کا لباس پہن لیا اور فتویٰ پر لکھ دیا کہ ''ہم لوگ ظاہر پر حکم کرتے ہیں۔''

حضرت منصور فرماتے ہیں کہ فقر کے معنی یہ ہیں کہ فقیر ماسوئی اللہ سے بے نیاز ہو جائے اور مخلوق سے قطعاً کوئی توقع نہ رکھے۔

ایک مرتبہ لوگوں نے سوال کیا۔ حضرت یہ فرمایئے کہ دعا افضل ہے یا عبادت۔ فرمایا ان دونوں کا کوئی مقام نہیں ہے۔ عبادت اور دعا کا ہاتھ دامن مراد سے آگے نہیں بڑھتا اور یہ سلوک کی راہ میں سفر کرنے والے کے لئے شرک ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اس لئے یاد کرنا کہ اس

میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی اور مقصد ہو سلوک کے مذہب میں کفر ہے۔

جب آپ کے ہاتھ کاٹ کر جدا کر دیئے گئے تو آپ ہنسے لوگوں نے پوچھا۔ حضرت یہ ہنسی کا کون سا موقع ہے؟ فرمایا۔ آدم کے ہاتھ کاٹ دینا آسان ہے۔ لیکن ایسے لوگ پیدا ہی نہیں ہوئے۔ جو ہمارے صفاتی ہاتھ کو کاٹ دیں۔ اس کے بعد آپ کے پاؤں کاٹ دیئے گئے۔ خندہ پیشانی سے فرمایا۔ ان پاؤں کے علاوہ ہمارے اور پیر بھی ہیں۔ ان کو کاٹو تو جانیں۔

شہادت کے وقت ابلیس لعین آپ کے پاس آیا اور کہا میں نے انا خیرٌ کہا تو طوق لعنت میرے گلے میں ڈال دیا گیا اور آپ نے ''انا الحق'' کی صدا لگائی لیکن آپ کو مقام صدق میں جگہ ملی۔ حضرت منصورؒ نے فرمایا۔ لعین تو نے اپنی طرف سے ''انا'' کا لفظ استعمال کیا اور میں نے خودی کو مٹا کر ''انا الحق'' کہا۔ اس لئے مجھ پر رحمت ہوئی اور تجھ پر ابدالاباد کی لعنت۔

حدیث قدسی:

اس طرز فکر کے بندوں کے لئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ میں اپنے بندے کو دوست رکھتا ہوں۔ اور میں اس کے کان، آنکھ اور زبان بن جاتا ہوں۔ پھر وہ میرے ذریعے سنتا ہے میرے ذریعے بولتا ہے اور میرے ذریعے چیزیں پکڑتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس طرز فکر کو حضرت سلیمان علیہ السلام کے واقعہ میں بھی بیان فرمایا ہے۔ اور جب حضرت سلیمانؑ نے احتساب کیا اڑتے جانوروں کا تو کہا۔ میں ہدہد کو غیر حاضر دیکھ رہا ہوں۔ کیا وہ واقعی غائب ہے۔ اگر وہ غائب ہے تو میں اس پر سخت عذاب کروں گا۔ اس کو ذبح کر دوں گا اگر اس نے اپنی غیر حاضری کی معقول وجہ بیان نہیں کی۔ کچھ ہی دیر بعد ہدہد نے حاضر ہو کر کہا۔ میں ایک ایسی خبر لایا ہوں، جس کا آپ کو علم نہیں ہے۔ اور میں آپ کے پاس سبا سے آیا ہوں۔ میں نے وہاں ایک عورت کو دیکھا ہے۔ جو ملک سبا کی ملکہ ہے اور اس کے پاس سب کچھ ہے۔ اور ایک عظیم الشان تخت ہے وہ اور اس کی قوم اللہ کو چھوڑ کر سورج کی پرستش کرتی ہے، اور شیطان نے ان کو صراط مستقیم سے بھٹکایا ہوا ہے۔ وہ کیوں سجدہ نہیں کرتے اللہ کو، جو نکالتا ہے آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ چیزیں۔ اور جانتا ہے کہ جو تم چھپاتے ہو اور جو

کچھ کرتے ہو۔ اللہ کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ وہ پروردگار ہے عرش عظیم کا۔

سلیمان علیہ السلام نے فرمایا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ تو اپنے قول میں سچا ہے یا جھوٹا ہے۔ جا۔ اور میرا یہ خط ان کی طرف لے جا۔ پھر ان کے پاس سے ہٹ کر دیکھ کہ وہ کیا جواب دیتے ہیں۔ ہُدہُد نے یہ خط ملکہ سبا تک پہنچا دیا۔ ملکہ نے جب یہ خط اپنے پاس دیکھا تو خط کو پڑھ کر اپنے درباریوں سے کہا۔ میرے پاس ایک معزز خط ڈال دیا گیا ہے۔ اور یہ خط سلیمانؑ کی طرف سے ہے۔ اور خط کا مضمون یہ ہے۔

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے الٰہی کا نام رحمٰن ہے اور اسی کی طرف سے رحمتوں کا نزول ہوتا ہے۔ تم کو چاہیے کہ تم میرے مقابلہ میں قوت کا مظاہرہ نہ کرو۔ میری اطاعت قبول کر کے میرے دربار میں حاضر ہو جاؤ۔''

ملکہ نے اپنے درباریوں سے کہا کہ مجھکو اس کام میں مشورہ دو، تمہیں معلوم ہے کہ میں بغیر تمہارے مشورے کے کوئی فیصلہ نہیں کرتی۔ درباریوں نے کہا۔ ہم لوگ بہت قوت والے اور سخت جنگجو ہیں۔ اب آپ سوچ لیجئے کہ آپ کو کیا فیصلہ کرنا ہے۔

ملکہ نے کہا۔ بادشاہ جب کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اس کو تہہ وبالا کر دیتے ہیں۔ اور وہاں کے باعزت لوگوں کو ذلیل وخوار کر دیتے ہیں۔ اور یہی سب تمہارے ساتھ ہوگا، اور میں سلیمانؑ کو تحفہ بھیجتی ہوں۔ پھر دیکھتی ہوں کہ قاصد کیا جواب لے کر واپس آتے ہیں۔ جب قاصد حضرت سلیمانؑ کے پاس پہنچے تو سلیمان نے کہا۔ کیا تم مال ودولت سے مجھے مرعوب کرنا چاہتے ہو؟ جو اللہ نے مجھ کو دیا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ بہتر ہے جو تم کو دیا ہے۔ نہیں۔ میں یہ تحفہ قبول نہیں کرتا۔ تمہیں تمہارا تحفہ مبارک ہو۔ واپس جاؤ اور جا کر اپنی ملکہ کو یہ بتا دو کہ ہم ایسے زبردست لشکر کے ساتھ پہنچ رہے ہیں۔ جس کے سامنے تم نہیں ٹھہر سکو گے اور تمہارے ملک کو تخت وتاراج کرنے کے بعد تم کو وہاں سے ذلیل وخوار کر کے نکال دیں گے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے درباریوں کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ''تم میں سے کوئی ایسا ہے جو ملکہ سبا کا تخت میرے پاس لے آئے اس سے پہلے کہ وہ حکم بردار ہو کر میرے

سامنے حاضر ہوں۔ جنات میں سے ایک شخص عفریت نے عرض کیا کہ میں اس پر قدرت رکھتا ہوں کہ اس سے پہلے کہ آپ دربار برخاست کریں میں تخت کو بحفاظت حاضر کردوں گا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار میں انسانوں میں سے ایک شخص نے کہا۔ ’’میرے پاس ’’علم الکتاب ہے جس کے تحت اس بات پر قدرت رکھتا ہوں کہ وہ تخت حاضر کردوں‘ اس سے پہلے کہ آپ کی پلک جھپکے۔ اب جو سلیمان علیہ السلام نے دیکھا تو تخت کو اپنے پاس موجود پایا۔ حاضرین مجلس کی حیرانی کو دیکھ کر اس اللہ کے بندہ نے کہا کہ ’’یہ علم الکتاب‘‘ مجھے میرے رب کے فضل و کرم سے ملا ہے‘ اور میرے رب نے یہ علم مجھے اس لئے عطا کیا ہے کہ چاہے میں اس کو استعمال کروں اور چاہے استعمال نہ کروں اور جو کوئی اس علم کو استعمال کرتا ہے اپنے لئے کرتا ہے اور جو استعمال نہیں کرتا اپنے لئے نہیں کرتا اللہ تعالیٰ اس سے ماوراء ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے میں ایک بندہ کا تذکرہ ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس بندہ کی طرز فکر کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں۔

بندہ کہتا ہے۔ میرے پاس کتاب کا علم ہے۔ میں اس علم کے ذریعے اس سے پہلے کہ آپ کی پلک جھپکے تخت کو آپ کے پاس لے آؤں گا۔ عفریت بھی یہی کہتا ہے کہ میں اس سے پہلے کہ آپ دربار برخاست کریں میں تخت کو حاضر کردوں گا اس واقعہ میں بہت ہی لطیف نکتہ پوشیدہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ جن اور انسان کے درمیان یہ فرق ہے کہ جن خود کو وقت کے ساتھ پابند کئے ہوئے ہے لیکن بندہ نے وقت کی نفی کردی ہے بندہ کا ذہن آزاد اور لامحدود وسعتوں کا مالک ہے اس لئے کہ وہ اس علم کو جانتا ہے جس کا نام ’’روح‘‘ ہے۔ یہ بندہ کتاب کے اس علم کو جانتا ہے کہ بشر پتلہ ہے‘ پتلہ خلا ہے۔ خلا یا بشر میں اللہ کی روح ہے۔ روح اللہ کا امر ہے اور اللہ کا امر یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کو کرنے کا ارادہ کرتا تو کہتا ہے۔ ہو جا‘‘ اور وہ ہو جاتی ہے۔

طرز تکوین کے اس بندہ کے ذہن میں یہ بات راسخ ہوتی ہے کہ صرف یہ کافی نہیں ہے کہ انسان اللہ کی راہ میں قدم اٹھائے اور کام پورا ہو جائے۔

یہاں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ یہ قدم صرف اللہ کے لیئے اٹھایا گیا ہے یا اور بھی مصلحتیں شامل ہیں۔ اس میں جنت بھی ایک مصلحت ہے اور بہت سی نیکیاں بھی مصلحت ہیں اللہ تعالیٰ کسی کو اس وقت تک نہیں پہچانتا‘ جب تک مقصد صرف اللہ کی ذات نہ ہو۔ اگر ایک آدمی کا مقصد جنت ہے تو جنت اس کو جانتی ہے۔ کہتی ہے آؤ‘ لبیک۔ اگر ایک آدمی کا مقصد دنیا ہے تو دُنیا اسے جانتی ہے۔ کہتی ہے آؤ‘ لبیک۔ اللہ کے ساتھ‘ اللہ کے علاوہ‘ کوئی دوسرا مقصد یا کوئی دوسری غایت شریک کرنا کفر ہے۔

حضرت رابعہ بصریؒ سے یہ واقعہ منسوب ہے کہ لوگوں نے انہیں دیکھا کہ ایک ہاتھ میں آگ اور ایک ہاتھ میں پانی لیئے ہوئے دوڑی چلی جا رہی ہیں۔ لوگوں نے پوچھا یہ کیا ہو رہا ہے آپ کہاں دوڑی جا رہی ہیں؟ حضرت رابعہ بصریؒ نے فرمایا۔ میں آگ سے جنت کو جلا دوں گی اور پانی سے دوزخ کو بجھا دوں گی۔ تا کہ لوگ اللہ کی پرستش کریں جس کو دیکھو جنت کی خواہش اور دوزخ کے خوف سے اللہ کو یاد کرتا ہے۔ کوئی نہیں ہے جو اللہ کو اللہ کے لئے یاد کرے۔

موسم بہار میں حضرت رابعہ بصری سے خادمہ نے عرض کیا۔ مکان سے باہر آیئے اور خالق کائنات کی صناعی اور قدرت کا ملاحظہ کیجئے۔ آپ نے فرمایا۔ تو اندر کیوں نہیں آجاتی کہ خود خالق حقیقی کو دیکھ لے‘ اور فرمایا میرا کام صنعت کو دیکھنے کا نہیں ہے میں خالق کو دیکھتی ہوں۔

آپ سے لوگوں نے سوال کیا! آپ جس ہستی کی پرستش کرتی ہیں کیا آپ اس کو دیکھتی بھی ہیں؟ فرمایا اگر میں نہ دیکھتی تو پرستش کیسے کرسکتی تھی۔

چند بزرگوں کی ایک جماعت حضرت رابعہ بصریؒ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ ایک بزرگ سے آپ نے پوچھا‘ تم خدا کی عبادت کس لئے کرتے ہو؟ اس بزرگ نے کہا۔ دوزخ کے سات طبق نہایت عظیم ہیں۔ ہر ایک کو اس کے اوپر سے گذرنا پڑے گا۔ خوف کی وجہ سے مجبوراً خدا کی پرستش کرتا ہوں کہ اس نے جنت دینے کا وعدہ کیا ہے۔ حضرت رابعہ بصری نے فرمایا۔ وہ بندہ بدترین بندہ ہے‘ جو کسی خوف یا طمع کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے۔ ان لوگوں

نے پوچھا آپ عبادت کیوں کرتی ہیں۔ کیا آپ اللہ تعالیٰ سے کوئی امید نہیں رکھتیں۔

فرمایا۔ دوزخ اور بہشت کا ہونا ہمارے نزدیک یکساں ہے۔ ہمارے لئے یہی کافی ہے کہ ہمیں عبادت کا حکم دیا گیا ہے۔

حضرت رابعہ بصری کے یہ واقعات بھی اصحاب تکوین کی طرز فکر کے آئینہ دار ہیں۔

من عرف نفسہ، فقد عرف ربہ، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے۔ جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا، پس تحقیق اُس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔

اپنا عرفان رکھنے والا شخص ہی خالق کائنات کا عرفان حاصل کرسکتا ہے۔

☆☆☆

باب ہفتم

''خواب میں مستقبل کا انکشاف ہوتا ہے''

سوال: انسان اپنی زندگی کا بہت سا حصہ سو کر گزارتا ہے۔ سونے کے دوران وہ خواب بھی دیکھتا ہے۔ یہ خواب کیا ہیں۔ کیا ان کی انسانی زندگی میں کوئی حقیقت ہے۔ انسان کے لیے یہ کیا معنی رکھتے ہیں۔

جواب: خواب ہماری زندگی کا حصہ ہے جو ہمیں یہ بتاتا ہے کہ انسان کے اندر ایسے حواس بھی کام کرتے ہیں جن کے ذریعے انسان کے اوپر غیب کا انکشاف ہو جاتا ہے۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ ''ہم ادھیڑ لیتے ہیں رات پر سے دن کو۔'' (سورہ یٰسین)

آیت مقدسہ کی روشنی میں ہمارے اندر کام کرنے والے دونوں حواس (بیداری کے حواس اور خواب کے حواس) ایک دوسرے کے ساتھ چپکے ہوئے ہیں بالکل اس طرح جیسے ایک ورق میں دو صفحے چپکے ہوئے ہوتے ہیں الگ الگ ہونے کے باوجود ورق ایک ہی رہتا ہے دونوں صفحے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر یک جان ہوگئے ہیں۔

انسان کے اندر کام کرنے والے حواس اس کی نوعیت بھی ورق کی طرح ہے ورق کا ایک صفحہ بیداری ہے اور دوسرا صفحہ خواب ہے دونوں صفحوں پر ایک ہی عبارت لکھی ہوئی ہے۔ صرف زاویۂ نظر کا فرق ہے نظر ایک صفحہ پر تحریر کو زیادہ روشن اور واضح رکھتی ہے اور دوسرے صفحہ کی عبارت کو دھندلا اور غیر واضح دیکھتی ہے روشن اور واضح دیکھنے کی حالت میں نظر ذہن کو عبارت کے مفہوم سے باخبر کر دیتی ہے اور جب نظر اس عبارت کو دھندلا اور غیر واضح دیکھتی ہے تو ذہن اس عبارت کے مفہوم سے قاصر رہتا ہے یعنی اس میں کوئی معانی نہیں پہنا سکتا۔ چونکہ ورق کے دوسرے صفحہ (خواب کے حواس) کی عبارت، بیداری میں کام کرنے والی نظر

کے لئے دھندلی ہے اس لئے اس میں زیادہ غور اور فکر کی ضرورت پیش آتی ہے جب فکر اس عبارت کے اندر مرکوز ہو جاتی ہے تو انسان عبارت کی معنویت میں حقیقت کو تلاش کر لیتا ہے۔

عرض یہ کرنا ہے کہ ورق کے ایک صفحہ کی عبارت کو جو بظاہر روشن ہے ہم سرسری طور پر پڑھ کر کوئی نہ کوئی معنی پہنا لیتے ہیں جس میں حقیقت کا پہلو نظر انداز ہو جاتا ہے اور ورق کے دوسرے صفحہ کی عبارت میں (جو بہت غور اور فکر کے بعد مطالعہ کی جاتی ہے) حقیقت کے چھپے ہوئے پہلو نمایاں ہو جاتے ہیں جس کو ہم خواب دیکھنا کہتے ہیں وہ دراصل ورق کے دوسرے صفحہ کی وہ عبارت ہے جو بیداری کے حواس کی گرفت میں نہیں آتی۔

انسان کے اندر کام کرنے والے حواس، بیداری کے ہوں یا خواب کے۔ غیب سے براہ راست ایک ربط رکھتے ہیں کیونکہ ایک ہی عبارت الگ الگ دو صفحوں پر تحریر ہے اس لئے اس کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ انسان نے اپنی نادانی کی وجہ سے ایک حصہ کا نام ظاہر اور دوسرے حصہ کا نام غیب رکھ لیا ہے فی الواقع یہ طرز فکر اللہ تعالیٰ کے بیان کردہ قانون کے خلاف ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

ہم نکالتے ہیں رات کو دن سے اور نکالتے ہیں دن کو رات سے۔ اور داخل کرتے ہیں رات کو دن میں اور داخل کرتے ہیں دن کو رات میں۔ یعنی رات اور دن کے حواس ایک ہی ہیں۔ فرق یہ ہے کہ ہم نے ان دو حواسوں میں سے ایک حواس کو اپنے اوپر مسلط کیا ہوا ہے چونکہ یہ تسلط خود ہمارا اختیار کردہ ہے اس لئے ہم نے اس پابندی میں مقید ہو کر خود کو پابند کر لیا ہے اور اس پابندی نے ہمیں اسپیس (Space) اور ٹائم (Time) کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔

خواب یا خواب کے حواس میں ہم اسپیس اور ٹائم کے ہاتھ میں کھلونا نہیں ہیں بلکہ ٹائم اور اسپیس ہمارے لئے بنی ہوئی ہے۔

تاریخ کے صفحات میں ایسے کتنے ہی خوابوں کا تذکرہ ملتا ہے جو مستقبل کے آئینہ دار ہیں ان خوابوں میں خواب دیکھنے والے کے مستقبل کا انکشاف ہی نہیں ہوتا بلکہ بعض اوقات یہ

خواب پورے معاشرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

سورۂ یوسف میں مستقبل کے آئینہ دار خوابوں کا ذکر آیا ہے۔ یوسف نے کہا اے میرے باپ میں نے خواب دیکھا ہے کہ گیارہ ستارے ہیں اور سورج اور چاند۔ میں نے دیکھا کہ یہ سب مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔

حضرت یوسف کے والد حضرت یعقوب نے فرمایا۔

میرے بیٹے جس طرح تو نے دیکھا ہے کہ گیارہ ستارے اور سورج اور چاند تیرے آگے جھکے ہیں اس طرح تیرا پروردگار تجھے برگزیدہ کرنے والا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے والد نے جنہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بصیرت عطا ہوئی تھی۔ اپنے لخت جگر کو یہ بھی کہا کہ اس خواب کو اپنے بھائیوں کو نہ بتانا۔ (قرآن)

حضرت یعقوب علیہ السلام نے اس خواب میں موجود حضرت یوسف علیہ السلام کے مستقبل کو دیکھ لیا تھا یہی وجہ ہے کہ انہوں نے جگر گوشہ کو ہدایت فرمائی کہ اپنے بھائیوں سے اس خواب کا ذکر نہ کرنا۔ خواب کی تعبیر میں یہ بات ان کے سامنے آ گئی تھی کہ یوسف علیہ السلام کے بھائی ان کی جان کے دشمن ہو جائیں گے۔

اس طرح جب حضرت یوسف علیہ السلام زندان مصر میں قید تھے قیدیوں نے جن میں ایک بادشاہ کا ساقی تھا اور دوسرا باروچی تھی۔ اور وہ بادشاہ کو زہر سے ہلاک کرنے کی سازش میں پکڑے گئے تھے حضرت یوسف کو اپنے اپنے خواب سنائے۔

ایک نے بتایا میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں انگور نچوڑ رہا ہوں۔ دوسرے نے کہا میں نے دیکھا ہے کہ سر پر روٹی اٹھائے ہوئے ہوں اور پرندے اسے کھا رہے ہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے اس خواب کی تعبیر میں فرمایا۔ انگور نچوڑنے والا بری ہو جائے گا اور اسے پھر ساقی گری سونپ دی جائے گی اور دوسرا سولی پر چڑھایا جائے گا اور اس کا گوشت مردار جانور کھائیں گے۔

قرآن پاک میں بیان کردہ چوتھا خواب بادشاہ مصر کا ہے بادشاہ نے تمام درباریوں کو

جمع کر کے کہا۔ میں نے خواب دیکھا ہے کہ سات موٹی تازی گائیں ہیں انہیں سات دبلی گائیں نگل رہی ہیں اور سات بالیں ہری ہیں اور سات دوسری سوکھی۔

بادشاہ کے دربار میں ماہرین خواب نے اس خواب کو بادشاہ کی پریشان خیالی کا مظہر قرار دیا۔ لیکن حضرت یوسف علیہ السلام نے اس خواب کی تعبیر یہ بتائی کہ سات برس تک تم لگا تار کھیتی کرتے رہو گے ان سات برسوں میں غلے کی خوب فروانی ہوگی اور اس کے بعد سات برس بہت سخت مصیبت کے آئیں گے اور سخت قحط پڑ جائے گا ایک دانہ بھی باہر سے نہیں آئے گا ان سات سالوں میں وہی غلہ کام آئے گا جو پہلے سات سالوں میں ذخیرہ رکھا ہوگا۔

غور طلب بات یہ ہے کہ قرآن پاک میں بیان شدہ خوابوں میں ایک خواب پیغمبر کا ہے اور تین خواب عام انسانوں کے ہیں۔

انجیل میں حضرت یعقوب علیہ السلام کے خواب کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے۔

''اور خدا نے رات کو خواب میں اسرائیل سے باتیں کیں اور کہا اے یعقوب۔ اے یعقوب' اس نے جواب دیا۔ میں حاضر ہوں۔

اس نے کہا۔ میں خدا تیرے باپ کا خدا ہوں۔ مصر جانے سے نہ ڈر کیونکہ میں وہاں تجھ سے ایک بڑی قوم پیدا کروں گا۔ میں تیرے ساتھ مصر کو جاؤں گا۔ (یعنی میری نگہبانی تیرے ساتھ ہے) اور پھر تجھے ضرور لوٹا بھی لاؤں گا اور یوسف اپنا ہاتھ تیری آنکھوں پر لگائے گا۔

تاریخ شاہد ہے کہ حالات و واقعات اسی طرح پیش آئے جس طرح خوابوں میں نشاندہی کی گئی تھی۔

خلیفہ ہارون رشید کی ملکہ زبیدہ کا خواب بھی قابل غور ہے ملکہ زبیدہ نے اپنے بیٹے امین الرشید کی پیدائش کی رات خواب دیکھا کہ چار عورتوں نے امین الرشید کو کفن میں لپیٹنا شروع کر دیا ہے۔ لپیٹتے وقت ایک عورت نے دوسری عورت سے کہا' کم عمر' تنگ دل بدخو بادشاہ دوسری

نے کہا' بدچلن' ظالم' ناسمجھ اور فضول خرچ فرماں روا۔''

تیسری نے کہا۔ گنہگار۔ بے وفا۔ کم عقل اور ناتجربہ کار حکمران۔''

چوتھی نے کہا۔ دھوکہ باز۔ عیاش اور مغرور تاجدار۔

تاریخ بتاتی ہے کہ خواب کا ایک ایک لفظ درست ثابت ہوا۔ اس خواب سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اگر ذہن بیداری کی طرح خواب میں بھی معنویت اور مفہوم کی طرف متوجہ رہے تو خواب اور خواب کی تعبیر ساتھ ہی ساتھ ذہن نشین ہو جاتی ہے۔

خوابوں میں پیشین گوئیاں:

علامہ اقبال کی پیدائش سے قبل ان کے والد نے بھی خواب دیکھا تھا۔

خواب دیکھا کہ ایک بہت بڑا میدان ہے اس میں لوگوں کا ہجوم ہے فضا میں رنگا رنگ پروں والا ایک نہایت خوبصورت پرندہ اڑ رہا ہے لوگ دیوانہ وار اپنے ہاتھ بڑھا کر اس پرندے کو حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ علامہ اقبال کے والد بھی اسی ہجوم میں شریک ہیں وہ پرندہ باوجود جدوجہد کے ہجوم میں سے کسی صاحب کے ہاتھ نہیں آتا۔ اور ایک دم فضا سے اتر کر علامہ اقبال کے والد صاحب کی گود میں خود بخود آ گرا اور انہوں نے اسے پکڑ لیا۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ کی ولادت سے پہلے ان کے والد نے خواب دیکھا کہ تمام دنیا میں اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ سور اور بندر لوگوں کو ہلاک کر رہے ہیں یکا یک مجدد صاحب کے والد کے سینہ سے ایک نور نکلا اور اس میں سے ایک تخت ظاہر ہوا۔ اس تخت پر ایک شخص تکیہ لگائے بیٹھا ہے جس کے سامنے ظالموں اور ملحدوں کو ذبح کیا جا رہا ہے اور کوئی شخص بلند آواز سے پکار رہا ہے۔ ''جاء الحق و زھق الباطل ان الباطل کان زھوقا۔ (حق آیا اور باطل مٹ گیا اور باطل کے مقدر میں مٹ جانا ہی ہے) تعبیر یہ بتائی گئی کہ تمہارے ایک لڑکا ہوگا اور اس کے ذریعے حق کا بول بالا ہوگا اور کفر والحاد کا خاتمہ ہو جائے گا۔

تاج الاولیاء حضرت بابا تاج الدین ناگپوریؒ کی والدہ ماجدہ نے حضرت بابا تاج الدین کی پیدائش سے قبل خواب دیکھا کہ ایک ایسا میدان ہے جس کی وسعت کا اندازہ ممکن نہیں۔ اس میدان کے اندر ہزاروں شہر آباد ہیں اور ان شہروں میں ہر مذہب وملت کے لوگ رہتے ہیں۔ سردی کا موسم ہے چودھویں رات ہے چاندنی ہر سمت پھیلی ہوئی ہے ہر شخص چاندنی کے حسن میں سرشار اور پرکیف ہے حضرت کی والدہ نے دیکھا کہ چاند آسمان سے ٹوٹ کر ان کی گود میں آ گیا اور اس چاند کی کرنیں پورے عالم کو منور کر رہی ہیں۔

مندرجہ بالا خواب ہمیں اس حقیقت میں تفکر کی دعوت دیتے ہیں کہ خواب ہماری زندگی کا اسی طرح حصہ ہے جس طرح بیداری ہے۔ ہمارا مشاہدہ ہے کہ انسان جس طرح سونے پر مجبور ہے بالکل اسی طرح جاگنے اور بیدار رہنے پر بھی مجبور ہے۔



”میری ڈائری“

سوال: اللہ تعالیٰ سے قربت کا احساس ہوتا ہے۔ مگر درمیان میں حجاب حائل ہوتا ہے۔ بعض اوقات ادراک میں یہ بات سما جاتی ہے۔ کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کو چھو لیا ہے۔ یا اللہ تعالیٰ نے سجدہ کی حالت میں اپنا پائے مبارک ہمارے سر پر رکھ دیا ہے۔ فکر کے بعد نتیجہ ہمیشہ یہی نکلتا ہے کہ ہمارے اللہ تعالیٰ کے درمیان حجاب قائم ہے۔

پائے مبارک کے بارے میں صرف ادراک کام کرتا ہے۔ لیکن ہم اسکو کیوں بیان نہیں کر سکتے۔ کہ اللہ تعالیٰ کے پیر مبارک اسطرح کے تھے۔

جواب: ہوتا یہ ہے۔ کہ ادراک میں یہ بات آ جاتی ہے کہ حجاب کے پیچھے اللہ تعالیٰ تشریف فرما ہیں۔ ذوق عبدیت بندہ کو سجدہ کی حالت میں لے آتا ہے۔

اب ادراک میں یہ بات آتی ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے عبدیت کو قبول فرما لیا ہے بندہ کے سر پر پائے مبارک رکھ کر قبولیت کا اظہار کر رہے ہیں۔

عرش و کرسی پر اللہ تعالیٰ کا دیدار کسی نہ کسی طرح خدوخال میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ لیکن حتمی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اللہ تعالیٰ کی ایسی شکل وصورت ہے۔ صرف اشاریہ کنایہ میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

ہم یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ عرش پر اللہ تعالیٰ تشریف فرما ہیں۔ بصارت کا ادراک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک نور ہیں۔ ہم نے اللہ تعالیٰ کا ہاتھ دیکھا۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہنا پڑے گا۔ صرف ہاتھ دیکھا۔ پورا جسم نہیں دیکھا۔

عرش پر ایک ہستی تشریف فرما ہے۔ اس ہستی کے خدوخال کیا ہیں۔ اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ایک ہستی تشریف فرما ہے جو اللہ ہے۔ مگر اس ہستی اقدس نے ایک واقعہ سے اپنا سراپا چھپایا ہوا ہے۔

ہم نے اللہ تعالیٰ کی آنکھ کا مشاہدہ کیا۔ اگر یہ سوال کیا جائے۔ کیا اللہ تعالیٰ کی اس طرح

کی آنکھیں ہوتی ہیں۔ جس طرح انسان کی ہوتی ہیں۔ تو جواب یہ ہوگا کہ صرف آنکھ دیکھی ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے۔ کہ اللہ تعالیٰ کے چہرہ پر دو آنکھیں ہیں اور اس طرح کی ہیں۔

آج مراقبہ میں دیکھا کہ میرے اندر کائنات کی BASE تسلسل کے ساتھ آ رہی ہے۔ اور میرے اندر کائنات تخلیق ہو رہی ہے۔

ذوچین الشّین (مثلث) کے دونوں رخ میرے اندر ہیں۔ اور ان مثلث کو ایک دائرے نے محیط کر رکھا ہے۔

مثلث کے نور کی صورت میں نور کی ہر تعبیر کسی انقطاع کے گر رہی ہے۔ جیسے ہی وہ مثلث سے آ کر ٹکراتی ہے۔ مثلث کے اندر بکھر جاتی ہے۔ اور اس کا بکھرنا ہی کائنات ہے۔

اسکی مثال سنیما سے دی جاسکتی ہے۔ مشین سے ایک رو لہروں کی صورت میں نزول کرتی ہے اور وہ لہریں اسکرین سے ٹکراتی ہیں۔ جیسے ہی ٹکرانا وقوع پذیر ہوتا ہے۔ پردہ پر مختلف شکلیں نمودار ہو جاتی ہیں۔

یہی صورت انسان کے اندر جاری وساری ہے۔ مصدقہ اطلاعات یا عالم امر سے ایک رو چلتی ہے۔ اور انسان کے اندر (مثلث) اسکرین پر آ کر ٹوٹتی اور بکھر جاتی ہے۔ بکھرنے کے ساتھ ہی وہ سب لہریں شکل ہو جاتی ہیں۔ اور رو کے اندر پوری کائنات پوشیدہ ہے۔

اس رو میں انسان، جنات فرشتے تمام اجرام سماوی عرش کرسی اور حجابات سب کچھ ہیں۔

صرف اللہ تعالے کی ذات اس رو سے ماورا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا وجود بالکل الگ ایک ہستی ہے۔

حجابات تک اس رو اور مثلث میں مشاہدہ ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی صفات بھی اس رو اور مثلث میں مشاہدہ ہوتی ہیں۔ لیکن ذات باری تعالیٰ اس رو اور مثلث سے ماورا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس (DIMENSION) اور خدوخال سے ماورا ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ کی ہستی کو شکل وصورت اور خدوخال میں محدود نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ کی ہستی کا ادراک ضرور کر سکتے ہیں۔

"مراقبہ کی تعریف"

سوال: مراقبہ کیا ہے۔ اُس کا کرنا کیوں ضروری ہے اور اس کے کرنے سے انسان میں کیا تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ نیز مراقبہ میں واردات و کیفیات کا نزول کس طرح ہوتا ہے۔

جواب: مراقبہ ایک ایسی حالت کا نام ہے جس میں انسانی شعور آہستہ آہستہ لاشعوری واردات و کیفیات سے مغلوب ہو جاتا ہے اور لاشعور (روح کا شعور) متحرک ہو جاتا ہے۔ مختلف سلسلوں میں مختلف مشقوں کے ذریعہ اس حالت کو بیدار کیا جاتا ہے مقصد سب سلسلوں کا ایک ہی ہے وہ یہ کہ ارادہ کے ساتھ نیت بھی کام کرے اس لئے کہ بغیر نیت کے ارادہ میں حرکت پیدا نہیں ہوتی۔

مراقبہ ایک ایسی کیفیت ہے جس میں زمان ومکان کی حد بندیاں نہیں ہیں زمان ومکان کی حد بندیاں انسانی ارادے اور نیت میں خلل پیدا کرتی ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہماری زندگی میں حد بندیاں کن حالات میں زیادہ اور شدید ہوتی ہیں اور وہ کونسی صورت ہے جس میں ہم ان حد بندیوں سے آزاد ہوتے ہیں۔

انسانی زندگی دو حصوں پر منقسم ہے۔ ایک حصہ بیداری ہے اور دوسرا حصہ خواب۔ بیداری میں انسان زمان ومکاں کی پابند ہے لیکن خواب میں انسان ان سے آزاد ہو جاتا ہے بالفاظ دیگر جاگتے انسان کی نسبت سوتے انسان میں صلاحیتیں زیادہ بیدار ہوتی ہیں۔ مراقبہ کے ذریعہ خواب میں زمان ومکان سے آزاد کام کرنے والی صلاحیتیں بیداری میں منتقل ہو جاتی ہیں۔ سب سے پہلے مراقبہ میں اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ انسان کے اوپر بیدار رہنے کی حالت میں ایسی کیفیت طاری ہو جائے جو خواب سے قریب ترین ہے۔ اس کا طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ انسان اپنی نیت اور ارادے سے بیداری میں اپنے اوپر خواب کی زندگی طاری کر لے مثلاً یہ کہ۔

اندھیرا ہو۔ آنکھیں بند ہوں۔ جسم ڈھیلا ہو۔ شعور بیداری کی جکڑ بندیوں سے آزاد

ہواور لاشعوری کیفیات کو قبول کرتا ہوں۔ ذہن کسی ایک نقطہ پر مرکوز کر لیا جائے جو بظاہر سامنے نہیں ہے یہ مشق آہستہ آہستہ انسان کو اس مقام پر لے آتی ہے جہاں وہ خواب کی واردات کو بیداری کے حواس میں محسوس کرتا ہے اور اس کا آخری درجہ یہ ہوتا ہے کہ لاشعوری تحریکات کو انسان اس طرح قبول کرنے لگتا ہے جس طرح وہ شعور کی تحریکات کو قبول کرتا ہے۔

اس ضمن میں یہ بتانا ضروری ہے کہ انسان کے اندر دو دماغ کام کرتے ہیں ایک دماغ وہ ہے جو آدم کے اندر اسفل سافلین میں پھینکے جانے سے پہلے کام کرتا تھا اور دوسرا دماغ وہ ہے جو اسفل میں بنا اور اسفل میں کام کرتا ہے لیکن وہ دماغ جو جنت میں کام کرتا تھا وہ ختم نہیں ہوا۔ ہوتا یہ ہے کہ اسفل کا دماغ غالب رہتا ہے اور جنت کا دماغ مغلوب۔ لیکن اس کی حرکات و سکنات ہر لمحہ اور ہر آن برقرار رہتی ہیں اور یہ حرکات وسکنات خواب میں سفر کرتی رہتی ہیں۔ لیکن مراقبہ کے ذریعے خواب کے حواس جب بیداری میں منتقل ہو جاتے ہیں۔تو صورت حال الٹ جاتی ہے یعنی اسفل کا دماغ مغلوب ہو جاتا ہے اور جنت کا دماغ غالب آ جاتا ہے۔لیکن اگر اسفل کا دماغ معطل ہو جائے تو انسان کے اوپر جذب طاری ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس راستہ میں سفر کرنے والے سالک کو استاد کی ضرورت پیش آتی ہے ایسا استاد جو اس راہ میں سفر کر کے منزل رسیدہ ہو اور وہ اس بات سے کما حقہ واقف ہو کہ سالک کی ذہنی استعداد کیا ہے اور وہ جنت کے دماغ کی تحریکات کو کس حد تک قبول کر سکتا ہے۔ اسی مناسبت سے وہ استاد ایسے اسباق تجویز کرتا ہے جو سالک کی ذہنی استعداد کے مطابق ہوں اور اس کی سکت کو بتدریج بڑھاتے رہیں۔تصوف کی زبان میں اس استاد کا نام شیخ ہے۔

مراقبہ کا سب سے آسان طریقہ تصور شیخ ہے۔ آنکھیں بند کر کے ذہن کی تمام صلاحیتوں کو اس بات میں استعمال کیا جائے کہ شیخ ہمارے سامنے ہے اس سے پہلا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ مرید چونکہ شیخ سے واقف ہے اور اس کے ذہن میں شیخ کی شکل وصورت اور سیرت کا ایک عکس بھی موجود ہے اسلئے تصور کرنے میں آسانی ہوتی ہے جب ہم تصور شیخ کرتے ہیں تو خیالات کے ذریعے شیخ کی پاکیزگی ہمارے ذہن میں منتقل ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ اس

پاکیزگی کا اتنا غلبہ ہو جاتا ہے کہ تاریکی اور کثافت چھٹ جاتی ہے۔ جب تک دماغ کی سطح پر تاریکی اور کثافت باقی رہے گی۔کوئی سالک روحانی سفر میں قدم نہیں بڑھا سکتا۔

مراقبہ کی تعریف ہو چکی اب دیکھیں کہ مراقبہ میں واردات و کیفیات کا نزول کس طرح ہوتا ہے یہ دو طرح سے ہوتا ہے۔

پہلی صورت یہ ہے کہ آدمی آنکھیں بند کئے بیٹھا ہے اس کے اوپر آدھی نیند طاری ہو گئی جس کو ہم نیم غنودگی کہہ سکتے ہیں اور اس حالت میں وہ غیب کی بہت سی چیزوں کا مشاہدہ کرتا ہے۔

دوسری حالت میں وہ آنکھیں بند کئے بیٹھا ہے لیکن اس کے اوپر نیند طاری نہیں ہوتی۔ آنکھیں بند ہیں اور وہ غیب کی چیزوں کا مشاہدہ کر رہا ہے۔ اس کیفیت کا اصطلاحی نام درود ہے۔ جب کوئی شخص اس کیفیت سے پوری طرح آشنا ہو جاتا ہے تو پھر درود کی حالت میں اس کی آنکھیں کھلنے لگتی ہیں اور کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ ہر چیز بند آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ آنکھوں پر ایک دباؤ پڑا اور آنکھیں کھل گئیں۔ رفتہ رفتہ یہ حالت اسی درجہ غالب آ جاتی ہے کہ اس کو آنکھیں بند کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی اور وہ اپنے ارادہ کے ساتھ جہاں دیکھنا چاہتا ہے دیکھ لیتا ہے۔ اس کیفیت کا اصطلاحی نام کشف یا مکاشفہ ہے لیکن اس حالت میں انسانی شعور کافی حد تک معطل اور دبا ہوا رہتا ہے یعنی جب اس کے اوپر یہ حالت وارد ہوتی ہے تو ماحول سے اس کا تعلق منقطع ہو جاتا ہے اور جب اس کیفیت سے باہر آتا ہے تعلق بحال ہو جاتا ہے۔

مکاشفہ کی صلاحیت پوری طرح بیدار ہو جانے کے بعد ذہن ایک نئی کروٹ لیتا ہے اور انسان کھلی آنکھوں سے دور دراز اور پس پردہ چیزوں کو دیکھنے پر قادر ہو جاتا ہے پس پردہ چیزیں بھی دیکھتا ہے اور شعوری حواس میں بھی رہتا ہے۔ مطلب یہ کہ شعوری حواس میں وہ باتیں کر رہا ہے کھا رہا ہے۔ چل پھر رہا ہے اور مشاہدہ بھی کر رہا ہے۔تصوف میں اس کا نام مشاہدہ ہے یہ مشاہدہ ہی ہے جو انسان کو درجہ بدرجہ وہاں لے جاتا ہے جہاں وہ عرفان صفات

کے علم سے متصف ہو جاتا ہے۔

مشاہدہ میں اس بات کی مشق ہو جاتی ہے کہ انسان لاشعوری واردات و کیفیات میں جو دیکھتا ہے شعور اس کو نہ صرف محسوس کرتا ہے بلکہ اس کو ایک حقیقت جان کر اہمیت بھی دیتا ہے۔ نتیجہ میں لاشعوری اور شعوری کیفیات میں ایک توازن قائم ہو جاتا ہے۔

جب یہ کیفیت قائم ہو جاتی ہے تو کوئی سالک غیب اور ظاہر میں بیک وقت دیکھتا ہے، محسوس کرتا ہے اور عمل کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی صفات کا مشاہدہ بھی کرتا ہے اور دنیاوی کاموں میں بھی مصروف رہتا ہے، فرشتوں سے ہم کلام بھی ہوتا ہے اور اپنے دوستوں سے محو گفتگو بھی رہتا ہے۔ یعنی اس کے اوپر ایک ایسی حالت وارد ہو جاتی ہے جس کو ہم لاشعوری اور شعوری کیفیات کا ایک جگہ جمع ہونا اور بیک وقت عمل کرنا کہہ سکتے ہیں وہ خود کو زمین پر بھی موجود دیکھتا ہے اور آسمانوں کی سیر میں بھی مصروف پاتا ہے۔

آیئے دعا کریں اللہ تعالیٰ اپنے کرم اور اپنے محبوب ﷺ کے صدقے میں ہمیں توفیق عطا فرمائیں کہ ہم اس کے محبوب ﷺ کے نقش قدم پر چل کر اپنا عرفان حاصل کریں اور من عرف نفسہ فقد عرف ربہ یعنی جس نے خود کو پہچان لیا بیشک اس نے اپنے رب کو پہچان لیا کی وعید کے مطابق خود کو پہچانیں اور ذات باری تعالیٰ کا عرفان حاصل کرلیں۔ آمین یارب العالمین۔

☆☆☆

''شک کیا ہے''

سوال: شک کیا ہے؟ اسے سالک کے لئے زہر کیوں کہا گیا ہے؟

جواب: ہماری پوری زندگی خیال کے گرد گھومتی ہے۔ کائنات اور ہمارے درمیان جو مخفی رشتہ ہے وہ بھی خیال پر قائم ہے۔ روحانیت میں خیال اُس اطلاع کا نام ہے جو ہر آن، ہر لمحہ ہمیں زندگی سے قریب کرتی ہے۔ پیدائش سے بڑھاپے تک زندگی کے سارے اعمال محض اطلاع کے دوش پر رواں دواں ہیں۔ کبھی ہمیں اطلاع ملتی ہے کہ ہم ایک بچہ ہیں۔ پھر ہمیں یہ اطلاع ملتی ہے کہ یہ دور جوانی کا ہے اور پھر یہی اطلاع بڑھاپے کا روپ دھار لیتی ہے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ زندگی کو لمحہ بہ لمحہ فیڈ کرنے والی اطلاع یا خیالات کے اندر شکست و ریخت کو کم سے کم کیا جائے۔ یہ جان لینا بھی ضروری ہے کہ قوت ارادی کی کمزوری کی سب سے بڑی وجہ دماغ میں شک کی موجودگی ہے۔ آدمی زندگی کے تمام مراحل وقت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں طے کرتا ہے یعنی ایک سیکنڈ کے بعد دوسرا سیکنڈ ایک منٹ کے بعد دوسرا منٹ وغیرہ۔

وسوسوں اور شک کی بنا وہم اور یقین پر ہے۔ بہت سی باتیں ہیں جن کو آدمی دشواری، مشکل، پریشانی، بیماری، بیزاری، بے عملی، بے چینی وغیرہ وغیرہ کہتا ہے۔ دوسری طرف وہ ایک چیز کا نام رکھتا ہے۔۔۔ سکون۔۔۔ یہی وہ سکون ہے جس میں وہ ہر قسم کی آسانیاں تلاش کرتا ہے۔

آدمی کے دماغ کا محور وہم اور شک پر ہے۔ یہی وہ وہم اور شک ہے جو اس کے دماغ کے خلیوں میں ہر وقت عمل کرتا رہتا ہے۔ جس قدر اس شک کی زیادتی ہوگی اسی قدر دماغی خلیوں میں ٹوٹ پھوٹ واقع ہوگی۔ یہی وہ دماغی خلئے ہیں جن کے زیر اثر تمام اعصاب کام کرتے ہیں اور اعصاب کی تحریکات ہی زندگی ہیں۔

آدمی ہمیشہ اپنی کمزوریوں کو چھپاتا ہے اور ان کی جگہ مفروضہ خوبیاں بیان کرتا ہے۔ جو اس کے اندر موجود نہیں ہیں۔ اس قسم کی زندگی گزارنے میں اسے بہت سی مشکلات پیش آتی

ہیں۔ ایسی مشکلات جن کا حل اس کے پاس نہیں ہے۔ اب قدم قدم پر اسے خطرہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کا عمل تلف ہو جائے گا اور بے نتیجہ ثابت ہوگا۔ بعض اوقات یہ شک یہاں تک بڑھ جاتا ہے کہ آدمی یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اس کی زندگی تلف ہو رہی ہے۔ اگر تلف نہیں ہو رہی تو سخت خطرے میں ہے اور یہ سب کچھ ان دماغی خلیوں کی وجہ سے ہے جن میں تیزی سے ٹوٹ پھوٹ واقع ہو رہی ہے۔

آدمی کے دماغ کی ساخت اس کے اختیار میں ہے۔ ساخت سے مراد دماغی خلیوں میں تیزی سے ٹوٹ پھوٹ' اعتدال میں ٹوٹ پھوٹ یا کم ٹوٹ پھوٹ ہوتا ہے۔ یہ محض اتفاقیہ امر ہے کہ دماغی خلیوں کی ٹوٹ پھوٹ کم سے کم ہو۔ جس کی وجہ سے وہ شک سے محفوظ رہتا ہے۔ لیکن جس قدر شک اور بے یقینی دماغ میں کم ہوں گی اسی مناسبت سے آدمی کی زندگی کامیاب گزرے گی اور جس مناسبت سے بے یقینی اور شک زیادہ ہوگا۔ زندگی ناکامیوں میں بسر ہوگی۔

خیالات روشنی کے ذریعے ہم تک پہنچتے ہیں۔ یہ روشنی اس روشنی سے جدا ہے جو ظاہری آنکھوں سے نظر آتی ہے۔ آدمی یہ قاعدے مفہوم کرنے کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوا جو روشنیوں کے خلط ملط سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگر آدمی یہ طرز عمل اختیار کرتا تو اس کے دماغی خلیوں کی ٹوٹ پھوٹ کم سے کم ہو سکتی تھی۔ اس حالت میں وہ زیادہ سے زیادہ یقین کی طرف قدم اٹھاتا...... آدمی صرف مٹی کے پتلے سے واقف ہے۔ اس پتلے سے جس کے اندر اس کی اپنی کوئی زندگی موجود نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

''ہم نے اسے بجتی مٹی (خلا) سے بنایا ہے۔''

روشنیاں ہی اس کی زندگی ہیں اور اس کی حفاظت کرتی ہیں۔ روشنیوں کے عمل سے ناواقفیت اللہ تعالیٰ کے اس بیان سے منحرف کرتی ہے۔ جہاں تک انحراف واقع ہوتا ہے وہاں تک شک اور وہم بڑھتا ہے اور ایمان اور یقین ٹوٹ جاتا ہے۔ یاد رکھیئے روحانیت اور دیگر تمام مخفی علوم میں یقین کو بنیادی اہمیت حاصل ہے...... کیونکہ ہر ارادے اور عمل کے ساتھ یقین کی روشنیاں بھی کام کرتی ہیں...... روحانیت میں یقین کی تعریف یہ ہے۔

''یقین وہ عقیدہ ہے جس میں شک نہ ہو۔''

ارادہ یا یقین کی کمزوری دراصل شک کی وجہ سے جنم لیتی ہے۔ جب تک خیالات میں تذبذب رہے گا یقین میں کبھی بھی پختگی نہیں آئے گی...... مظاہر اپنے وجود کے لئے یقین کے پابند ہیں۔ کیونکہ کوئی خیال یقین کی روشنیاں حاصل کر کے ہی مظہر بنتا ہے۔

''قرآن میں ہے۔''

''لاریب ہے یہ کتاب اور اس کو ہدایت دیتی ہے جس کا یقین غیب پر ہے۔''

یہاں اللہ تعالیٰ نے دو باتیں کہیں ہیں۔''

''لاریب'' کہہ کر ''ریب'' یعنی شک کی نفی کردی۔ اب صرف غیب باقی رہ گیا جس کو یقین کا درجہ حاصل ہے...... اس کے معانی یہ ہوئے کہ اللہ تعالیٰ دماغ میں شک کو جگہ دینے کی اجازت نہیں دیتے۔ صرف یقین کو اس بات کی اجازت ہے کہ آدمی کے ذہن میں داخل ہو جائے۔ اسی کا نام ایمان بالغیب ہے جو ہدایت دیتا ہے۔

ماہرین روحانیت نے جو اسباق سالکوں کے لئے مرتب کئے ہیں ان سب کا منشاء دراصل یقین کو پختہ کرنا ہے۔ مسلسل ارتکاز توجہ اور مشق سے کسی ایک نقطہ پر خیالات کی روشنیاں اس حد تک مرکوز رہیں کہ شک اور بے یقینی یقین کی روشنیوں کا درجہ حاصل کر لیں تو خیال اور ارادہ کے تحت اس کا مظہر بننا ضروری ہو جاتا ہے۔

☆☆☆

باب ہشتم

"وسط ایشیا میں
نظام خانقاہی کا کردار"

سوال: اسلام کی اشاعت کا جب بھی ذکر آتا ہے تو ہمارے ذہنوں میں عرب' وسط ایشیا اور برصغیر پاک و ہند کا نام خاص طور پر آتا ہے۔ آپ ہمیں وسط ایشیا میں اسلام کی اشاعت کے حوالے سے وہاں کے بزرگوں کے بارے میں بتائیں۔

جواب: تیمور کے زمانے سے وسط ایشیا کی سرزمین "ارض رومان" کی اصطلاح کے طور پر معروف ہے مگر اس میں کلام نہیں کہ وسط ایشیا میں اسلام کی ترویج و اشاعت میں صوفیاء نے بنیادی اور مرکزی کردار ادا کیا۔ جب عرب و عجم پر اموی اور عباسی خلفاء کی آمرانہ حکومتوں کا پرچم لہرا رہا تھا اور جب فرد کی آزادی سلب کر لی گئی اور جب تخت خلافت پر براجمان ہر خلیفہ اپنے ہر حریف اور سیاسی دشمن کو "اسلام اور خلافت کا باغی" قرار دے کر گردن زنی کا مستحق سمجھتا تھا' ایسے دور میں صوفیاء نے خلافت و حکومت کے ایوانوں سے دور رہ کر دین اسلام کی آبیاری کی اور مقدور بھر کوشش کی کہ حکومت کی قہرمانہ قوتوں سے دور رہ کر ٹھوس عملی اور تبلیغی فرائض انجام دیئے جائیں' صوفیاء کے مختلف قافلے' مختلف ادوار میں دنیا کے کونے کونے پہنچے اور اپنے مصالحانہ اور مخلصانہ کردار سے اسلام کی حقانیت کو گمراہ لوگوں کے دلوں میں مرکوز کیا اور یوں انہیں اسلام کی روشنی سے منور کرتے ہوئے اس وسیع حلقے کی ایک مضبوط کڑی بنا دیا جہاں عزت اور احترام کا پیمانہ رنگ و نسل اور خاندانی وجاہت نہیں بلکہ اصل پیمانہ کردار اور تقوی ٹھہرا۔ وسط ایشیا کے کوہ و دامن میں اسلام کا جو نور پھیلا' وہ بھی انہیں صوفیائے کرام عظام کی مساعی جمیلہ کے طفیل ہوا۔ صوفیاء کی خانقاہیں صدیوں تک علم و عرفان کے مراکز کا کردار ادا

کرتی رہیں۔ خیوا' سمرقند' بخارا' نیشاپور ایسے شہروں کا شہرہ دور دور تک پھیلتا چلا گیا۔ روسی زاروں کے زمانے میں وسط ایشیا کے مسلمانوں اور مسلمان حکمرانوں پر زندگی اجیرن کر دی گئی۔

روسی زاروں کا ظالمانہ شکنجہ جب وسط ایشیا کے مسلمانوں کے مسلم تشخص کو مٹا ڈالنے کے درپے تھا' ظلم و جفا کے اس دور میں مسلمانوں کی مزاحمت اور بقا کی چنگاری کا کردار وسط ایشیا کے اسی نظام خانقاہی نے ادا کیا۔ 1917ء کے کمیونسٹوں کے خونیں انقلاب نے وسط ایشیا کی اجتماعی زندگی کو تہ و بالا کر دیا۔ زاروں کے شاہی استبداد کی جگہ ملحد کمیونسٹوں اور سوشلسٹوں نے جگہ لے لی۔ کئی اعتبار سے مارکس' اینگلز' لینن اور اسٹالن کی معنوی اولادوں کے ہتھکنڈے ان مظالم سے کہیں زیادہ سخت اور سفاک تھے جو زاروں کے زمانے میں وسط ایشیائی مسلمانوں پر ڈھائے گئے۔ سابقہ سویت یونین کے ایک سابق صدر خروشیف کے دور میں مسلمانان وسط ایشیا کی زندگی اجیرن کر دی گئی۔ لیکن اس سب کے باوجود آخر وہ کون سا عنصر تھا جس نے مسلمانان وسط ایشیا کی زندگی میں حرارت باقی رکھی؟ اس سوال کا جواب ڈھونڈنے کے لئے مغربی ماہرین نے سیاحوں کے روپ میں' سوویت یونین کے ٹوٹنے سے قبل' سوویت روس کا دورہ کیا اور عمیق نظروں سے اس کا کھوج لگانے کی کوشش کی۔

مذکورہ ماہرین اور سیاح وسط ایشیا کے گہرے مطالعے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہاں مسلمانوں کی بقا اور ان میں مذہب کی حرارت کا باعث یہاں کا نظام خانقاہی تھا اور ہے۔ اس نظام خانقاہی کے مختلف سلاسل نے وسط ایشیا کے مسلمانوں کو باہم مربوط اور متحد رکھا۔ وسط ایشیا کے نظام خانقاہی میں "شاہ زندہ" کے مزار اور مزار سے متصل دینی مدرسے کو ممتاز مقام حاصل ہے۔ یہ مزار ریاست ازبکستان کے معروف عالم شہر سمرقند میں واقع ہے اور آج بھی مرجع خاص و عام ہے۔

"شاہ زندہ" کے مزار سے متصل ایک قدیم اور گہرا کنواں ہے روایت یہ ہے کہ "شاہ زندہ" جب اسلام کی تبلیغ اور اشاعت کے لئے یہاں آئے تو ان کے ہمہ دم پھیلتے اثرات سے

منفی تاثر لے کر مقامی کرداروں سے جھگڑا ہوگیا۔ رفتہ رفتہ اس جھگڑے نے باقاعدہ جنگ کی شکل اختیار کرلی۔ ''شاہ زندہ'' اپنے مٹھی بھر مریدان سے ان کا مقابلہ کرتے رہے۔ ایک خونریز جنگ میں جب سبھی مرید جان سے ہار گئے تھے۔ ''شاہ زندہ'' اپنے حجرے سے متصل اس کنویں میں اس طرح آرام سے اتر گئے جیسے سیڑھیاں سے اُتر رہے ہوں۔ اس کے بعد وہ کبھی نظر نہ آئے۔ ان کا اصل نام قاسم ابن عباس تھا۔ قاسم ابن عباس ''شاہ زندہ'' کہلائے جاتے ہیں۔

''شاہ زندہ'' کے مزار پر ازبکستان کی وسیع آبادی کے زائرین کا ہروقت جمگھٹا لگا رہتا ہے۔ زائرین کوشش کرتے ہیں کہ مزار کی زیارت پر جانے کے لئے خصوصی لباس زیب تن کیا جائے۔ یہ لباس روایتی ہے جو رنگین لمبی لمبی پٹیوں پر مشتمل ہوتا ہے اور گھرارہ فراک کی طرح سلا ہوتا ہے۔ مقامی زبان میں اس خصوصی لباس کو''ایکات'' کہا جاتا ہے۔ مذکورہ مزار کا تعویز لکڑی کا بنا ہوتا ہے جس پر انتہائی دلکش نقش ونگار بنائے گئے ہیں۔ یہ نقوش بھی لکڑی کے ہیں۔ لوگ قطار در قطار مزار کے اندر داخل ہوتے ہیں اور تعویز کو عقیدت ومحبت سے ہاتھ لگاتے ہیں۔ عورتیں نومولود بچوں کو خصوصی طور پر ساتھ لاتی ہیں اور بچوں کے ہاتھ اور کندھوں کو مزار سے مس کرتی ہیں ایسا کرتے ہوئے انہیں مکمل یقین ہوتا ہے کہ ان کے بچوں کو بیماریوں سے نجات ملی رہے گی۔ حیرت کی بات ہے کہ روسی غلبے کے دوران لادین اور الحاد پرست روسی حکمران ازبکوں کے اندر سے اس عقیدت کو مٹا ڈالنے میں ناکام رہے اور یہ بھی کہ ازبکستان میں شرح خواندگی سو فیصد ہے' اس کے باوجود لوگوں کی مزاروں سے عقیدت دیدنی ہے۔

احمد یا ساوی کی خانقاہ کو بھی وسط ایشیا میں بلند مقام حاصل ہے۔ تاریخ تصوف میں احمد یا ساوی کو عزت وحرمت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ انہوں نے ایک الگ سلسلہ تصوف کی بنیاد رکھی ان کا مزار ترکستان کے قصبے میں ہے۔ وہ ترک النسل وسط ایشیا مسلمانوں کے سب سے بڑے بزرگ اور صوفی تصور کیے جاتے ہیں۔ ان کا انتقال 1166ء میں ہوا تھا پرشکوہ مزار کو نیلی ٹائلوں سے مزین کیا گیا ہے اور طرز تعمیر تیموری ہے۔ مزار کے اندر اور باہر اور تعویز پر

قرآنی آیات کی کلاسیکی خطاطی عجیب بہار دیتی ہے۔ صدیاں گزر گئیں مگر اس کے باوجود اس کے جمال میں کوئی کمی نہیں آئی۔ ان کے مزار کو دیکھ کر بے ساختہ خواجہ بہاؤ الدین زکریاؒ کا مزار یاد آجاتا ہے۔ دونوں مزاروں کا طرز تعمیر اور اندرونی حیرت افزا خاموشی حیرت انگیز حد تک مماثل نظر آتی ہے۔ گذشتہ دس برس سے اس مزار کی تزئین نو کا کام جاری ہے سرمائے کی کمی' سوویت یونین کا ٹوٹ جانا اور اب نو آزاد ریاست کی اندرونی کمزوریاں' یہ سب مل کر اس مزار کی آرائش کی تکمیل میں سدراہ ہیں۔

احمد یا ساوی کے مزار پر قزاخ عورتیں بکثرت آتی ہیں۔ ان کے لباس میں سفید رنگ غالب نظر آتا ہے۔ روایت ہے کہ احمد بزرگ کو سفید رنگ (سنت رسول اللہ ﷺ میں) سب سے زیادہ پسند تھا۔ زمانہ قدیم میں ان کے مزار کو اولگ خان کی بیٹی نے تعمیر کروایا تھا۔ اولگ خان تیمور خان کا بیٹا تھا اور ان کی بیٹی قزانشاں کے مشہور حکمران ازبک خان المعروف ابوالخیر خان سے بیاہی گئی تھی۔ احمد یا ساوی کے مزار کی خصوصیت اور انفرادیت یہ ہے کہ ان کی قبر کا تعویز ہرن کی سینگوں سے بنایا گیا تھا۔ مدتیں گزرنے کے باوجود تعویز کے رنگ میں کوئی فرق نہیں آیا۔ دلچسپ بات یہ کہ روسی استبداد اور قبضے کے دوران اس مزار کو سرکاری عجائب گھر کی شکل دے دی گئی تھی۔ لیکن اس کے باوجود ریاست کے مسلمانوں کے دلوں میں بزرگ موصوف کی عظمت ومحبت کا نقش مٹایا نہ جاسکا۔ احمد یا ساوی کو قزانشان میں ''قومی بزرگ'' کا درجہ حاصل ہے۔

وسط ایشیا کے ایک چھوٹے سے خطے ''وادی فرغانہ'' کو برصغیر پاک و ہند میں خاصی شناسائی حاصل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مغلیہ سلطنت کے بانی مسلمان حکمران ظہیر الدین بابر فرغانہ میں پیدا ہوئے۔ تاریخ مغلیہ سے معمولی واقفیت رکھنے والا ہر فرد جونہی وادی فرغانہ کا نام سنتا ہے' اس کے دماغ میں بابر کا نام گونجنے لگتا ہے۔ اس وادی میں ''شاہ مردان'' کا مزار لوگوں کو اپنی طرف بلاتا ہے۔ اگرچہ وہ ریاست سنی العقیدہ مسلمانوں کی اکثریت سے ہے' اور اہل تشیع کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے' اس امتیاز کے باوجود اہل تشیع اور سنی العقیدہ

مسلمان بکثرت شاہ مردان کے مزار پر حاضری دیتے ہیں اور اپنے مسلکی اختلافات کو ایک طرف رکھتے ہوئے اتحاد اور یگانگت کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔

یہ ریاست جہاں اس عظیم المرتبت انسان کی آخری آرام گاہ ہے۔ اس علاقے میں حضرت بہاؤ الدین نقش بندی'' کا مزار بھی واقع ہے۔ تاریخ تصوف میں حضرت بہاؤ الدین نے سلسلہ نقشبندیہ کی بنیادیں رکھیں۔ بخارا کے مضافات میں ان کا مزار لاہور میں داتا گنج بخش کی یاد دلاتا ہے متصل ریاست تاجکستان میں حضرت یعقوب چرخی جو حضرت بہاؤ الدینؒ کے مرید باصفا تھے' کا مزار دوشنبے کے مضافات میں خواجہ احرار کا مزار عقیدت مندوں کی نگاہوں کا مرکز ہے۔

ماسکو یونیورسٹی کے معروف محقق ڈاکٹر زیرانوف جنہیں وسط ایشیا میں سلسلہ خانقاہی پر اتھارٹی سمجھا جاتا ہے' کا کہنا ہے۔ ''سٹالن کے آخری دور میں تاجکستان' قزاخستان اور ازبکستان میں واقع صوفیا' کے مزاروں کو سرکاری سرپرستی میں منہدم کرنے اور ان سے متصلہ مدرسوں کو تباہ کرنے کی دانستہ کوششیں کی گئیں۔ مقصد یہ تھا کہ وسط ایشیا کے مسلمانوں کی مرکزیت اور اتحادی مراکز کو ختم کر دیا جائے کہ بعد ازیں انہیں منتشر کرنے اور ان کی باہمی اخوتی قوت کو پارہ پارہ کرنے میں آسانی رہے۔ سٹالن کے کارپردازوں کو اس وقت حیرت انگیز حد تک شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا جب وہ خواجہ احرار اور حضرت یعقوب کے مزارت کو منہدم کرنے کے لئے چل پڑے۔ خواجہ احرار کے سجادہ نشین اس مزاحمت میں کام آ گئے مگر ان کے قتل کے بعد ان کے جانشینوں نے اسٹالن کے جانشینوں کو چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔ خرو شیف کے زمانے کے پہلے سال جب خواجہ احرار کے خاندان کے ایک فرد کو تاحیات مزار کا مہتمم مقرر کیا گیا تو یہ گویا وسط ایشیا بھر میں جال کی طرح پھیلے نظام خانقاہی کا ایک بار پھر غلبہ تسلیم کئے جانے کے مترادف تھا۔'' زیرانوف مزید لکھتا ہے۔ ''یہ بات حقیقت کی طرح نوٹ کی جائے کہ وسط ایشیا کے صوفیاء اور ان کے اولین سجادہ نشین صرف معنوں میں صرف سجادہ نشین نہیں تھے بلکہ جہاد' علم اور اسلام کے دونوں بنیادی جذبوں کی وہ عملی تفسیر بھی تھے۔''

مسٹر زیرانوف کے مذکورہ بالا بیان کی تصدیق ایک اور روسی محقق جی پی زنیسا روف کی تازہ ترین کتاب ''خوارزمین لیجنڈز'' بھی کرتی ہے۔ خوارزم کے علاقے میں' خصوصاً دریائے آمواز کے زیریں علاقے میں سلطان اویس بابا (جنہیں مختصراً سلطان بابا کہا جاتا تھا) کا مزار خاصا شہرت یافتہ ہے۔ جی پی زنیسا روف کا کہنا ہے کہ خوارزم بھر میں کوئی دوسری خانقاہ شہرت' دلکشی اور مقبولیت میں سلطان بابا کے مزار سے مقابلہ نہیں کر سکتی۔ بجیرہ ارال کے جنوب میں واقع سید چنار کا مزار اور ملحقہ مدرسہ بھی صدیوں سے لوگوں کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ افغانستان کے تاجک قبیلہ کے ہزاروں عالم اسی مدرسے سے فارغ التحصیل ہیں۔ بجیرہ ارال کے جنوب میں ہی علاقہ ''گوئیک ٹیپی'' ایک صدی تک اسلام دشمن قوتوں کی نگاہوں میں کھٹکتا رہا۔ یہاں کے معروف بزرگ خواجہ قربان مراد نے 1881ء میں جنگ ''گوئیک ٹیپی'' میں جہاد کی بے مثل داستانیں رقم کی۔ اگرچہ وہ دو سو گیارہ دنوں کے محاصرے کے بعد شہید کر دیئے گئے مگر جاں فروشی' اسلام اور جہاد سے محبت کی لافانی داستانیں رقم کر گئے جن کی خوشبو آج بھی وسط ایشیا کی رومان پرور فضاؤں کی سیر کرنے والوں کو واضح طور پر محسوس ہوتی ہے اور پلک جھپکتے ہی مقام جاں کو معطر کر دیتی ہے۔

☆☆☆

''دوبئ میں کتاب تجلیات کی رونمائی کے مواقع پر''

خواجہ شمس الدین عظیمی نے حمد و ثناء کے بعد اپنی تقریر کا آغاز قرآن پاک کی آیت و اعتصمو بحبل اللہ جمعیاً ولا تفرقو o سے کیا انہوں نے کہا کہ کتاب تجلیات میں قرآن کریم میں سے 95 عنوانات کی تشریح بیان کی گئی ہے۔ یہ ایسے عنوانات ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر مسلمان قوم اپنا کھویا ہوا عروج و مقام دوبارہ حاصل کر سکتی ہے۔ انہوں نے کہا حضور اکرم علیہ الصلوۃ والسلام کی امت پر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے اور اس طرح قرآن کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے کہ قرآن آج بھی بالکل ایسے ہمارے پاس موجود ہے جیسا آج سے 1400 سو سال قبل نازل فرمایا گیا تھا انہوں نے کہا کہ قرآن میں چھوٹی سے چھوٹی اور بڑے سے بڑی ہر بات کو وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے۔ جب تک ہمارے اسلاف نے قرآن سے راہنمائی حاصل کی اور قرآن میں تفکر کرتے رہے، تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں کی قوت اور حکمرانی قائم رہی۔ انہوں نے کہا کہ کائنات کے انتظام میں جاری وساری علوم کو جاننا ہر ذی شعور مسلمان کا فریضہ ہے۔

انہوں نے نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی علم کے بارے میں چند احادیث سنائیں:

''حکمت مومن کی کھوئی ہوئی پونجی ہے جہاں پائے اٹھالے۔''

''حکمت سیکھو جہاں سے بھی ملے''

''طلب علم بہترین عبادت ہے''

''علم اسلام کی قوت اور اسلام کا ستون ہے''

''ہر مسلمان مرد اور مسلمان عورت پر علم سیکھنا فرض ہے۔''

نبی آخر الزماں ﷺ کے ارشادات پر عمل کرتے ہوئے جب امتی علم حاصل کرنے میں مشغول ہوئے تو علم کی فضیلت نے انہیں اس کرۂ ارض پر قائد و راہنما بنا دیا انہوں نے کہا مسلمانوں کے علم کی بنیاد اوہام پرستی اور قیاس کی بجائے تجربات اور مشاہدات پر ہے۔ اس

وقت مسلمان اُمت میں بڑے بڑے عالم پیدا ہوئے کہ انہوں نے نوع انسانی کے علم میں غیر معمولی اضافہ کیا یہ اس وقت کی بات ہے جب یورپ کے پاس علم کی روشنی نہیں تھی۔ حضور پاک ﷺ کی تعلیمات کے باعث عرب مسلمان علم وحکمت کو اپنی معراج سمجھتے تھے انہیں جہاں سے حکمت و دانش ملتی اسے حاصل کرتے تھے۔ سینکڑوں مسلم ماہرین علم نے نوع انسانی کے علم میں اہم اور مفید اضافے کیے ان نامور مسلمانوں کی تصنیفات پڑھ کر موجودہ زمانے کا ہر تعلیم یافتہ شخص ان کی کتابوں کی ایک اہم خصوصیت نوٹ کرتا ہے وہ یہ کہ ان میں کہیں بھی اسلام اور سائنس کا ٹکراؤ نہیں ہے ان نامور مسلم سائنسدانوں کے علم وفضیلت کی روشنی جب دنیا میں پھیلی تو اسلامی ملکوں سے باہر دور دور کے علاقوں میں بھی یونیورسٹیاں قائم ہوگئیں۔

خواجہ شمس الدین عظیمی نے کہا آج کا غیر متعصب دانشور جب تخلیق کائنات پر غور کرتا ہے اور اس کے ڈانڈے قرآنی علوم سے ملاتا ہے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ سائنس (علم) انسان کی پیدائشی خاصیت ہے۔ انہوں نے کہا قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم نے آدم کو اپنی نیابت عطا کی اور اس کو علم الاسماء سکھائے۔

انہوں نے کہا علمی اعتبار سے سائنس کا علم فطرت و کائنات کا علم ہے۔ علمی طور پر سائنس کائنات کی قوتوں کے بارے میں جاننا اور زمین و آسمانوں کے خزانے تلاش کرنا ہے۔

انہوں نے کہا کہ قرآن پاک کے مطالعے سے ہمیں اس بات کا علم حاصل ہوتا ہے کہ عملی سائنس بھی مختلف انبیاء کے ذریعے تم تک پہنچی ہے۔ مثلاً حضرت آدمؑ کے ذریعے ہم زراعت سے واقف ہوئے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے ذریعے کشتی سازی کا علم حاصل ہوا۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے ذریعے لوہے اور صنعت وحرفت کا علم ملا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ذریعے طب اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے ذریعے وائرلیس سسٹم سے آگاہی حاصل ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ قدیم وقتوں کے مسلمان چونکہ نبی آخر الزماں کی تعلیمات پر عمل پیرا رہے اس لئے اس وقت من حیث القوم مسلمان قوم ایک ممتاز قوم تھی اور جیسے مسلم قوم نبی آخر الزمان علیہ الصلوۃ والسلام کی تعلیمات، غور و فکر، تحقیق اور ریسرچ سے دور ہوتی گئی اس اعتبار

سے ان کی زندگی انفرادی طور پر اور من حیث القوم جہالت کی تاریکی میں ڈوبتی چلی گئی۔ اور جس قوم نے علم کے حصول اور سائنسی ترقی کو اپنے لئے لازم قرار دے دیا۔ وہ بلند اور سرفراز ہوگئی۔

اللہ تعالیٰ کا قانون ہے کہ جو قوم خود اپنی حالت بدلنا نہیں چاہتی اللہ اس کی حالت نہیں بدلتا۔ اس موقع پر خواجہ شمس الدین عظیمی نے کہا کہ ہمارا فرض ہے کہ ہم ناخلف اور ناسعید اولاد کے زمرے سے نکل کر اپنے اسلاف کے ورثے کو حاصل کریں تا کہ تاریکی کے گہرے غاروں سے ہمیں نجات مل جائے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

''ایک ساعت کا تفکر ساٹھ سال کی عبادت سے افضل ہے۔'' ''علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور مسلمان عورت پر فرض ہے۔''

انہوں نے کہا کہ کتاب تجلیات لکھتے وقت میرے سامنے یہ بات تھی کہ قوموں کو عروج اسی وقت ملتا ہے جب ان میں تفکر، علم ہو اور ریسرچ ہو۔ آج کے دور میں وہی قومیں سرفراز و بلند ہیں جن کے اندر علم اور ریسرچ ہے اور جن کے اندر کائنات میں کھوج لگانے کا ذوق و شوق ہے۔

شیخ عظیمی نے کہا کہ میں سمجھتا ہوں کہ مسلمان قوم کا زوال اس وقت ہوا جب مسلمان قوم نے اسلاف کے ورثے ریسرچ کو چھوڑا اور قرآن کا حکم **واعتصمو بحبل اللہ جمیعاً ولا تفرقو** ہ پر عمل نہیں کیا انہوں نے کہا کہ مسلمان قوم کو صرف مادی علوم کے ذریعے دنیا کی موجودہ علمی سطح تک پہنچنے کے لئے کئی صدیاں درکار ہوں گی۔ لیکن اگر آج امت مسلمہ سائنسی ریسرچ کا یہ طریقہ اپنائے کہ قرآن کے اندر تسخیری فارمولوں سے راہنمائی حاصل کر کے ریسرچ کی جائے تو مسلم قوم بہت جلد موجودہ ترقی یافتہ اقوام کے برابر آ جائے گی اور اس سے آگے نکل جائے گی۔

☆☆☆

''انگلینڈ میں خطاب''

جب زمین پر بہت زیادہ فساد پھیلا اور انسان انسان کا دشمن بن گیا اور لوگوں کے دلوں سے اپنی اولاد کی محبت مٹ گئی اور لوگوں نے اپنی بیٹیوں کو زندہ دفن کرنا شروع کر دیا۔ فحاشی اور عریانی عام ہوگئی۔ دنیا میں ایک عذاب مسلط ہوگیا۔ انسان نے انسان کو کھانا شروع کر دیا۔ ہر طرف ظلم و جہالت کا بازار گرم ہوگیا۔ زمین نے جب یہ دیکھا کہ میرے اوپر رہنے والے انسان درندے بن گئے تو زمین نے اللہ سے فریاد کی۔ اللہ نے زمین کی فریاد سنی اور اللہ تعالیٰ کو زمین پر اور زمین پر بسنے والے لوگوں کی نجات کے لیئے اپنے حبیب خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ کو بھیجا۔ حضور ﷺ کی تشریف آوری اس زمین پر بلاشبہ زمین کی اور زمین پر بسنے والے تمام انسانوں کی خوش نصیبی ہے۔ رسول اللہ ﷺ ایک ایسے مقام پر تشریف لائے جہاں جھلتی ہوئی دھوپ، سورج کی تمازت ظلم اور بربریت کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے جب اپنی قوم کا یہ حال دیکھا تو حضور ﷺ کا دل جو اللہ کے نور سے معمور تھا اس طرف متوجہ ہوا کہ نوع انسانی جو ایک دوسرے کی دشمن بن گئی ہے اس کے اندر پیار اور محبت تقسیم کی جائے تا کہ پیار اور محبت سے تمام انسان ایک نقطہ اور ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوں اور انسانوں نے جو یہ بے شمار خدا بنا لیئے ہیں۔ ان خداؤں سے ہٹ کر ایک خدا کی پرستش کریں۔

سیدنا حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی سیرت پاک سے ہر مسلمان کم و بیش واقف ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی زندگی اس طرح گزری کہ پیدائش سے پہلے والد کا انتقال ہوگیا۔ پھر والدہ کا انتقال ہوا۔ اور پھر دادا اس دنیا سے دوسری دنیا میں چلے گئے۔ تمام سرپرستوں سے آزاد ہونے کے بعد بھی اللہ کی طرف سے جو تربیت مقرر تھی وہ رنگ لائی۔ حضور ﷺ نے محنت کی۔ مزدوری کی۔ شادی کی اور تجارت بھی کی لیکن ان دنیاوی تمام کاموں کے ساتھ ساتھ رسول اللہ صلعم نے اللہ کی طرف بھی ہمیشہ دھیان دیا اور اللہ کے معاملات میں بھی تفکر کرتے رہے۔

جب یہ دیکھا کہ دنیاوی معاملات اللہ کے بارے میں تفکر کرنے میں خارج ہوتے ہیں تو

مکہ سے غار حرا تشریف لے جانے لگے اور وہاں مراقبہ کیا جس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو بھیجا اور حضور پاک ﷺ پر قرآن نازل ہوا۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام تشریف لائے اور فرمایا ''اپنے رب کا نام لے کر پڑھو جس نے پیدا کیا انسان کو خون کی پھٹکی سے۔'' اللہ کے محبوب نے فرمایا میں تو پڑھنا نہیں جانتا۔ حضرت جبرائیلؑ نے فرمایا تم پڑھو اور پھر ایک امی آدمی نے جس نے کبھی قاعدہ نہیں پڑھا کبھی کتاب نہیں پڑھی، کبھی تختی نہیں لکھی۔ قرآن جیسی کتاب تمام نوع انسانی کے لیئے محفوظ کر دی۔ قرآن نازل ہونے کے بعد نماز فرض ہوئی، روزے فرض ہوئے اور جتنے دوسرے دینی ارکان ہیں ان سب کی فرضیت ہوئی اور مسلمانوں کو ایک پروگرام مل گیا۔ آج ہم جتنے بھی مسلمان ہیں ہماری شناخت حضور ﷺ کا چھوڑا ہوا یہی پروگرام ہے۔

ہماری پہچان یہ ہے کہ ہم مسلمان ہیں یعنی ہم اللہ کے برگزیدہ بندے اور اللہ کے محبوب خاتم النبین رسول اللہ ﷺ کے امتی ہیں اور ہماری دوسری پہچان یہ ہے کہ بحیثیت مسلمان ہمارا عمل قرآن کے مطابق ہو۔ ہماری زندگی قرآن کے مطابق ہو حضور پاک ﷺ کی زندگی کے مطابق ہو۔ جب تک ہمارا عمل خالصتاً قرآن و حدیث کے مطابق رہا ہم ترقی کرتے رہے۔ ایسی ترقی کہ ساری دنیا میں ہماری حکمرانی قائم ہوگئی ہمارے بزرگوں نے نئی نئی سائنسی ایجادات کیں پھر ایسا وقت آیا اور مسلمانوں کو ایسی نظر لگی اور دشمنوں نے کچھ ایسی سازشیں کیں کہ اس کے باوجود کہ ہم مسلمان بھی ہیں کلمہ طیبہ بھی پڑھتے ہیں۔ قرآن پاک کی تلاوت بھی کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ پر ایمان بھی رکھتے ہیں۔ ان سے ہمیں عشق بھی ہے، محبت بھی ہے اللہ کو ایک بھی مانتے ہیں، ترقی رک گی اور مسلمان قوم آہستہ آہستہ ذلیل و خوار ہوتی گئی۔ یہ کون نہیں جانتا کہ اسپین میں مسلمانوں نے سینکڑوں سال حکومت کی اور اب وہاں دیکھنے کو مسلمان نظر نہیں آتا۔ ہندوستان میں مسلمانوں نے کئی سو سال حکومت کی۔

میں پاکستان سے ہزاروں میل کا سفر کر کے آپ کی خدمت میں اس لیئے حاضر ہوا ہوں کہ ہم سر جوڑ کر بیٹھیں اور یہ تلاش کریں کہ آخر وہ کونسا عمل ہے کہ جس عمل سے ہمارے بزرگوں

نے ہمارے اسلاف اور ہمارے بڑوں نے تمام دنیا پر حکمرانی کی اور وہ کونسا ناقص عمل ہے جس کی وجہ سے ہم دنیا میں ذلیل و خوار ہیں یہ ہمیں تلاش کرنا ہے۔ ایسی کونسی بات ہوگئی ہے کہ جب ہم اپنے بزرگوں کی طرح سارے کام کر رہے ہیں وہی کام جن کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے انھیں ساری دنیا پر حکمران کر دیا اور جب وہ سارے کام جو ہمارے بزرگوں نے کیئے ہیں ہم بھی کر رہے ہیں تو ہمیں حکمرانی کیوں نہیں ملتی؟ ہم ہر چیز کے لیئے غیروں کے محتاج کیوں ہیں۔

اس کی وجہ میں نے جو تلاش کی ہے (یقیناً آپ حضرات بھی اس سلسلے میں سوچ بچار کرتے ہوں گے؟ یہ کہ آج کے دور میں ہمارا عمل جسمانی اور زبانی زیادہ ہے۔ ہمارے بزرگ جب یہی عمل کرتے تھے تو جسمانی حرکت کے ساتھ ساتھ ہر عمل کی حکمت اور روح بھی ان کے پیش نظر ہوتی تھی حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ایک واقعہ عام طور پر تذکرہ میں آتا ہے کہ دشمن نے تیر مارا جو کمر میں اتر گیا۔ جب اس تیر کو نکالنا چاہا تکلیف ہوئی حضرت علیؓ نے فرمایا کہ میں نماز کی نیت باندھ لیتا ہوں پھر تم تیر نکال لینا۔ حضرت علیؓ نے نماز کی نیت باندھ لی۔ کمر میں سے تیر نکالا گیا۔ پٹی بھی ہوگئی۔ انھیں پتہ ہی نہیں چلا کہ کیا ہوا۔ اس بات سے یہ ثابت ہوا کہ ہمارے بزرگ جب نماز قائم کرتے تھے تو نماز کی حکمت، نماز کے مفہوم اور نماز کی روح سے قریب ہو جاتے تھے، وہ نماز کے انوار میں جذب ہو جاتے تھے۔ آج ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اپنی پوری کوشش کے باوجود ہم نماز میں کسی بھی طرح یکسوئی حاصل نہیں کر سکتے۔ نماز میں اتنے خیالات آتے ہیں کہ ہم چار رکعتیں پوری کر لیتے ہیں اور ہمیں یہ یاد بھی نہیں رہتا کہ ہم نے کس رکعت میں کونسی سورۃ پڑھی تھی اسکی وجہ یہ ہے کہ ہم قرآن کو لفظوں میں پڑھتے ہیں لیکن معنی اور مفہوم پر غور و فکر نہیں کرتے۔

دیکھئے یہ بات ہر آدمی جانتا ہے کہ اگر کوئی کام بغیر سوچے سمجھے، بغیر غور فکر کے کیا جاتا ہے تو اس کا نتیجہ عام طور پر غلط نکلتا ہے لیکن اگر وہی کام سوچ سمجھ کر اور غور و فکر کے ساتھ کیا جاتا ہے تو اس کا نتیجہ عام طور پر اچھا ہوتا ہے

جب ہم قرآن کی طرف رجوع کرتے ہیں تو قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ قرآن ایک ایسی

کتاب ہے جو اللہ تعالیٰ نے نوع انسانی کو اس لیے دی ہے کہ نوع انسانی اس کتاب کو پڑھ کر اس کے معنی و مفہوم پر غور کر کے اس کے انوار سے فائدہ اٹھائے جو انوار انسان کو اللہ کے حبیب رسول اللہ ﷺ سے قریب کر دیتے ہیں اور وہ انوار جن کا ذخیرہ انسان کے اندر اگر ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اتنا انعام اس کے اوپر کرتے ہیں کہ اسے اپنا عرفان عطا فرما دیتے ہیں۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اللہ کے بعض بندے ایسے ہیں جو قرب نوافل سے اللہ کی یاد سے اتنے ہلکے اور لطیف ہو جاتے ہیں کہ اللہ انھیں اچک لیتا ہے اور انھیں اٹھا کر اپنی گود میں بٹھا لیتا ہے۔ جب ہم اپنے بزرگوں کو دیکھتے ہیں تو یہ بات ہمیں کھلی آنکھوں سے نظر آتی ہے کہ ہمارے اسلاف اللہ سے بھی قریب تھے۔ اللہ کے رسول ﷺ کی محبت سے بھی قریب تھے۔ قرآن پڑھتے تھے۔ قرآن کی حکمت سے بھی واقف تھے۔

قرآن ایک ایسی کتاب ہے جو خود اپنا تعارف کراتی ہے اور انسان کو یہ بتاتی ہے کہ اگر کوئی انسان مجھے تلاش کرے۔ میرے اندر غور و فکر کرے تو میں اس انسان کے اوپر ایسے ایسے فارمولے منکشف کر دیتی ہوں جن فارمولوں سے انسان نئی نئی ایجادات کرتا ہے۔ جن فارمولوں سے انسان (Time) اور (Space) کو توڑ دیتا ہے۔ جن فارمولوں سے انسان تمام دنیا میں اور کھربوں آنکھوں سے اوجھل سیاروں میں اشرف المخلوقات بن جاتا ہے۔ یہ وہ کتاب ہے جو خود کہتی ہے میں ایسی کتاب ہوں کہ جب کوئی بندہ مجھے اپنا لیتا ہے۔ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ میرے اندر تفکر کرتا ہے تو ایسا بندہ جو میرے اندر تفکر کرتا ہے وہ اللہ کا دوست بن جاتا ہے اور جب کوئی بندہ اللہ کا دوست بن جاتا ہے تو اللہ کی نیابت سے واقف ہو جاتا ہے۔

الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون

جب کوئی بندہ اللہ کا دوست بن جاتا ہے تو اس کے اوپر سے غم اور خوف کے بادل چھٹ جاتے ہیں اور اس کے اندر سے غم اور خوف نکل جاتا ہے۔

الٓمٓo ذالک الکتب لا ریب فیہ

"یہ ایسی کتاب ہے اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔" ذلک الکتاب۔ یہ کتاب

لاریب ہے، نہیں ہے شک اس میں۔ اس کتاب میں جو کچھ بیان کر دیا گیا ہے وہ نوع انسانی کی زندگی سے متعلق معاشی مسائل ہوں رہن سہن کے معاملات ہوں۔ شادی بیاہ کے مسائل ہوں نہانے دھونے کے مسائل ہوں یا انسان کی پیدائش سے پہلے کے مسائل ہوں یا کائنات سے متعلق تسخیری فارمولے ہوں۔ اس کتاب میں اللہ تعالیٰ نے اس طرح بیان کر دیئے ہیں کہ اس میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں یہ کتاب ایسی کتاب ہے۔

ترجمہ: اس کتاب میں ہر چھوٹی سے چھوٹی اور ہر بڑی سے بڑی بات وضاحت کے ساتھ بیان کر دی گئی ہے۔

اگر آپ اس میں سے (Atomic) فارمولے تلاش کرنا چاہیں تو آپ کو مل جائیں گے اگر آپ اس میں سے ٹائم اور اسپیس سے آزاد ہونے کے فارمولے تلاش کرنا چاہیں تو وہ آپ کو مل جائیں گے اگر آپ اس کتاب میں یہ تلاش کریں کہ انسانوں کو معاشرتی اعتبار سے کس طرح رہنا چاہیے تو سارے مسائل کا حل آپ کو مل جائے گا۔ اگر آپ اس کتاب میں یہ تلاش کرنا چاہیں کہ انسان پاکیزہ اور پاک و صاف کس طرح ہوتا ہے تو آپ کو پاکیزہ رہنے کے طریقوں کا علم مل جائے گا۔ آپ اس میں سے یہ تلاش کریں کہ اولاد کی تربیت کس طرح کی جائے تو اللہ کی کتاب آپ کو یہ بھی بتائے گی۔

اگر آپ اس کتاب کے اندر زندگی سے متعلق انفرادی زندگی سے متعلق قومی زندگی سے متعلق پوری نوع انسانی کی زندگی سے متعلق زمین سے متعلق آسمان سے متعلق فرشتوں سے متعلق لوح محفوظ سے متعلق برزخ سے متعلق کوئی بھی چیز جب آپ اس کتاب میں تلاش کریں گے تو اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق اللہ تعالیٰ کے وعدے کے مطابق وہ تمام چیزیں آپ کو مل جائیں گی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

یہ ایک ایسی کتاب ہے جس میں کسی قسم کے شک اور شبہ کی گنجائش نہیں۔

لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی غور طلب ہے کہ یہ کتاب ان لوگوں کو ہدایت بخشتی ہے

جو متقی ہیں یہ ایسی کتاب ہے کہ اس میں دین و دنیا علم و جہالت عذاب ثواب خیر و شر ہر چیز موجود ہے اور اس طرح موجود ہے کہ جب کوئی بندہ کتاب کے علم کو تلاش کر لیتا ہے تو اس کے اندر شک اور بے یقینی نہیں رہتی۔

اب یہ بات سوچنے کی ہے کہ متقی کیا چیز ہے؟ متقی کون لوگ ہیں؟ بظاہر تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ جو لوگ نماز قائم کرتے ہیں روزہ رکھتے ہیں۔ حج کرتے ہیں۔ زکوٰۃ دیتے ہیں' اپنی زندگی کو صاف ستھرا رکھتے ہیں ان کو قرآن متقی کہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ''یہ کتاب اس میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے اور یہ کتاب ان لوگوں کو ہدایت بخشتی ہے جو متقی ہیں۔ اور متقی لوگ کون ہیں؟ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ متقی لوگ وہ ہیں جو غیب پر یقین رکھتے ہیں۔ غیب پر ایمان رکھتے ہیں۔ ایمان کا مطلب ہے یقین۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق مسلمان ہونا الگ بات ہے مومن ہونا الگ بات ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ ''قولو مسلمون'' وہ کہتے ہیں مسلمان ہیں۔ یہ بات تو صحیح ہے وہ مسلمان ہیں۔ ''لیکن ابھی ان کے دلوں میں ایمان داخل نہیں ہوا۔'' مسلمان الگ حیثیت ہے اور ایمان الگ ایک حیثیت ہے۔ اللہ کے راستہ پر چلنے کے لیئے پہلا قدم مسلمان ہونا ہے۔ اللہ کی قربت بحال کرنے کے لیئے دوسرا قدم مومن ہونا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں متقی وہ لوگ ہیں جو غیب پر یقین کرتے ہیں۔ دیکھیئے! ہر آدمی جانتا ہے کہ یقین بغیر دیکھے نہیں ہوتا۔ آپ کسی عدالت میں جا کر گواہی دیں کہ صاحب اس آدمی نے چوری کی ہے۔ عدالت آپ سے پوچھے گی کہ آپ نے دیکھا۔ آپ کہیں گے کہ دیکھا تو نہیں البتہ ہم نے سنا ہے۔ عدالت آپ کی گواہی کو نہیں مانے گی اور آپ کی گواہی ختم کر دے گی۔ جب تک کہ آپ دیکھ نہ لیں' مشاہدہ نہ کر لیں اس وقت تک یقین کی شرط پوری نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں متقی وہ لوگ ہیں جو غیب کا مشاہدہ کرتے ہیں غیب کو دیکھتے ہیں۔ غیب کو محسوس کرتے ہیں یعنی متقی لوگ غیب کو دیکھتے ہیں۔ اور قائم کرتے ہیں صلوٰۃ۔

صلوٰۃ یعنی نماز کو وہ اس طرح قائم کرتے ہیں کہ اللہ کا اور ان کا ایک رشتہ قائم ہو جاتا ہے حضور قلندر بابا اولیاء رحمۃ اللہ علیہ سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی آل میں سے ہیں۔ وہ لفظ صلوٰۃ کا ترجمہ رابطہ یا تعلق کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ سو سے زیادہ جگہ نماز کا تذکرہ قرآن پاک میں ہے۔ نماز کے لیئے پڑھنا کہیں نہیں آیا۔ قائم کرنا آیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب نمازی نماز کے لیئے کھڑا ہو جاتا ہے تو اس کا اللہ کے ساتھ ایک رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ ایسا رشتہ قائم ہو جاتا ہے کہ بندہ عبد بن جاتا ہے اور اللہ معبود بن کر سامنے آ جاتا ہے۔

یہ کتاب ان لوگوں کو ہدایت بخشتی ہے جو غیب کو دیکھتے ہیں غیب پر یقین رکھتے ہیں اور نماز میں اللہ کے ساتھ ان کا تعلق قائم ہو جاتا ہے'' اور جو کچھ ہم نے ان کو عطا کیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں''۔

جو کچھ وہ خرچ کرتے ہیں وہ جانتے ہیں اور اس بات پر ان کا یقین ہوتا ہے کہ یہ جو وسائل ہیں یہ سب اللہ کی طرف سے ہیں۔ یہ کون نہیں جانتا کہ اگر زمین پیدا نہ کرے تو کھیتی کہاں پر اگے گی۔ اللہ تعالیٰ دھوپ نہ پیدا کریں تو کھیتیاں کس طرح پکیں گی۔ اللہ تعالیٰ چاند پیدا نہ کریں تو پھلوں میں شیرینی کیسے پیدا ہو گی۔ انسان کی جتنی بنیادی ضروریات ہیں اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کے لئے پیدا کر دی ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ رحیم و کریم نے اس بات کی تخصیص نہیں کی ہے کہ پانی مسلمان کو ملے گا۔ مومن کو ملے۔ کافر کو ملے گا فاسق کو ملے گا۔ ہر مخلوق اللہ کا پانی پی رہی ہے۔ ہوا ہے وقت کی ضرورت ہے۔ اگر آج ہوا بند ہو جائے تو دنیا ایک منٹ کے ہزارویں حصے میں ختم ہو جائے گی۔ ہوا مفت اور فری ہے۔ زمین کے اندر ایسی ایسی چیزیں اللہ تعالیٰ نے پیدا کر دی ہیں جو انسان کے وہم و خیال میں بھی نہیں ہیں لیکن انسان کی زندگی سے ان کا ہر وقت تعلق ہے۔ آپ سمندری غذا کی طرف غور کریں۔ سمندر میں کتنی مچھلیاں انسان پیدا کرتا ہے؟ مچھلیاں پیدا کرنے کے لئے انسان ہل نہیں چلاتا۔ تخم ریزی نہیں کرتا۔ محنت مشقت نہیں کرتا۔ اللہ

تعالیٰ بکرے بکریاں پیدا کرتے ہیں۔ لاکھوں بکرے روز کٹ جاتے ہیں لیکن ان میں کمی نہیں ہوتی۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں متقی لوگوں کی تعریف یہ ہے کہ جو کچھ وہ کھاتے ہیں جو کچھ پیتے ہیں جو کچھ پہنتے ہیں۔ جب وہ گھروں میں رہتے ہیں جب وہ کاروبار کرتے ہیں تو ان کے ذہن میں یہ یقین ہوتا ہے کہ یہ سب اللہ کی طرف سے ہے۔

یہی وہ لوگ ہیں جو ہدایت یافتہ ہیں اور فلاح کے راستے پر گامزن ہیں۔"

یہ قرآن پاک کی سورہ بقرہ کی پہلی آیات سے میں نے تقریباً رکوع تک آپ کے سامنے ترجمہ اور تشریح بیان کی ہے۔ اب آپ غور فرمائیں کہ قرآن پاک کے اس پہلے رکوع کے جو معنی اور مفہوم میں نے آپ کے سامنے عرض کیئے ہیں ہم ان معنی و مفہوم میں کہاں تک قرآن کو سمجھتے ہیں۔ اگر ہم قرآن کو جس طرح کہ قرآن کہہ رہا ہے اور اللہ کہہ رہا ہے۔ اللہ کے ارشاد کے مطابق معنی اور مفہوم کے ساتھ سمجھنے لگیں تو ہمارا عمل اور ہمارے بزرگوں کا عمل ایک ہو جائے گا۔ اسلئے کہ ہمارے بزرگ ہمارے اسلاف' ہمارے صحابہ کرام' ہمارے تابعین' ہمارے تبع تابعین' ہمارے اجداد' ہمارے علماء ہمارے بزرگ ہیں جن کی ہم اولاد ہیں' اور جن کی اولاد ہونے میں ہمیں فخر ہے۔ وہ قرآن کو معنی' مفہوم اور حکمت کے ساتھ سمجھتے تھے قرآن کو جب معنی اور مفہوم اور حکمت کے ساتھ سمجھا جاتا ہے تو قرآن خود کھل کر سامنے آجاتا ہے اور قرآن کے اندر اللہ تعالیٰ نے جو خزانے بھر دیئے ہیں قرآن ان خزانوں کو کھول دیتا ہے اور نوع انسانی ان سے فائدہ اٹھاتی ہے۔ قرآن لاریب ایک طاقت ہے کہ اگر اس کو مضبوطی کے ساتھ تھام لیا جائے اور اس کے اندر غور و فکر کیا جائے تو انسان کو وہ علوم حاصل ہو جاتے ہیں جن علوم کی بدولت انسان تمام دنیا پر حکمران ہو جاتا ہے اور دنیا میں اپنا ایک مقام حاصل کر لیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

قرآن ایک عظیم طاقت ہے۔ ایسی طاقت کہ اللہ اگر قرآن کو پہاڑوں پر نازل کر دیتا تو

پہاڑ خشیت سے ریزہ ریزہ ہو جاتے۔"

لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ قرآن اپنے حبیب رسول اللہ ﷺ کی معرفت نوع انسان کو عطا کیا ہے تاکہ نوع انسانی اس عظیم طاقت سے جو طاقت پہاڑوں کو بھی ریزہ ریزہ کر سکتی ہے فائدہ اٹھائے۔۔ نوع انسانی اگر فائدہ نہیں اٹھاتی تو اللہ کے رسول کے امتیوں کا یہ فرض ہے کہ وہ اللہ کی کتاب پڑھیں۔ اللہ کی کتاب کے معنوں میں غور و فکر کریں اور اس کتاب میں سے ایسے ایسے علوم تلاش کریں جو علوم تمام دنیا میں کہیں بھی نہیں ہیں۔ ایسے علوم جن کو فرشتے بھی نہیں جانتے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ سجدہ کرو آدم کو۔ فرشتوں نے کہا کہ یہ تو خون خرابہ کرے گا اللہ تعالیٰ نے آدم کو علوم سکھا دیئے۔

وعلم آدم الاسماء کلها

اور جب آدم نے اللہ تعالیٰ کے ان صفاتی علوم کو بیان کرنا شروع کیا تو فرشتے دم بخود رہ گئے اور انھوں نے اس بات کا اعتراف کیا کہ بار الہا ہم نہیں جانتے۔ ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں جتنا علم آپ نے ہمیں سکھا دیا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ آدم زاد کو وہ علوم حاصل ہیں جو فرشتوں کو بھی حاصل نہیں ہیں۔ اگر آپ ان علوم کو سیکھنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ ان علوم سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ اپنے بزرگوں کی طرح اپنے آباؤ اجداد کی طرح قرآن کو پڑھیں۔ معانی پڑھیں اور قرآن کے اندر غور و فکر کریں۔ قرآن کے اندر اللہ تعالیٰ کے چھپے ہوئے خزانوں کو تلاش کریں۔ یہ سب اسی وقت ہو سکتا ہے جب ہمارے اندر سوچنے سمجھنے اور گہرائی میں اترنے کا جذبہ پیدا ہو۔ سطحی کام نہ ہو۔ سطحی نتیجہ' ٹھیک ٹھیک فائدہ جب ہی مرتب ہوتا ہے جب اس کام کے اندر آپ کی عقل بھی کام کرتی ہو اور تفکر بھی کام کرتا ہو اور آپ گہرائی میں اس کام کے بارے میں سوچتے ہوں' سمجھتے ہوں۔

قرآن کا مطالبہ نوع انسانی سے یہ ہے کہ تمام انسان آدم کے رشتہ سے بھائی بھائی

ہیں۔لیکن اگر ان بھائیوں میں اللہ تعالیٰ پر ایمان نہ ہو' اللہ کے پیغمبروں پر ایمان نہ ہو' اللہ کی کتابوں پر ایمان نہ ہو یوم آخرت پر ایمان نہ ہو' تو وہ نوع انسانی کے رشتے سے بھائی بھائی تو ہیں۔لیکن ایک کنبہ نہیں ہیں۔

نوع انسانی میں سے وہ افراد جو اللہ پر اور اللہ کے رسولوں پر ایمان لاتے ہیں وہ ایک برادری ہیں۔ ایسی برادری جس کا ہر فرد اپنی جگہ ایک اہمیت رکھتا ہے۔ ایسی برادری کا نام مسلمان رکھا ہے اور اس برادری کی طرز فکر اور اس برادری کی زندگی گزارنے کے طور طریقوں کا نام اسلام ہے۔اللہ تعالیٰ برادری کے لئے فرماتے ہیں'

"(بحیثیت برادری) اللہ کی رسی مضبوطی کے ساتھ پکڑ لو اور آپس میں تفرقہ بازی نہ ڈالو۔"

ہم جانتے ہیں کہ اگر برادری میں تفرقہ پڑ جائے تو برادری نہیں رہتی' طاقت ٹوٹ جاتی ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اللہ کی رسی کو متحد ہو کر مضبوطی سے تھام لو اور اس میں رخنہ نہ ڈالو۔اور جب کوئی قوم مضبوط اور متحد ہو جاتی ہے اور اس کے اندر تفرقہ بازی نہیں ہوتی تو اس کی اپنی ایک شان ہوتی ہے۔رسول اللہ ﷺ کے دور میں اور خلفائے راشدین کے دور میں جتنی فتوحات ہوئی ہیں جتنا اسلام پھیلا ہے۔آپ تاریخ پڑھ کر دیکھیں اس اسلام کے پھیلنے کی جہاں اور بہت ساری وجوہات ہیں ایک بڑی اور بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس وقت مسلمانوں میں تفرقہ نہیں تھا اس وقت مسلمان ایک جان تھا۔اکٹھے تھے دشمن کی سب سے بڑی کامیابی اور دشمن کی سب سے بڑی چال یہ ہوتی ہے کہ وہ قوموں میں فوجوں میں' لشکروں میں تفرقہ ڈال دیتا ہے اور جب فوج میں لشکروں میں تفرقہ پڑ جاتا ہے تو دشمن مضبوط ہو جاتا ہے اور دشمن ایسی قوموں کو ختم کر دیتا ہے جس کی اپنی کوئی طاقت نہیں ہوتی اور یہ آج ہم دیکھ رہے ہیں۔اللہ اکبر نماز میں کتنا بڑا مجمع ہوتا ہے۔سب بھائی کندھے سے کندھا لگائے کھڑے ہوتے ہیں' جھکتے ہیں' سلام پھیرتے ہیں۔کتنا عظیم الشان مظاہرہ اتحاد اور طاقت کا ہوتا ہے۔

روزے کو دیکھیں صبح کو اللہ اکبر کہہ کر اذان ہوئی سب مسلمانوں کے منہ بند ہو گئے۔پانی

کا ایک قطرہ حلق کے نیچے نہیں جا سکتا۔اور جب افطار کا وقت آیا پھر اللہ اکبر کی آواز پر تمام مسلمان ایک ساتھ روزہ افطار کرتے ہیں۔تو یہ روزے' پانچ وقت کی نماز' جمعہ کی نماز' عیدین کی نمازیں' حج' حج میں آپ دیکھیں ہر سال تقریباً (۲۰) لاکھ آدمی ایک مرکز پر اللہ کے گھر میں جمع ہو جاتے ہیں اور ہر شخص اللہ کے گھر کا طواف کرتا ہے۔

اسلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اسلام نام ہے مرکزیت کا۔ اسلام نام ہے اتحاد کا۔اسلام نام ہے برادری سسٹم کا جس میں برادری کا ہر فرد معزز ہے۔ عزت دار ہے اس کی اپنی ایک رائے ہے اس کا اپنا ایک مقام ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا ہے۔

"اللہ نے جو نظام قائم کر دیا ہے اس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی اور کبھی اس میں تعطل واقع نہیں ہوتا۔"

جو اللہ نے نظام بنا دیا وہ چلتا رہتا ہے۔اب انبیاء کا سلسلہ تو ختم ہو گیا۔اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب محمد رسول اللہ ﷺ پر اپنی تمام نعمتیں پوری کر دیں اور دین مکمل کر دیا۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میری سنت میں تبدیلی نہیں ہوتی اور تعطل واقع نہیں ہوتا۔ اب انبیاء تو آئیں گے نہیں اس لئے کہ نبوت ختم ہو گئی ہے۔رسول اللہ ﷺ خاتم النبیین ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے اللہ کی دی ہوئی تعلیمات کو نوع انسان تک پہنچانے کے لئے ایک سلسلہ قائم کیا اور وہ سلسلہ اولیاء اللہ کا سلسلہ ہے۔

اولیاء اللہ ہمیں بتاتے ہیں کہ ہم کیوں ذلیل و خوار ہیں اور ہمارے اسلاف کیوں عزت و مرتبت والے تھے۔دیکھئے میں نے ابھی آپ سے عرض کیا کہ ہر عمل میں ایک روح ہوتی ہے اگر ہمیں کامیاب ہونا ہے' اگر ہمیں دنیا میں اپنا کوئی مقام تلاش کرنا ہے' اگر ہمیں اپنی نسلوں کو تباہی سے محفوظ رکھنا ہے تو یہ ضروری ہے کہ ہم اس جسمانی نظام کو سنبھالنے والی اس شے سے جس کا نام روح ہے واقفیت حاصل کریں۔جب تک روح

انسان کے جسم کے ساتھ رہتی ہے۔ انسان کا جسم حرکت کرتا رہتا ہے اور جب روح انسان کے جسم سے اپنا رشتہ توڑ لیتی ہے تو انسان مر جاتا ہے اور لاش بن جاتا ہے۔ ہم سب نے مرے ہوئے آدمی دیکھے ہیں۔ ہاتھ بھی ہوتے ہیں' پیر بھی ہوتے ہیں' آنکھ' ناک' کان بھی ہوتے ہیں۔ کھوپڑی کی ہڈیاں الگ الگ کی جائیں تو اندر ہمیں بھیجا بھی ملے گا' آنکھ کے اندر پتلی بھی ہوتی ہے لیکن ان سب چیزوں کے باوجود اگر روح نے اس جسم سے اپنا رشتہ منقطع کر لیا ہے تو انسان نہ بول سکتا ہے نہ کھا سکتا ہے' نہ اٹھ سکتا ہے' نہ بیٹھ سکتا ہے' نہ چل سکتا ہے کیوں؟ اس لئے کہ روح اصل ہے' روح کی بدولت ہی جسمانی حرکات و سکنات قائم ہیں۔ روح اگر نہیں ہے تو جسم کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حبیب رسول اللہ ﷺ نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ ہر امتی کے اوپر فرض ہے کہ وہ یہ تلاش کرے کہ یہ جسمانی نظام چلتے چلتے رک کیوں جاتا ہے' مر کیوں جاتا ہے۔ وہ کونسی چیز ہے جو اس جسم کو سنبھالے ہوئے ہے جو جسم کے اندر موجود رہتی ہے تو جسم حرکت کرتا رہتا ہے اور جب وہ روح اس جسم سے اپنا رشتہ منقطع کر لیتی ہے تو آدمی کی تمام حرکات و سکنات ختم ہو جاتی ہیں۔ اس ہی روح کو تلاش کرنے کے لیے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے دوست اور وارث علماء اولیا اللہ نے ایک نظام قائم کیا ہے اور اس نظام کا نام مراقبہ ہے۔ وہ مراقبہ جو حضور ﷺ نے غار حرا میں فرمایا تھا۔

اگر ہم اپنی روح سے واقف ہو جائیں تو یقیناً ہمیں وہی عروج نصیب ہو جائے گا جو ۱۴۰۰ سال پہلے ہماری قوم کا شعار تھا اور جیسے جیسے ہم اپنی روح سے بے خبر ہوتے چلے گئے اسی مناسبت سے ہم دنیا میں حکمرانی سے محروم ہوتے رہے۔

مراقبہ ایک ایسا عمل ہے جس میں پریکٹس اور کوشش کی جاتی ہے کہ انسان مادی خیالات اور کثیف وسوسوں سے ذہن ہٹا کر صرف اور صرف لطافت پاکیزگی اور انور کے اندر ذہن کو مرکوز کرے۔ رسول اللہ ﷺ نے مراقبہ کو مرتبہ احسان کا نام دیا ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ بھی ارشاد ہے۔

موتو قبل انت موتو

مر جاؤ مرنے سے پہلے

یعنی اس دنیا میں رہتے ہوئے مرنے کے بعد کی زندگی سے واقفیت حاصل کر لی جائے۔ ہر شخص کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس دنیا میں رہتے ہوئے اس بات کو جان لے کہ مرنے کے بعد جس عالم میں جانا ہے وہ عالم کیا ہے۔ اور اس عالم میں آسائش و آرام اگر مجھے حاصل کرنا ہے تو اس کا طریقہ کیا ہے اس بات کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس طرح بیان فرمایا موتو قبل انت موتو مر جاؤ مرنے سے پہلے۔ یعنی مرنے سے پہلے مرنے کے بعد کی زندگی سے واقف ہو جاؤ۔

مرنے کے بعد کی زندگی سے واقفیت حاصل کرنے کا طریقہ صرف اپنی روح سے واقفیت حاصل کرنا ہے۔

☆☆☆

''بی بی سی کے لیئے ایک انٹرویو''

آج ہمارے اسٹوڈیو میں خواجہ شمس الدین عظیمی تشریف لائے ہیں۔ آپ روحانی ڈائجسٹ کے ایڈیٹر ہیں۔ آپ کے جاننے والے جو برطانیہ میں رہتے ہیں وہ آپ کو شاید روحانی ڈاک جنگ لندن کے انچارج ہونے کی حیثیت سے زیادہ جانتے ہوں گے۔ آج کل آپ برطانیہ میں تشریف لائے ہوئے ہیں۔ آپ ۱۵ اگست کو امریکہ جانے والے ہیں۔ میں آپ کی بہت مشکور ہوں کہ آپ ہمارے پاس تشریف لائے۔ عظیمی صاحب سب سے پہلے میں آپ سے یہ سوال پوچھنا چاہوں گی کہ روحانی ڈاک جنگ لندن میں آپ نے بہت سے مسائل کا حل رنگ اور روشنیوں کے ذریعہ بتایا ہے۔ ان سے علاج کس طرح ممکن ہے۔

جواب: شکریہ۔ ہم جب غور کرتے ہیں تو کائنات کے اوپر ہمیں کوئی بھی چیز ایسی نظر نہیں آتی جو بے رنگ ہو یہ بھی سائنس سے ثابت ہو چکا ہے کہ آدمی رنگوں سے متاثر ہوتا ہے۔ اور یہ کہ مختلف رنگوں کی کمی بیشی سے مختلف امراض پیدا ہوتے ہیں۔ اور مختلف رنگوں کی زیادتی سے الجھنیں، ڈپریشن اور پریشانیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ہم رنگوں سے جو علاج پیش کرتے ہیں اس سے تقریباً ساٹھ ۶۰ فیصد لوگوں کو فائدہ ہوتا ہے اس میں ایک بڑی بات یہ ہے کہ اس میں خرچ کچھ نہیں ہوتا۔ صرف پانی یا لائٹ کا خرچہ ہوتا ہے۔ نیز اس علاج سے کسی قسم کا ری ایکشن نہیں ہوتا۔

سوال: مجھے بتائیے کہ روحانی علم اور سائنس کا جو علم ہے۔ ان دونوں میں کیا فرق ہے۔

جواب: سائنس خود ہی سارا روحانی علم ہے ہم اس وقت تک کوئی بھی علم نہیں سیکھ سکتے جب تک کہ اس علم کا خیال ہمارے ذہن سے نہ آئے۔ خیال جہاں آتا ہے اس خیال کو ہم قبول کرتے ہیں۔ اس کو روحانیت میں یہ کہا جاتا ہے کہ خیالات کی قبولیت روح کے اندر ہے۔ اور روح جب جسم سے نکل جاتی ہے تو باوجود اس کے کہ گوشت پوست کا آدمی بھی رہتا ہے۔ دماغ بھی رہتا ہے۔ بھیجا بھی رہتا ہے لیکن اس میں کسی قسم کے علم سیکھنے یا کسی قسم کے علم

پھیلانے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔

سوال: آپ کے نظریے سے روحانی علم سیکھنے کا کیا طریقہ ہے۔

جواب: روحانی علم سیکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان کو ایک وقت مقرر کر کے اپنے ذہن کو کسی ایک نقطے پر مرکوز کر کے کنسنٹریٹ (Concentrate) کرنا چاہیئے۔ جیسے جیسے انسان کنسنٹریشن پر قابو پالیتا ہے۔ کامیابی حاصل کرتا ہے جس طرح ہم جسمانی آنکھوں سے بہت ساری چیزوں کو دیکھتے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق انسان کے اندر روح بھی ہوتی ہے۔ کنسنٹریشن سے روح کی آنکھ کھل جاتی ہے اور اس سے ہم ٹائم اسپیس سے گزر کر ماورائی دنیا میں داخل ہو جاتے ہیں۔

سوال: یہاں پر آپ جانتے ہیں کہ ماحول مغربی ہے کیونکہ ہم ویسٹ میں رہ رہے ہیں اور ہمارے والدین عام طور پر بچوں کی طرف سے پریشان رہتے ہیں کہ وہ بہت مغربی ہوتے جارہے ہیں۔ آپ کے نزدیک کوئی ایسا راستہ ہے، آپ کا روحانی راستہ جس سے یہ پریشانی دور ہو سکے۔

جواب: جی ہاں۔ روحانی راستہ یہی ہے کہ ہر شخص اپنے مذہب کے مطابق خود عمل کرے۔ دراصل بات یہ ہے کہ میں نے جو یہاں پر تجربہ کیا ہے کہ والدین جو کچھ اولاد سے چاہتے ہیں خود اس پر عمل نہیں کرتے۔ اسی وجہ سے اولاد والدین کے اثرات کو قبول نہیں کرتی اور ماحول میں جو اثرات ہیں انھیں زیادہ سے زیادہ قبول کرتی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ والدین خود اپنی زندگی کو اس طرح ڈھالیں کہ اپنی اولاد کے لیئے نمونہ بن جائیں۔ نتیجتاً اولاد خود بخود ان کی زندگی کی پیروی کرے گی۔ دوسری بات یہ ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ والدین اپنی اولاد پر غصہ بہت کرتے ہیں۔ ان کی تربیت وہ غصہ سے کرنا چاہتے ہیں۔ جب کہ یہاں کے ماحول میں جو تربیت ہے اس میں غصہ نہیں ہے۔ بچے والدین کے غصہ کی وجہ سے ان سے دور ہو جاتے ہیں۔ اور یہاں کے ماحول سے یعنی اسکول کی اپنی ٹیچر سے قریب ہو جاتے ہیں۔ اسی لیئے ان کے ماحول کی جو بنیادی چیزیں ہیں ان کو قبول کر لیتے ہیں اور والدین کے ماحول

کو قبول نہیں کرتے۔

سوال: آپ کا کہنا ہے کہ بعض جگہ پر میڈیٹیشن کے لئے روح سے واقفیت ضروری ہے۔ کیا آپ بتائیں گے کہ ایسا کیوں ہے۔

جواب: اس لیئے کہ ہمارے سامنے یہ تجربہ ہے کہ جب آدمی مرجاتا ہے تو جسم کا گوشت پوست تو باقی رہتا ہے۔ اس کے اندر زندگی کی کوئی حرکت باقی نہیں رہتی۔ اس کا مطلب ہے کہ جب تک روح جسم کے ساتھ ہے جسمانی حرکات و سکنات موجود ہیں۔ جب روح جسم سے نکل جاتی ہے تو جسم رہنے کے باوجود اس میں کوئی حرکت باقی نہیں رہتی۔ اس لیئے یہ ضروری ہے کہ ہم اس جسم کی باہر کی دنیا سے یا جسم کی اندر کی دنیا سے واقفیت حاصل کرنا چاہیں تو ہمیں اس روح سے واقف ہونا پڑے گا جس روح نے اس جسم کو سنبھالا ہوا ہے۔ اور جب روح اس جسم سے اپنا رشتہ منقطع کر لیتی ہے تو آدمی مرجاتا ہے۔

سوال: آپ سے ایک سوال یہ ہے کہ میں نے کچھ کالم پڑھے ہیں۔ وطن میں بھی آتے ہیں۔ روحانیت پر جنگ میں بھی آتے ہیں۔ لوگوں نے بحث کی ہوتی ہے کہ ہم درود شریف کا ورد کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کی طرف سے اجازت ہے۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ اجازت کی ضرورت کیوں ہوتی ہے۔

جواب: یہاں صورت حال یہ ہے کہ جب ہم کوئی وظیفہ پڑھتے ہیں تو اس وظیفہ کا ہمارے اوپر اثر مرتب ہوتا ہے۔ اس سے ہمیں فائدہ ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس سے ہمیں فائدہ ہو رہا ہے اس میں کوئی نہ کوئی طاقت موجود ہے۔ تو اجازت اس لیئے ضروری ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ کسی آدمی کے اندر کتنا وظیفہ پڑھنے کی، کتنا عمل کرنے کی اور کسی لفظ کو دہرانے کی کتنی سکت موجود ہے۔ ایک روحانی آدمی یہ جانتا ہے کہ اس آدمی میں کتنی سکت ہے اور جس لفظ کا وہ ورد کرنا چاہتا ہے اس کے لیئے اس کے اندر کتنی سکت ہے۔ اسی حساب سے اسے اجازت دیتا ہے یا اجازت نہیں دیتا۔

سوال: لیکن اخبار کے ذریعے یا خط کے ذریعے آپ کو کس طرح پتہ چلتا ہے کہ اس کی آپ کو اجازت دینی چاہیئے یا نہیں۔

جواب: یہ ہم میڈیٹیشن کے ذریعے معلوم کر لیتے ہیں ہمارے پاس جو خط آتا ہے ہم اس کی تحریر اور اس کے نام سے اپنی آنکھیں بند کر کے دیکھتے ہیں۔ جو کچھ ہمیں اس آدمی کے مطابق معلومات ہوتی ہیں اسی حساب سے ہم اسے اجازت دیتے ہیں یا منع کر دیتے ہیں۔

☆☆☆

باب نہم

''خواب اور بیداری''

سوال: آپ نے اپنی تحریروں میں لکھا ہے کہ انسان کی آدھی زندگی خواب کے حواس میں گزرتی ہے اور باقی آدھی بیداری کے حواس میں گزرتی ہے۔ آپ بیداری کے حواس کو مفروضہ (Fiction) حواس کا نام دیتے ہیں جبکہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ دنیا کی پوری تاریخ کا دارو مدار، دنیا میں موجود تمام علوم کا انحصار بیداری کے حواس پر ہے۔ اگر بیداری کے حواس نہ ہوں جن کو آپ مفروضہ حواس بیان فرماتے ہیں تو انسان کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے وضاحت فرمادیں۔

آپ نے اپنی ایک تحریر میں جنات کو انسانوں سے زیادہ غم خوار ہمدرد فرمایا ہے کیا ایسا کہنا اشرف المخلوقات یعنی انسان کی توہین نہیں۔

جواب: علم مابعد النفسیات میں ان علوم سے بحث کی جاتی ہے جو طبیعات اور نفسیات کی نفی کرتے ہیں سب سے پہلے ہمیں یہ تلاش کرنا ہے کہ ہمارے اندر جو حواس کام کر رہے ہیں اور جن کو ہم بیداری کے حواس کے نام سے جانتے اور پہچانتے ہیں وہ کس طرح بنتے ہیں اور ہمیں کہاں سے وصول ہو رہے ہیں؟ یاد رکھیے! ہمارے اندر جو حواس کام کر رہے ہیں ان کا وجود مستقل نہیں ہے، ابھی ہم خوش ہو رہے ہیں اور پھر ناخوش ہو جاتے ہیں ہم ہر قدم پر حواس کی گرفت میں اس طرح جکڑے اور بندھے ہوئے ہیں کہ ہماری اپنی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔

من حیث المجموع ہم کسی ایک تصور کسی ایک خیال، کسی ایک احساس یا کسی ایک عمل کو خوشی اور راحت کا ذریعہ قرار نہیں دے سکتے۔ ایک خیال ایک تصور یا عمل اگر میرے لیے خوشی اور راحت کا سبب ہے تو یہی عمل دوسرے فرد کے لیے انتہائی تکلیف دہ اور اذیت

ناک ہوتا ہے۔

اگر ایک شخص اولاد کی زیادتی سے پریشان اور بدحال ہے تو دوسرا شخص اولاد نہ ہونے کی وجہ سے مایوس اور ناامید ہے۔ اگر ایک آدمی افلاس اور تنگدستی سے عاجز آیا ہوا ہے تو دوسرا آدمی عیش وعشرت کی کثرت سے دماغی کشمکش اور اعصابی کشیدگی میں مبتلا اور بے چین ہے ایک آدمی سب کچھ ہوتے ہوئے بھی سکون کی دولت سے محروم ہے؛ جس کے پاس وسائل نہیں ہیں وہ اس لیے بے چین اور مضطرب ہے کہ اسے وسائل حاصل نہ ہونے کی شکایت ہے اور جس کے پاس وسائل کا انبار ہے وہ اس لیے بے چین اور مضطرب ہے کہ ان وسائل نے اس کی ذہنی آزادی کو سلب کر لیا ہے۔

کہا جاتا ہے۔ دنیا میں سب سے زیادہ محبت ماں کو اولاد سے ہوتی ہے مگر ہمارا عام مشاہدہ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ماں بھی اولاد کو بھول جاتی ہے۔ شوہر بیوی کو بھول جاتا ہے اور بیوی شوہر کی جدائی کو فراموش کر دیتی ہے، آج اگر ہمارے اوپر خوشی اور مسرت کے حواس غالب ہیں تو ہم غم واندوہ سے لبریز حواس کو اس طرح نظر انداز کر دیتے ہیں کہ وہ کبھی ہمارے اوپر مسلط ہی نہیں ہوئے تھے اور اگر آج ہمارے اوپر غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہیں تو ہم اس زندگی جس کو خوشیوں سے لبریز زندگی قرار دیتے ہیں سے اس طرح گذر جاتے ہیں کہ یاس اور ناامیدی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیتے ہیں۔ ان تمام حقائق کی موجودگی میں ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ہم بیداری کے جن حواس میں زندگی گزار رہے ہیں وہ مفروضہ نہیں ہیں۔ یہ بات بہت غور طلب اور اہم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی انسان کو پابند اور مقید پیدا نہیں کیا۔

قرآن پاک کے بیان کردہ قانون کی روشنی میں اصل انسان حواس کا پابند کبھی نہیں ہوا حواس ہمیشہ انسان کے پابند رہے ہیں۔

آئیے! یہ تلاش کریں کہ انسان کو حواس، سوچنا، سمجھنا متاثر ہونا، غم زدہ یا خوش ہونا، زندہ رہنے کی کوشش کرنا یا موت سے ہم آغوش ہو جانا کہاں سے ملے ہیں اور ان کی حیثیت کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ ''اے آدم تو اور تیری بیوی جنت میں رہو۔ اور جہاں سے تمہارا دل چاہے خوش ہو کر کھاؤ پیؤ تمہارے اوپر زمانیت اور مکانیت کی کوئی پابندی نہیں ہے' لیکن دیکھنا اس درخت کے قریب نہ جانا۔ ورنہ تم اپنے اوپر قید و بند کا عذاب مسلط کر لو گے۔ وہ درخت گندم کا درخت ہرگز نہیں ہے۔ وہ درخت ہے حواس کا' ایسے حواس کا جو انسان کو ہمیشہ پابند اور مقید رکھتے ہیں درخت معنوی نقطہ نظر سے ایک ایسی چیز کو کہا جاتا ہے کہ جس میں شاخ در شاخ پتے اور پھل کی موجودگی پائی جاتی ہو۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ اے آدم زماں و مکان کی پابندی قبول نہ کرنا ورنہ تو اس میں اس طرح جکڑا جائیگا۔ جس طرح کسی درخت کی شاخ میں سے شاخ اور پھر شاخ میں سے شاخ اور ہر شاخ میں بے شمار پتے ہوتے ہیں اور جب تو اس قید و بند کو آزادی اور خوشی کے بدلے قبول کرلے گا تو اپنے اوپر ظلم کرے گا۔ فتکونا من الظالمین۔

اور جب آدم نے قید و بند کی زندگی کو اپنا لیا تو جنت نے جو آزاد اور زماں اور مکاں کی پابندیوں سے ماوراء مقام ہے۔ اسے رد کر دیا۔ چونکہ انسان جنت کے حواس کھو بیٹھا جو اس کے اپنے اصلی حواس ہیں۔ اس لیے انسان یا آدم کو زمین پر پھینک دیا گیا جہاں وہ پابندی اور قید و صعوبت کے حواس میں گرفتار ہے علم مابعد النفسیات کا یہ کہنا ہے کہ زمین کے اوپر کام کرنے والے حواس مفروضہ ہیں اس لیے کہ یہ انسان کے اصل حواس نہیں ہیں بلکہ عارضی اور نقلی ہیں۔

انسان کے اصل حواس وہ ہیں جہاں اس پر زماں و مکاں کی حد بندیاں عائد نہیں ہوتیں۔ اگر انسان ان عارضی اور نقلی حواس کے تسلط سے نجات پا جائے تو پھر وہ اپنے اصلی اور آزاد حواس کو حاصل کر سکتا ہے۔ جس میں نہ غم کو دخل ہے نہ پریشانی کو اور نہ جذباتی کش مکش' اعصابی کشیدگی اور دل و دماغ کے کرب کی داستانیں ہیں۔

نوع انسان کی تاریخ میں ایسی ایک مثال بھی پیش نہیں کی جاسکتی کہ انسان بیداری اور سونے کی حالتوں میں سے کسی ایک حالت پر قدرت رکھتا ہو انسان جس طرح سونے پر مجبور

ہے بالکل اسی طرح بیداری بھی اس کی طبیعت کا ایسا تقاضہ ہے۔ جس کو وہ کسی صورت میں رد نہیں کر سکتا۔ بیداری کے اعمال و واقعات میں انسان کا دماغ جس طرح توہمات خیالات' تصورات اور عمل کرنے کی تحریات کی آماجگاہ بنا رہتا ہے۔ بالکل اس طرح خواب میں انسانی دماغ ایک لحہ چین سے نہیں بیٹھتا خواب کے اندر کیے ہوئے اعمال اگر حافظہ کی گہرائی میں نقش ہو جاتے ہیں۔ تو وہ اسی طرح یاد رہتے ہیں جس طرح بیداری میں کیا ہوا عمل یاد رہتا ہے اگر بیداری کا عمل حافظ کی گہرائی میں نقش نہ ہو تو وہ اس طرح بھول کے خانے میں جا پڑتا ہے۔ جس طرح خواب میں کیے ہوئے اعمال فراموش ہو جاتے ہیں۔ یہ کوئی تمثیل نہیں ہے عام تجربات اور مشاہدات ہیں۔ ہر شخص کی زندگی پیاز کے چھلکوں کی طرح لپٹی ہوئی ہے۔ حضرت یوسفؑ کے قصہ میں اللہ تعالیٰ نے خواب کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام ابھی زندان میں ہی تھے بادشاہ نے خواب میں دیکھا'' سات موٹی گائیں ہیں اور سات دبلی گائیں موٹی کو نگل گئیں اور سات سرسبز شاداب بالیں ہیں اور سات خشک اور سات خشک نے سات سرسبز شاداب بالوں کو کھا لیا۔'' بادشاہ اس عجیب و غریب خواب سے پریشان خاطر اور حیران تھا درباریوں سے خواب بیان کیا اور خواب کی تعبیر چاہی۔ درباری بھی اس خواب کو سن کر فکر اور حیرانی کے عالم میں گرفتار ہو گئے اور خواب کی تعبیر بیان نہیں کر سکے اور اپنی درماندگی اور بے چارگی کو چھپانے کے لیے کہا'' بادشاہ! یہ خواب نہیں ہے بلکہ پریشان خیالی ہے ہم سچے خواب کی تعبیر تو دے سکتے ہیں مگر خیالات کا حل ہمارے پاس نہیں ہے۔ بادشاہ اس جواب سے مطمئن نہیں ہوا اسی اثناء میں ساقی کو اپنا خواب اور حضرت یوسفؑ کی تعبیر کا واقعہ یاد آ گیا ساقی نے بادشاہ کی خدمت میں عرض کیا اگر آپ فرمائیں تو میں اس کی تعبیر لا سکتا ہوں۔ بادشاہ کی اجازت سے وہ اسی وقت قید خانہ پہنچا اور حضرت یوسفؑ کو بادشاہ کا خواب سنا کر عرض کیا'' آپ اس خواب کا تجزیہ کیجئے۔ آپ سچائی اور تقدس کے پیکر ہیں۔ آپ ہی اس کو حل کر سکتے ہیں۔'' قرآن پاک فرماتا ہے۔'' کہا یوسف نے' تم لگاتار سات برس کھیتی کرو گے۔ اپنے استعمال کے علاوہ سب کی سب بالوں کو محفوظ کر دو۔ اس

کے بعد سات برس سختی کے آئیں گے جن میں کوئی فصل نہ ہوگی۔ اس وقت یہ محفوظ غلہ تمہارے کھانے کے کام آئے گا۔'' اس خواب سے جہاں خواب یا خواب میں دیکھے ہوئے حالات کی تائید ہوتی ہے وہاں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ خواب مستقبل کی نشاندہی بھی کرتا ہے جس کو ہم غیب کے علاوہ اور کچھ نہیں کہہ سکتے۔

انسان خواب اور بیداری کے حواس کا مجموعہ اس لیے ہے کہ اس کے ساتھ غیب کے حواس چپکے اور لپٹے ہوئے ہیں۔ اگر انسان کے اندر خواب کے حواس یا مستقبل کے حالات سے متعلق تحریکات نہ ہوتیں تو انسان کبھی بھی مستقبل میں قدم نہیں رکھ سکتا تھا۔ جنت جہاں ماضی ہے وہاں مستقبل بھی ہے۔ جو انسان کا اپنا اصلی مقام اور وطن ہے اگر بیداری کے حواس خواب کے حواس سے زیادہ ہوتے تو انسان خواب کی دنیا (جنت، دوزخ) میں اپنے ارادہ کے تحت اپنے لیے کوئی مقام منتخب نہیں کرسکتا تھا۔

جنات کو انسانوں سے زیادہ ہمدرد اور غم خوار کہہ کر انسانوں کی ہرگز توہین نہیں ہوئی۔ کیونکہ فی الواقع ایسا ہی ہے۔ اور یہ بات کہ انسان اشرف المخلوقات ہے تو اس حیثیت میں وہی انسان جنات سے اشرف ہیں جو اشرف المخلوقات کے دائرہ میں قدم رکھ چکے ہیں۔ عام انسان اشرف المخلوقات کہلانے کا ہرگز مستحق نہیں ہے اور اس کی تائید قرآن پاک سے اس طرح ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ زمین پر چلنے والے کسی جانور اور ہوا میں اڑنے والے کسی پرندے کو دیکھ لو یہ سب تمہاری ہی طرح کی انواع ہیں...... (سورۂ انعام)

حقائق بہت تلخ ہوتے ہیں مگر یہ واقعہ ہے کہ جنات میں انسانوں سے زیادہ عارف ہوتے ہیں۔ اشرف المخلوقات اس انسان کو کہا جاتا ہے کہ جو زماں اور مکاں کی حد بندیوں سے آزاد ہو کر خالق حقیقی کا عرفان رکھتا ہو۔ عرفان بھی کائنات میں عام موجودات کا سا نہیں بلکہ ایسا عرفان رکھتا ہو جس سے خائف ہو کر سماوات وارض اور جبال نے انکار کردیا ہے کہ ہم اس کے متحمل نہیں ہیں۔ ہم نے اپنی امانت پیش کی مگر سب نے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ ہم اس کے متحمل نہیں ہیں اگر ہم نے اسے اپنے نحیف کندھوں پر اٹھالیا تو بے شک ہم نابود ہو جائیں

گے اور انسان نے قبول کرلیا۔

میں نہ قوم کے جذبات سے کھیلنا چاہتا ہوں اور نہ ہی گمراہ کرنا میرا شیوہ ہے البتہ ہمارے سامنے پروگرام ضروری ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ میں نوع انسانی کو اس زندگی سے روشناس کردوں جس زندگی میں نہ حزن ہے نہ ملال ہے، خوف اور نہ غم ہے۔ اور جس زندگی میں خوشیاں اور راحتیں ان کی ہاتھ باندھی غلام ہیں۔ یہ وہ زندگی ہے جس میں انسان زماں اور مکاں کی پابندیوں سے آزاد ہو کر لامحدود وسعتوں کے ساتھ زندہ رہتا ہے۔ جہاں کھوکھلے نظریات، گھٹیا اخلاق اور بے ہودہ عبادات کو قطعاً دخل نہیں ہے۔

اگر زندگی میں سے تجسس اور تلاش کو نکالا جائے تو زندگی ناپید ہو کر رہ جائے گی۔ آدم کی پیدائش سے آج تک نوع انسانی کی مجموعی زندگی جن مراحل سے گزری ہے ان میں ہر مرحلہ تجسس اور تلاش کے تانے اور بانے سے بنا ہوا ہے اس صدی کے انسانوں کو جس قدر وسائل آج مہیا ہیں اور جتنی قسمیں علوم وفنون کی آج ہمارے سامنے ہیں، کیا وہ سب تلاش کے بغیر ممکن تھیں آرام و آسائش سے متعلق ایجادات مثلاً ٹیلیویژن، ٹیلیفون، ریڈیو سب کے سب تجسس ہی کی وجہ سے موجود ہیں۔



''مسلمان اور تسخیر کائنات''

سوال: آج کا مسلمان دوسری اقوام کے آگے دست دراز ہے' مجبور ہے' لاچار ہے۔ غرض ہر طرح سے اپنے وجود کی سلامتی کے لیے دوسروں کا محتاج ہے۔ آپ کے نزدیک وہ کون سا ایسا عمل ہے جن کو اپنا کر مسلمان شعوری پستی سے نکل سکتے ہیں۔

جواب: آج سائنس نے اس بات کا سراغ لگا لیا ہے کہ دنیا میں موجود ہر شے' اس میں آدم زاد ہو' کوئی درخت ہو' درخت کے پتے ہوں' آبی مخلوق ہو' زمین کی مخلوق ہو' چوپائے ہوں یا پرندے' ساری مخلوق اپنے جسم کے ساتھ ساتھ ایک اور جسم رکھتی ہے جو ظاہرہ آنکھ سے نظر نہیں آتا۔ سائنس دانوں نے ایسے کیمرے ایجاد کر لے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ گوشت پوست سے مرکب جسم پر ایک اور جسم موجود ہے اور یہ جسم ایسی روشنیوں سے بنا ہوا ہے جو روشنیاں گوشت پوست کی آنکھ سے تو نظر نہیں آتیں۔ لیکن ان کی موجودگی کا یقین کیمرے کے لینس سے ضرور ہو جاتا ہے۔ سائنس نے یہ بھی تحقیق کیا ہے کہ جسمانی خدوخال کے اوپر روشنی کا یہ آدمی یا روشنی کا یہ ہیولا کچھ دیر تک قائم رہتا ہے مثلاً ایک آدمی کسی جگہ کچھ دیر کے لئے بیٹھا یا کھڑا رہا اور وہاں سے چلا آیا وہ آدمی یا وہ پرندہ یا وہ چوپائے جس جگہ بیٹھا یا کھڑا رہا وہاں اس کا ہیولا چند سیکنڈ تک قائم رہتا ہے۔

سائنس کی تحقیق سے الگ ہو کر کچھ مشاہدات ایسے ہیں جو ہر آدمی کی زندگی میں داخل ہیں۔ مثلاً یہ کہ دو آپس میں ملنے والے دل یا جسم جدائی سے بے حال ہیں اور فراق کی گھڑیاں گن گن کر گذارتے ہیں۔ جب ملتے ہیں تو ہر دو افراد کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کے جسم میں ایک کرنٹ سا دوڑ گیا ہو' چوں کہ یہ بات عام زندگی کا معمول نہیں ہے اس لئے آدمی اس کو ایک اتفاق یا بہت سی دوسری باتوں کی طرح انہونی کہہ کر گذر جاتا ہے۔ جب کوئی باپ یا کوئی ماں اپنے چھوٹے بچے کو سینے سے لگا کر ایک محویت کے عالم میں ذہنی طور پر یکسو ہو جائے۔ تو محسوساتی طریقے پر آدمی یہ قبول کرتا ہے کہ بچے کے جسم کے اندر سے کوئی چیز نکل کر ماں یا

باپ کے سینے میں جذب ہو رہی ہے بعض مرتبہ یہ کیفیت اتنی شدید ہوتی ہے کہ والدین کے اوپر ایک خمار کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ یہ ایک ایسی کیفیت ہے جس سے کوئی حلیم الطبع آدمی انکار نہیں کر سکتا۔ سوال یہ ہے کہ بچے کے اندر وہ کونسی شے ہے یا کونسی صفت ہے یا وہ کیا حرکت ہے جو سینے پر لٹانے کے بعد والدین کے جسم کے اندر اترتی ہوئی محسوس ہوتی ہے؟ یہ وہی روشنی ہے جو روشنی اپنے پورے خدوخال کے ساتھ اپنے پورے جسمانی اعضاء کے ساتھ کائنات کے ہر فرد کے جسم کے اوپر ہر آن' ہر لمحہ' ہمہ وقت موجود ہے۔ یہی وہ کیفیت ہے یا وہی روشنیاں ہیں جن روشنیوں کو کیمرے کے لینس نے محفوظ کر کے دکھا دیا ہے۔

ہماری بدنصیبی یہ ہے کہ ہم ایک ایسی قوم ہیں کہ جو چیزیں ہمہ وقت ہمارے سامنے آتی ہیں ہم ان کے اوپر بھی غور و تفکر نہیں کرتے۔ مخلوق کے اوپر روشنیوں کے اس غلاف کا تذکرہ قرآن پاک میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے ہم نے کبھی قرآن میں تفکر نہیں کیا۔ جب باہر سے کوئی چیز ہمیں ملی تو ہم اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ زبان سے ہم یہ کہتے ہیں کہ مسلمان قوم ہی اشرف المخلوقات کہلانے کی مستحق ہے۔ عمل ہمارا ایسا ہے کہ ہم چوپایوں کی صف میں کھڑے ہونے کے قابل نہیں ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ عیسائی' یہودی' ہندو' دوزخی ہیں۔ اس کے باوجود کہ ہم انھیں دوزخی کہتے ہیں ہم ان کے محتاج ہیں۔ ہم ان کی تحقیق اور ان کی ایجادات سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ دنیا میں اگر کوئی قوم یا فرد اُن لوگوں کی تحقیق سے اور ان لوگوں کی ایجادات سے فائدہ نہ اٹھائے تو وہ فرد دنیا میں چیونٹی سے کم حیثیت شمار کیا جائے گا اور اس کا اقوام عالم سے رشتہ ٹوٹ جائے گا۔

دوزخی کی تعریف یہ ہے کہ وہ ذلیل و خوار ہو' دوزخی کی تعریف یہ ہے کہ وہ مفلوک الحال ہو' دوزخی کی تعریف یہ ہے کہ وہ غلام ہو' محکوم ہو' بڑی عجیب بات ہے کہ جن لوگوں کو ہم دوزخی کہتے ہیں وہ مفلوک الحال نہیں ہیں۔ بزعم خود ہم جنتی لوگ انکے دست نگر ہیں۔ جن لوگوں کے بارے میں ہم یہ سمجھتے ہیں کہ وہ دوزخ کا ایندھن ہیں ہم ان کی ایجادات سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

یہ کہنا کہ کون دوزخی ہے کون جنتی ہے یہ اللہ ہی جانتا ہے لیکن کھلی آنکھوں سے جو چیز نظر آ رہی ہے وہ یہ ہے کہ محکومی محتاجی، دست نگری اور احساس کمتری جیسی صفات آج مسلمان قوم میں موجود ہیں اور یہ صفات مسلمان قوم میں اس لئے موجود ہیں کہ وہ کلمہ ضرور پڑھتی ہے لیکن اس کا کلمہ پڑھنا ہے لیکن اس کا کلمہ پڑھنا یقین کے دائرے میں داخل نہیں ہوا۔ ہر آدمی ہر مسلمان جو کچھ کہتا ہے عمل اس کے خلاف کرتا ہے۔ کہتا یہ ہے کہ میں موحد ہوں شرک نہیں کرتا۔ عمل یہ ہے کہ دولت کی پرستش کرتا ہے۔ ایسی چیز کی پرستش کرتا ہے جس کے بارے میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے عذاب الیم کی بشارت دی ہے۔ کہتا یہ ہے کہ میں مسلمان ہوں یعنی سلامتی میرا مسلک ہے۔ عمل یہ ہے کہ ہر آدمی اختلافی مسائل میں اور فروعی باتوں میں پھنسا ہوا ہے، فرقے ہیں کہ بنتے چلے جا رہے ہیں۔ ہر آدمی خود کو جنتی دوسروں کو دوزخی کہتا ہے۔ حالانکہ کسی فرقے کے پاس اس بات کی سند نہیں ہے کہ وہ جنتی ہے اور نہ وہ یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ میں دوزخی نہیں ہوں۔ یہ ساری باتیں کیوں ہیں؟ یہ سب اس لئے ہیں کہ مسلمان نے اپنا مقام نہ پہچاننے کی گویا قسم کھا لی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے مسلمانوں کو ایمان والوں کو کائنات میں فضیلت بخشی اور ہمارا یہ حال ہے کہ ہم کائنات میں تو دور کی بات ہے زمین کے چھوٹے سے کرہ پر ذلیل وخوار ہیں۔ کیا اللہ تعالیٰ نے ہمیں سوچنے سمجھنے تفکر کرنے اور نت نئی ایجادات کرنے کی صلاحیتوں سے محروم کر دیا ہے؟ کیا ہمارے اوپر پہرے لگا دیئے گئے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کی تخلیق میں تفکر نہ کریں؟ قرآن تو اس بات کی دعوت دے رہا ہے کہ تفکر کرو۔ اشیائے کائنات کی ماہیت میں ڈوب جاؤ اور دیکھو کہ کائنات کی اشیاء میں اللہ تعالیٰ کی کونسی صفات کام کر رہی ہیں۔ قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ جو قوم اپنی تبدیلی نہیں چاہتیں وہ زمین پر بوجھ بن جاتی ہیں۔ وہ محکوم اور غلام بن کر زندگی گذارتی ہیں۔ مسلمانوں کا دعویٰ یہ ہے کہ رسول ﷺ ہمارے ہیں۔ کتاب ہماری ہے۔ اللہ ہمارا ہے اور ہم کائنات پر حاکم بنائے گئے ہیں۔ لیکن آج ہمارا جو حال ہے وہ سب کے سامنے ہے۔

اللہ تعالیٰ بحیثیت رب کے سب کے رب ہیں۔ بارش جب برستی ہے تو تمام زمین پر

برستی ہے کسی مخصوص کھیت پر یا کسی مخصوص کیاری پر یا کسی مخصوص ٹکڑے پر بارش نہیں برستی۔ جس زمین پر کسان ہل چلا دیتا ہے، بیج ڈال دیتا ہے وہاں بیج کی نشوونما ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ بحیثیت رب کے تمام عالم کے رب ہیں۔ بحیثیت ربوبیت کے اللہ تعالیٰ کا فیض، اللہ تعالیٰ کے انعامات، اللہ تعالیٰ کی رحمتیں، اللہ تعالیٰ کے علوم عام ہیں۔ بات وہی ہے کہ جب کوئی قوم کوئی فرد تفکر کرتا ہے اور اپنی صلاحیتوں کو گہرائی میں استعمال کرتا ہے تو اسے خصوصیت حاصل ہو جاتی ہے۔ بارش کی مثال آپ کے سامنے ہے۔ زمین کی کوکھ کو جب کسان کھول دیتا ہے یعنی زمین کے (Inner) میں وہ ایسی صلاحیت پیدا کر دیتا ہے کہ باہر سے کوئی چیز آئے تو اس میں محفوظ ہو جائے تو.........، بارش کے قطرے گہرائی میں جذب ہو جاتے ہیں جس کے نتیجے میں پھول کھلتے ہیں، پھل لگتے ہیں، سایہ دار درخت اُگتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا ایک قانون ہے۔ جب تک کوئی قوم کوئی فرد اپنے (Inner) کے اندر داخل ہو کر اپنی چھپی ہوئی صلاحیتوں کو نہیں کریدتا وہ صلاحیتوں سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ سائنس دانوں نے میٹر (Matter) کے اندر تفکر کیا اپنے ذہن کی گہرائی سے (Matter) کی گہرائی کو تلاش کر کے اس کے اوپر اللہ تعالیٰ کی صفات کے چپکے ہوئے پرت کو ادھیڑا، توڑا نتیجے میں اس ایک شے کی طاقت کو حاصل کر لیا۔ یہ ایک مربوط نظام ہے جو ازل سے قائم ہے اور ابد تک قائم رہے گا جتنے پیغمبر تشریف لائے سب نے یہ بات نوع انسانی کے ذہنوں میں نقش کرنے کی کوشش کی کہ آدم زاد ایک طرف گوشت پوست کے وجود میں قید ہے اور دوسری طرف اس کے اندر ایسی صلاحیتیں چھپی ہوئی ہیں جو بیدار ہو جائیں تو کائنات اس کے لئے مسخر ہو جاتی ہے جب تک قوم اختلافی اور لایعنی باتوں کو چھوڑ کر تفکر اور تحقیق کو اپنا شعار نہیں بنائے گی اور اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں غور وفکر نہیں کرے گی۔ نہ اس دنیاء میں عزت واحترام حاصل کر پائے گی نہ اُس دنیا میں۔

☆☆☆

''علم الاسماء کیا ہیں''

سوال: قرآن پاک میں ارشاد ہے ترجمہ: ''اور سکھائے آدم کو نام سارے۔''

ارباب محراب و منبر جب اس کی تشریح بیان کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ دنیا میں موجود چیزوں کے نام آدم کو سکھا کر فرشتوں پر فضیلت دی گئی ہے کیونکہ انہیں یہ نام معلوم نہ تھے۔

عرض یہ کرنا ہے کہ اگر یہ بات درست ہے تو پھر ہر زبان اور ہر قوم میں چیزوں کو مختلف ناموں سے کیوں پکارا جاتا ہے۔ مثلاً ہم پانی کو پانی کہتے ہیں، انگریز (Water) کہتے ہیں، عربی میں ''ماء'' کہا جاتا ہے، فارسی میں ''آب'' اور ہندی میں ''جل'' کہلاتا ہے وغیرہ وغیرہ جبکہ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ بنی نوع آدم ہر چیز کو ایک ہی نام سے جانتی۔

از راہ شفقت ''علم الاسماء'' کو روحانی علوم کی روشنی میں بیان فرمائیں اور یہ بھی کہ روحانیت سے ان کا تعلق ہے؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے جہاں کائنات کی تخلیق کا تذکرہ کیا ہے وہاں یہ بات ارشاد کی ہے کہ ''میں تخلیق کرنے والوں میں سب سے بہتر خالق ہوں'' اللہ بحیثیت خالق کے ایسا خالق ہے جس کی تخلیق میں وسائل کی پابندی نہیں ہے۔ اللہ کے ارادے میں جو چیز جس طرح اور جس خدوخال میں موجود ہے جب وہ اس چیز کو وجود بخشنے کا ارادہ کرتا ہے تو حکم دیتا ہے ''کن'' اور اس حکم کی تعمیل میں تخلیق کے اندر جتنے وسائل ضروری ہیں وہ سب وجود میں آ کر اس تخلیق کو عمل میں لے آتے ہے۔ جو تخلیق اللہ کے ذہن میں موجود ہے۔ ''خالقین'' کا لفظ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ اللہ کے علاوہ اور بھی تخلیق کرنے والے ہیں لیکن اللہ کی تخلیق کے علاوہ دوسری ہر تخلیق وسائل کی پابند اور محتاج ہے۔ اس کی مثال آج کے دور میں بجلی سے دی جا سکتی ہے۔ اللہ کی ایک تخلیق بجلی ہے۔ جب بندوں نے اس تخلیق سے دوسری ذیلیتخلیقات کو وجود میں لانا چاہا تو اربوں کھربوں چیزیں وجود میں آ گئیں۔ اللہ کا یہ وصف ہے کہ اللہ نے لفظ ''کن'' کہہ کر بجلی کو وجود بخش دیا۔ آدم نے اختیاری طور پر یا

غیر اختیاری طور پر جب بجلی کے علم کے اندر تفکر کیا تو اس بجلی سے ہزاروں چیزیں وجود میں آ گئیں۔ بجلی سے جتنی چیزیں وجود میں آئیں وہ انسان کی تخلیق ہیں۔ مثلاً ریڈیو، ٹی وی، ڈش انٹینا، موبائل ٹیلیفون، کمپیوٹر، ملکی نظام میں معلوم اور نامعلوم ایجادات اور بے شمار دوسری چیزیں۔

روحانی نقطہ نظر سے اللہ کی اس تخلیق میں سے دوسری ذیلی تخلیقات کا مظہر بننا آدم زاد کا دراصل بجلی کے اندر تصرف ہے۔ یہ وہی علم ہے جو اللہ نے آدم کو سکھا دیا تھا۔ ''اسماء'' سے مراد یہ ہے کہ اللہ نے آدم کو ایسا علم سکھا دیا جو کہ براہ راست تخلیقی فارمولوں سے مرکب ہے۔ جب انسان اس علم کو گہرائی کے اندر جا کر حاصل کرتا ہے اور اس علم کے ذریعے تصرف کرتا ہے تو نئی نئی چیزیں سامنے آ جاتی ہیں۔

کائنات دراصل ایک علم ہے۔ ایسا علم جس کی بنیاد اور حقیقت سے اللہ نے انسان کو باخبر کر دیا ہے لیکن اس سے واقفیت کے لئے ضروری ہے کہ بندے تفکر کریں۔ قرآن پاک میں ہے:۔

''ہم نے لوہا نازل کیا اور اس کے اندر لوگوں کے لئے بے شمار فائدے محفوظ کر دیئے ہیں۔''

جن لوگوں نے لوہے کی خاصیت اور افادیت کو تسلیم کر کے لوہے میں تفکر کیا وہ لوہے کی صلاحیتوں سے واقف ہو گئے اور جب ان صلاحیتوں کو استعمال کر کے لوہے کے اجزائے ترکیبی کو متحرک کر دیا تو لوہا ایک ایسی عظیم شے بن کر سامنے آیا کہ جس سے موجودہ سائنس کی ہر ترقی کسی نہ کسی طرح وابستہ ہے۔ یہ ایک تصرف ہے جو وسائل میں کیا جاتا ہے۔ ان وسائل میں جن کا ظاہری وجود ہمارے سامنے ہے۔ جس طرح لوہا ایک وجود ہے اسی طرح روشنی کا بھی ایک وجود ہے۔ وسائل کی حدود سے گزر کر یا وسائل کے علوم سے آگے بڑھ کر جب کوئی بندہ روشنیوں کا علم حاصل کرتا ہے تو جس طرح لوہے (دھات) میں تصرف کے بعد وہ عظیم مشینیں، ریل گاڑیاں، کنکارڈ (Concard) بڑے بڑے

ہوائی جہاز، میزائل، نیپام بم، خلائی اسٹیشن، بحری جہاز اور دوسری چھوٹی بڑی ایجادات میں لوہے کو استعمال کرتا ہے۔ اسی طرح روشنیوں کا علم حاصل کر کے وہ روشنیوں کے ذریعے بہت ساری تخلیقات وجود میں لے آتا ہے۔

وسائل میں محدود رہ کر ہم سونے کے ذرّات کو اکٹھا کر کے ایک خاص پروسس سے گزار کر سونا بناتے ہیں۔ اس کو وسائل میں تصرف کا نام دیا جاتا ہے لیکن جو بندہ روشنیوں میں تصرف کا اختیار رکھتا ہے اس کے لئے سونے کے ذرّات کو مخصوص پروسس سے گزارنا ضروری نہیں ہے۔ وہ اپنے ذہن میں روشنیوں کا ذخیرہ کر کے ان مقداروں کو الگ کر لیتا ہے جو مقداریں سونے کے اندر کام کرتی ہیں اور ان مقداروں کو ایک نکتہ پر مرکوز کر کے ارادہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ''سونا'' اور سونا بن جاتا ہے۔

عظیم روحانی سائنس دان قلندر بابا اولیاءؒ نے کتاب ''لوح و قلم'' میں مقداروں کے تعین سے سونا بنانے کا فارمولا تفصیل سے بیان کیا ہے۔

ہم بتا چکے ہیں کہ اللہ اپنی تخلیق میں کسی کا محتاج نہیں ہے۔ جب وہ کوئی چیز تخلیق کرتا ہے تو تخلیق کے لئے جتنے وسائل موجود ہونا ضروری ہیں وہ خود بخود موجود ہو جاتے ہیں جبکہ بندے کا صرف یہ ہے کہ وہ اللہ کی بنائی ہوئی تخلیق میں تصرف کرتا ہے اور یہ تصرف دو طرح سے ہوتا ہے۔ ایک طریقہ وسائل میں محدود رہ کر وسائل کو مجتمع کر کے کوئی نئی چیز بنائی جاتی ہے اور دوسرا طریقہ روشنیوں میں تصرف کرنا ہے۔ یعنی کوئی چیز جن روشنیوں پر قائم ہے ان روشنیوں میں حرکت دے کر تصرف کیا جاتا ہے۔

تصرف کا یہ طریقہ انسان کے اندر روشنیوں سے متعلق ہے۔ روشنیوں کے اس ذخیرے کو حاصل کرنے کا طریقہ ہی دراصل روحانیت ہے۔ روحانیت میں یہ بات روشن دن کی طرح سامنے آ جاتی ہے کہ زمین پر موجود یا کائنات میں موجود ہر شے کی بنیاد اور بساط روشنی ہے اور یہ روشنی اللہ کی صفت ہے۔

اللہ نور السموات والارض کے مصداق

اللہ کی ہر صفت معین مقداروں کے ساتھ قائم ہے اور متعین مقداروں کے ساتھ ردّ و بدل ہوتی رہتی ہے۔ پیدائش سے موت تک کا زمانہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ بچہ اپنی ایک حیثیت پر قائم نہیں رہتا۔ جن مقداروں پر بچہ پیدا ہوتا ہے ان مقداروں میں ایک ضابطہ ایک قانون اور ایک ترتیب کے ساتھ ردّ و بدل ہوتا رہتا ہے۔ اسی مناسبت سے بچہ کے اعضاء اور شعور کی نشوونما ہوتی رہتی ہے۔

روحانی علوم ہمارے اوپر یہ بات واضح کرتے ہیں کہ شکل و صورت اور خدوخال میں تبدیلی اللہ کے کون سے علوم کرتے ہیں اور انسان یہ علوم کس طرح سیکھ سکتا ہے۔



''روحانی استاد اور ٹیلی پیتھی''

سوال: میں آپ سے چند سوالات کے جوابات چاہتا ہوں۔ آپ ان سوالات کے جوابات قرآن کریم کی روشنی میں دیں۔ ان جوابات کو روحانی ڈائجسٹ میں ''ٹیلی پیتھی سیکھئے'' کے کالم میں شائع کریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ سوالات کے ان جوابات سے روحانیت کے بعض گوشوں پر روشنی پڑے گی اور ایسے لوگ جن کے ذہنوں میں اس قسم کے سوالات پید ہوتے ہیں' وہ بھی مطمئن ہوجائیں گے۔

اگر ہم ٹیلی پیتھی کے ذریعے اپنے خیالات دوسروں تک پہنچا سکتے ہیں اور دوسرے کے خیالات معلوم کر سکتے ہیں تو ہم ٹیلی پیتھی کو پوچھ گچھ کے سلسلے میں کیوں استعمال نہیں کرتے اور جاسوسوں کے اہم منصوبوں سے کیوں واقف نہیں ہوجاتے؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر کسی روحانی استاد کی نگرانی میں مراقبہ کرنے سے دل کی آنکھ یا باطنی آنکھ کھل جاتی ہے تو ہم یہ کیوں نہیں پتہ کر لیتے کہ اہرام مصر کب اور کیوں تعمیر ہوئے اور ان میں استعمال ہونیوالے اتنے وزنی پتھر کس طرح لائے گئے؟

جواب: سائنس کی دنیا کہکشانی اور شمسی نظاموں سے اچھی طرح روشناس ہے۔ کہکشانی اور شمسی نظاموں کی روشنی سے ہماری زمین کا کیا تعلق ہے اور ان نظاموں کی روشنی زمین کی نوعوں انسان' حیوانات' نباتات اور جمادات پر کیا اثر کرتی ہے یہ مرحلہ سائنس کے سامنے آچکا ہے۔ سائنس دانوں کو یہ سمجھنا پڑے گا کہ شمسی نظاموں کی روشنی انسان کے اندر' نباتات کے اندر' جمادات کے اندر کس طرح اور کیا عمل کرتی ہے۔ اور کس طرح جانوروں' انسانوں نباتات اور جمادات کی کیفیات میں رد و بدل کرتی رہتی ہے۔ سائنس کا عقیدہ یہ ہے کہ زمین پر ہر موجود شئے کی بنیاد یا قیام لہر اور صرف لہر پر ہے۔ ایسی لہر جس کو روشنی کے علاوہ اور کوئی نام نہیں دیا جاسکتا۔

(Telepathy) میں ایسے علوم سے بحث کی جاتی ہے جو حواس کے پس پردہ شعور سے

چھپ کر کام کرتے ہیں۔ یہ علم ہمیں یہ بتاتا ہے کہ ہمارے حواس کی گرفت محض مفروضہ ہے۔

مثال:

ہم جب کسی سخت چیز کو دیکھتے ہیں تو ہمیں اس چیز کی سختی کا علم ہوجاتا ہے حالانکہ ہمارے دماغ کے اوپر وہ سخت چیز ٹکراتی نہیں ہے۔ سائنس کے نقطۂ نظر اور مخفی علوم کی روشنی میں ہر شئے دراصل شعاعوں یا لہروں کے مجموعہ کا نام ہے۔ جب ہم کسی لکڑی یا لوہے کی طرف کسی بھی طریقہ سے متوجہ ہوتے ہیں تو لکڑی یا لوہے کی شعاعیں ہمارے دماغ کو باخبر کر دیتی ہیں۔ باخبری کے لئے یہ ضرور نہیں ہے کہ لکڑی یا لوہے کی سختی کو چھو کر محسوس کیا جائے۔

غور طلب بات یہ ہے کہ شعاع یا لہر اپنے اندر سختی رکھتی ہے اور نہ وزن۔ پھر ہمیں یہ علم کیسے ہوجاتا ہے کہ فلاں چیز سخت ہے یا فلاں چیز نرم ہے۔ ہم پانی کو دیکھتے ہیں یا چھوتے ہیں تو فوراً ہمارے دماغ میں یہ بات آجاتی ہے یہ پانی ہے حالانکہ ہمارے دماغ میں پانی کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ یعنی دماغ بھیگتا نہیں ہے جب ہمارا دماغ بھیگا نہیں ہے تو ہم یہ کیسے کہہ دیتے کہ یہ پانی ہے۔

رنگ کی قسمیں ساٹھ سے زیادہ دریافت ہو چکی ہیں۔ جب ہم کوئی رنگ دیکھتے ہیں تو نہ صرف یہ کہ ہم اس رنگ کو پہچان لیتے ہیں بلکہ رنگ کے ہلکے یا تیز اثرات سے براہ راست متاثر ہوتے ہیں۔ ہرا رنگ اور ہریالی رنگ دیکھ کر ہمیں سکون محسوس ہوتا ہے۔ مسلسل اور متواتر سرخ رنگ سامنے رہنے سے ہمارے دماغ پر ناگوار اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اعتدال سے زیادہ سرخ رنگ کے اثرات حواس کو غیر متوازن بھی کر دیتے ہیں۔

حقائق یہ ہیں کہ ہر شے الگ اور معین مقدار کے ساتھ وجود پذیر ہے۔ لہروں یا شعاعوں کی معین مقداریں ہی ہر شے کو ایک دوسرے سے الگ کرتی ہیں۔ اور ہر شے کی یہ لہریں یا شعاعیں ہمیں اپنے وجود کی اطلاع فراہم کرتی ہیں۔ کہنا یہ ہے کہ ہر موجود شے دراصل لہروں یا شعاعوں کا دوسرا نام ہے۔ اور ہر شئے کی لہر یا شعاع ایک دوسرے سے الگ یا مختلف ہے۔ اگر ہمیں یہ معلوم ہوجائے کہ انسان' حیوانات اور جمادات میں کس کس قسم کی لہریں کام کرتی

ہیں اور ان لہروں پر کس طرح کنٹرول حاصل کیا جاتا ہے تو ہم ان چیزوں کو متاثر کر سکتے ہیں۔ لہر یا شعاع دراصل ایک جاری و ساری حرکت ہے اور ہر شئے کے اندر لہروں یا شعاعوں کی حرکت کا ایک فارمولا ہے۔ ہمارے اردگرد بہت سی آوازیں پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ آوازیں بھی لہروں کی شکل میں موجود ہیں۔ ان کے قطر (Wavelength) بہت چھوٹے اور بہت بڑے ہوتے ہیں۔ سائنس دانوں نے اندازہ لگایا ہے کہ چار سو قطر سے نیچے کی آوازیں آدمی نہیں سن سکتا۔ اور ایک ہزار چھ سو قطر سے زیادہ اونچی آوازیں بھی آدمی نہیں سن سکتا۔ چار سو قطر سے نیچے کی آوازیں برقی رو (لہر) کے ذریعہ سنی جا سکتی ہیں۔ اور ایک ہزار چھ سو قطر سے اوپر کی آوازیں بھی بجز برقی رو کے سننا ممکن نہیں۔

آنکھ کے پردوں پر جو عمل ہوتا ہے وہ رو یا لہر سے بنتا ہے۔ آنکھ کی حس جس قدر تیز ہوتی ہے اتنا ہی وہ رو کو زیادہ قبول کرتی ہے۔ اور اتنا ہی رو میں امتیاز کر سکتی ہے۔ ٹیلی پیتھی کا اصل اصول یہی ہے کہ مشق کے ذریعہ آنکھ کی حس کو اس قدر تیز کر دیا جائے کہ صاحب مشق رو اور حواس کی لہروں میں امتیاز کر لے۔ آنکھیں بھی حواس میں شامل ہیں لیکن یہ ان چیزوں کو جو باہر سے دیکھتی ہیں زیادہ اثر قبول کرتی ہیں۔ باہر کے عکس آنکھوں کے ذریعہ اندرونی دماغ کو متاثر کرتے ہیں۔ اس کی شکل یہ ہوتی ہے کہ حواس تازہ یا افسردہ ہو جاتے ہیں، کمزور ہو جاتے ہیں یا طاقت ور۔ ان ہی باتوں پر دماغی کام کا انحصار ہے۔

ہم یہ بتا چکے ہیں کہ ایک ہزار چھ سو قطر سے اوپر کی آوازیں یا چار سو قطر سے نیچے کی آوازیں برقی رو کے ذریعہ سنی جا سکتی ہیں اور یہ اس لئے ممکن ہے کہ ہمارے تمام حواس اور خیالات بجائے خود "برقی رو" ہیں۔ اگر ہمارے خیالات برقی رو سے الگ کوئی چیز ہوتے تو برقی رو کو قبول ہی نہ کرتے۔ ٹیلی پیتھی میں یہی خیالات جو دراصل برقی رو ہیں دوسرے آدمی کو منتقل کئے جاتے ہیں۔ خیالات منتقل کرنے کے لئے اس بات کی ضرورت پیش آتی ہے کہ یہ رو کسی ایک ذرّہ پر یا کسی ایک سمت میں یا کسی ایک رُخ پر مرکوز ہو جائے۔ اگر یہ رو تھوڑی دیر بھی مرکوز رہے تو دور دراز تک اپنے اثرات مرتب کرتی ہے۔ انسان کو اور ان چیزوں کو جو ذی

روح نہیں سمجھی جاتیں ان کو بھی اس رو کے ذریعہ متاثر کیا جا سکتا ہے۔

یہ جاننا ضروری ہے کہ ہم جو کچھ دیکھتے ہیں وہ باہر نہیں دیکھتے۔ کائنات کا ہر مظہر ہمارے اندر موجود ہے ہم سمجھتے یہ ہیں کہ ہم جو کچھ دیکھ رہے ہیں وہ ہمارے سامنے موجود ہے حالانکہ خارج میں کسی شئے کا وجود محض مفروضہ ہے۔ ہر شئے ہمارے (Inner) میں قیام پذیر ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہم کسی چیز کا مشاہدہ اپنے اندر کرتے ہیں۔ اور یہ سب کا سب ہمارا علم ہے۔ اگر فی الواقع کسی شئے کا علم حاصل نہ ہو تو ہم اس چیز کو نہیں دیکھ سکتے۔

ٹیلی پیتھی میں پہلے پہل یہ مشق کرائی جاتی ہے کہ اشیاء ہمارے اندر موجود ہیں۔ مشق کی تکمیل کے بعد انسان یہ دیکھنے لگتا ہے کہ فلاں چیز میرے اندر موجود ہے اور مسلسل توجہ کے بعد اس چیز پر نظر ٹھہرتی جاتی ہے۔ ارتکاز توجہ کے لئے سانس کی مشق اور مراقبہ کرایا جاتا ہے۔

مشقوں کا تذکرہ کرنے سے پہلے نظر کا قانون سمجھ لینا ضروری ہے۔

آدمی دراصل نگاہ ہے۔ نگاہ یا بصارت جب کسی شئے پر مرکوز ہو جاتی ہے تو اس شئے کو اپنے اندر جذب کر کے دماغ کے سکرین پر لے آتی ہے اور دماغ اس چیز کو دیکھتا اور محسوس کرتا ہے اور اس میں معنی پہناتا ہے۔ نظر کا قانون یہ ہے کہ جب وہ کسی شئے کو اپنا ہدف بناتی ہے تو دماغ کی اسکرین پر اس شئے کا عکس پندرہ سیکنڈ تک قائم رہتا ہے اور پلک جھپکنے کے عمل سے یہ آہستہ آہستہ مدھم ہو کر حافظہ میں چلا جاتا ہے۔ اور دوسرا عکس دماغ کی اسکرین پر آ جاتا ہے۔ اگر نگاہ کو کسی ہدف پر پندرہ سیکنڈ سے زیادہ مرکوز کر دیا جائے تو ایک ہی ہدف بار بار دماغ کی اسکرین پر وارد ہوتا ہے۔ اور حافظہ پر نقش ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً ہم کسی چیز کو پلک جھپکائے بغیر مسلسل ایک گھنٹہ تک دیکھتے ہیں تو اس عمل سے نگاہ قائم ہونے کا وصف دماغ میں پیوست ہو جاتا ہے۔ اور دماغ میں یہ یکسوئی ذہنی انتشار کو ختم کر دیتی ہے۔ ہوتے ہوتے اتنی مشق ہو جاتی ہے کہ شئے کی حرکت صاحب مشق کے اختیار اور تصرف میں آ جاتی ہے۔ اب وہ شئے کو جس طرح چاہے حرکت دے سکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نگاہ کی مرکزیت کسی آدمی کے اندر قوت ارادی کو جنم دیتی ہے اور قوت ارادی سے انسان جس طرح چاہے کام لے سکتا ہے۔ ٹیلی پیتھی

(Telepathy) کا اصل اصول بھی یہی ہے کہ انسان کسی ایک نقطہ پر نگاہ کو مرکوز کرنے پر قادر ہو جائے۔ نگاہ کی مرکزیت حاصل کرنے میں کوئی نہ کوئی ارادہ بھی شامل ہوتا ہے۔ جیسے جیسے نگاہ کی مرکزیت پر عبور حاصل ہوتا ہے اسی مناسبت سے ارادہ مستحکم اور طاقت ور ہو جاتا ہے۔ ٹیلی پیتھی جاننے والا کوئی شخص جب یہ ارادہ کرتا ہے کہ اپنے خیال کو دوسرے آدمی کے دماغ کی اسکرین پر منعکس کر دے تو اس شخص کے دماغ میں یہ ارادہ منتقل ہو جاتا ہے۔ وہ شخص اس ارادہ کو خیال کی طرح محسوس کرتا ہے۔ اگر وہ شخص ذہنی طور پر یکسو ہے تو یہ خیال تصور اور احساسات کے مراحل سے گزر کر مظہر بن جاتا ہے۔ اگر اسی ارادہ کو بار بار منتقل کیا جائے تو دماغ اگر یکسو نہ بھی ہو تو یکسو ہو کر اس خیال کو قبول کر لیتا ہے۔ اور ارتکاز توجہ سے خیال عملی جامہ پہن کر منظر عام پر آ جاتا ہے۔

ٹیلی پیتھی، محض خیالات کو دوسرے تک منتقل کرنے کا علم ہی نہیں ہے بلکہ اس علم کے ذریعہ ہم اپنی زندگی کا مطالعہ کر کے زندگی کو خوش آئینہ تصورات سے لبریز کر سکتے ہیں۔ زندگی خواہشات، تمناؤں اور آرزوؤں کے تانے بانے پر قائم ہے۔

زندگی بنیادی طور پر خواہشات کے خمیر سے مرکب ہے۔ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو اس کے اندر پہلی خواہش بھوک کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے اور جب ماں بچہ کو سینے سے لگاتی ہے تو بچہ اپنی اس خواہش کی تکمیل اس طرح کرتا ہے جیسے یہ ماں کے پیٹ سے ہی یہ عمل سیکھ کر آیا ہے۔ خواہشات کی تکمیل کے مراحل طے کرنے کا دوسرا نام نشوونما ہے۔ خواہشات کی تکمیل دو طرح ہوتی ہے۔ ایک شعوری طور پر اور دوسرے لاشعوری طور پر۔ شعور اور لاشعور دراصل ایک ورق کے دو صفحے ہیں۔ ایک صفحہ پر خیالات اور تصورات کے نقوش زیادہ روشن اور واضح ہیں۔ اور دوسرے صفحہ پر دھندلے اور کم روشن جس صفحہ پر نقوش زیادہ روشن اور واضح ہیں اس صفحہ کا نام لاشعور ہے اور جس صفحہ پر نقوش دھندلے اور کم روشن ہیں اس صفحہ کا نام شعور ہے۔ روحانیت میں یہ بات مشاہدہ کرائی جاتی ہے کہ روشن اور واضح خیالات میں ٹائم اسپیس نہیں ہوتا۔ غیر واضح خیالات اور تصورات کا ہر قدم ٹائم اسپیس کے ساتھ بندھا ہوتا ہے۔ ہم جب

کسی ایک خواہش اور اس کی تکمیل کا تجزیہ کرتے ہیں تو ہمارے سامنے یہ بات آتی ہے۔ خواہش کو جب الگ معنی پہنا دیئے جاتے ہیں تو اس کی الگ ایک حقیقت بن جاتی ہے۔ مثلاً بھوک ایک خواہش ہے اور اس کی تکمیل کا ذریعہ کچھ کھا لینا ہے۔ ایک آدمی بھوک کی تکمیل روٹی اور گوشت کھا کر کر لیتا ہے، دوسرا گوشت کی بجائے کسی اور غذا سے پیٹ بھر لیتا ہے۔ شیر گھاس اور پتے نہیں کھاتا، بکری گوشت نہیں کھاتی۔ ایک آدمی کو انتہائی درجہ مٹھائی سے رغبت ہوتی ہے۔ اس کے برعکس دوسرا شخص نمکین چیزیں زیادہ پسند کرتا ہے۔ اس حقیقت سے ایک فرد واحد بھی انکار نہیں کر سکتا کہ انسان کی زندگی میں خوشی اور غم کا تعلق براہ راست خیالات اور تصورات سے وابستہ ہے۔ کوئی خیال ہمارے لئے مسرّت آگیں ہوتا ہے اور کوئی خیال انتہائی کرب ناک، ڈر، خوف، شک، حسد، طمع، نفرت و حقارت، غرور و تکبر، خودنمائی وغیرہ وغیرہ سب خیالات کی پیداوار ہیں۔ اور اس کے برعکس محبت، ایثار، یقین، انکساری اور حزن و ملال کا ہونا بھی خیالات کی کارفرمائی ہے۔ بیٹھے بیٹھے یہ خیال بجلی کی طرح کوندا جاتا ہے کہ ہمارے یا ہماری اولاد کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ جائے گا۔ حالانکہ حادثہ پیش نہیں آیا لیکن یہ خیال آتے ہی حادثات سے متعلق پوری پریشانیاں، کڑی در کڑی ہم اپنے اندر محسوس کرتے ہیں۔ اور اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ یہی حال خوشی اور خوش حال زندگی کا ہے۔ جب کوئی خیال تصور بن کر ایسے نقطہ پر مرکوز ہو جاتا ہے جس میں شادمانی اور خوش حالی کی تصویریں موجود ہوں تو ہمارے اندر خوشی کے فوارے اُبلنے لگتے ہیں۔

غم اور خوشی دونوں تصورات سے وابستہ ہیں۔ اور تصورات خیالات سے جنم لیتے ہیں۔

آپ نے ایسے مریض ضرور دیکھے ہوں گے کہ ان کے دماغ میں یہ بات نقش ہو گئی ہے کہ وہ اگر گھر سے باہر نکلیں گے تو ان کا ایکسیڈنٹ ہو جائے گا۔ خیال کی طاقت اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ وہ گھر سے باہر نکلنا چھوڑ دیتے ہیں۔ کچھ لوگوں کے ذہن میں چھپکلی یا بلی کا خوف بیٹھ جاتا ہے۔ اور یہ خوف ان کے دماغ سے اس طرح چمٹ جاتا ہے کہ وہ ذہنی مریض بن کر رہ جاتے ہیں حالانکہ اس خوف کی بظاہر کوئی وجہ موجود نہیں ہوتی۔ بس ایک مفروضہ کے تحت خیال

خوف بن کر دماغ پر چھا جاتا ہے۔

میرے پاس ایک مریضہ لائی گئی جس کو یہ وہم ہوگیا تھا کہ اس کے اوپر جادو کیا گیا ہے۔ اور اس جادو کی وجہ سے کھانے کے بعد اس کے پیٹ میں درد ہوتا ہے۔ شوہر اس بات کو بے بنیاد قرار دیتے تھے۔ میری تشخیص بھی یہی تھی کہ یہ محض وہم ہے۔ علاج کے سلسلہ میں ہضم سے متعلق کچھ دوائیں دے دی گئیں لیکن مرض میں افاقہ کی بجائے اور اضافہ ہوگیا۔ اور درد کی شدت اتنی بڑھی کہ مریضہ کو دماغی دورے پڑنے لگے۔ اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ علاج پر کئی ہزار روپے خرچ ہونے کے باوجود مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی' کے مصداق مرض دگر گوں ہوگیا۔ اس کے کے بعد نفسیاتی اسپتال میں ایک ماہ تک علاج ہوتا رہا۔ پھر عامل حضرات سے رجوع کیا گیا۔ جب کسی بھی صورت سے فائدہ نہ ہوا' مریضہ کو میرے پاس دوبارہ لایا گیا۔ میں نے نہایت اطمینان اور سکون کے ساتھ ان کے تمام حالات سنے اور ان سے کہا میں دیکھ کر بتاؤں گا کہ آپ کے اوپر کس قسم کا اثر ہے اور ان کو ہدایت کر دی کہ آپ دو تین روز کے بعد معلوم کر لیں۔ پندرہ روز تک وہ اپنے بارے میں مجھ سے پوچھتی رہیں اور میں ان سے فرصت نہ ملنے کی معذرت کرتا رہا۔ جب ان کا یقین اس نقطہ پر مرکوز ہوگیا کہ میرے سوا ان کا علاج کوئی نہیں کر سکتا تو میں نے ان سے کہہ دیا کہ آپ کے اوپر زبردست اثر ہے اور اس کا علاج یہ ہے کہ آپ صبح اذان سے پہلے اتنے بج کر اتنے منٹ پر بند آنکھوں سے میرا تصور کر کے بیٹھ جائیں۔ میں اپنی روحانی قوت سے یہ اثر ختم کر دوں گا۔ اب آپ مریضہ کی زبان سے ان کا حال سنیئے۔ مریضہ نے مجھے بتایا:

اس خیال سے کہ صبح وقت مقررہ پر میری آنکھ کھلے میں ساری رات جاگتی رہی۔ گھڑی دیکھ کر وقت مقررہ پر آنکھیں بند کر کے بیٹھ گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ آپ کے اندر سے میرے دماغ میں لہریں منتقل ہو رہی ہیں۔ جیسے ہی یہ لہریں میرے دماغ سے ٹکرائیں میں نے دیکھا کہ میں ایک پرانے قبرستان میں ہوں۔ وہاں دو پرانی قبروں کے درمیان ایک جگہ میں نے مٹی کھودی اور اس میں سے ایک گڑیا برآمد ہوئی۔ اس گڑیا کے سینہ پر دل کی جگہ میرا نام لکھا

ہوا تھا۔ میں نے وہ گڑیا قبرستان کے کنوئیں میں ڈال دی اور اسی وقت پیٹ کا درد ختم ہوگیا۔

وقت مقررہ پر میں نے صرف یہ عمل کیا کہ اپنے خیال کی قوت سے مریضہ کو یہ بتایا کہ آپ کے اوپر جو اثر تھا وہ ختم ہوگیا ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے اوپر کوئی اثر یا جادو نہیں تھا۔

قانون تخلیق کے تحت انسان تین پرت کا مجموعہ ہے۔ ایک پرت صفاتی ہے' دوسرا پرت ذاتی ہے اور تیسرا پرت ذات اور صفات کو الگ الگ کرتا ہے۔ ان ہی پرت کو ہم جسد خاکی کہتے ہیں۔

ہر پرت کے محسوسات جداگانہ ہیں۔ ذات کا پرت وہم اور خیال کو بہت قریب سے دیکھتا' سمجھتا اور محسوس کرتا ہے۔ صفات کا پرت وہم اور خیال کو تصور بنا کر جسد خاکی کو منتقل کر دیتا ہے۔ اور تصورات کو معانی کا لباس پہنا کر خوشی یا غم کا مفہوم دیتا ہے۔ اگر اس کو ایسی معلومات فراہم کی جائیں جو کسی خوبصورت باغ سے متعلق ہوں تو اس کے اندر رنگین لہریں' رنگین روشنیاں' خوشبو کے طوفان' حسن کے رجحانات رونما ہونے لگتے ہیں اور اگر ایسی معلومات فراہم کی جائیں جو کسی حادثہ سے تعلق رکھتی ہوں تو اس کے اندر رنگین روشنیوں کی بجائے تاریکی' خوشبو کی جگہ بدبو' حسن کی جگہ بدصورتی' خوشی کی جگہ غم' امید کی بجائے مایوسی اور محبت کی جگہ نفرت جیسے رجحانات رونما ہونے لگتے ہیں۔

قدرت نے جس پرت کو غیر جانبدار (Neutral) بنایا ہے اس میں دو قسم کے نقوش ہوتے ہیں۔ ایک نقش باطن جس کے اندر لطیف انوار کا ذخیرہ ہوتا ہے اور ٹائم اسپیس (Time-Space) کا عمل دخل نہیں ہوتا۔ دوسرا نقش ظاہر' جس کے اندر غرض پسندی' حسد' ذہنی تعیش' احساس کمتری' کم ظرفی اور تنگ نظری جیسے جذبات تشکیل پاتے ہیں۔

اصل بات خیالات کو معنی پہنانے کی ہے۔ خیالات کو جو معنی دیئے جاتے ہیں وہ تصور سجاتا ہے اور پھر یہی تصور مظاہراتی خدوخال اختیار کر کے ہماری زندگی کی راہ متعین کرتا ہے۔ غم و اندوہ سے لبریز یا ہر آرام و آسائش سے بھرپور۔

تصورات میں اگر پیچیدگی ہے تو یہ الجھن اضطراب اور پریشانی کا جامہ پہن لیتا ہے۔ اور جب ایسا ہوتا ہے تو نقش باطن میں خراشیں پڑ جاتی ہیں۔ یہی خراشیں اخلاقی امراض کی بنیاد ہیں۔ ان ہی خراشوں سے بے شمار امراض پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً مرگی' دماغی فتور کا عارضہ' مالیخولیا' خفقان' کینسر' بھگندر' دق سورسل وغیرہ۔

بڑی مشکل یہ پیش آ گئی ہے۔ کہ ہم رگ پٹھوں کی بناوٹ اور ہڈیوں کے ڈھانچہ کو انسان کہتے ہیں۔ دراصل یہ انسان وہ نہیں ہے قدرت جس کو انسان کہتی ہے۔ اس انسان کو ہم اصل انسان کا لباس کہہ سکتے ہیں۔ ہم جب مر جاتے ہیں تو ہمارے جسم میں کسی قسم کی اپنی کوئی حرکت نہیں رہتی۔ اس جسم کے ہر عضو کو کاٹ ڈالئے' پورے جسم کو گھسیٹئے' مضروب کیجئے' جب تک ہماری بنیادی خواہشات غیر آسودہ رہتی ہیں ہم مغموم رہتے ہیں۔ یہ غیر آسودگی ہمیں غیر مطمئن اور مضمحل رکھتی ہے۔ زندگی کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ ہم ایسی چیز کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں جس میں مسرّت کا پہلو نمایاں ہو۔ چوں کہ ہم غم زدہ یا پُرمسرت زندگی گزارنے کے قانون سے ناواقف ہیں اس لئے زیادہ تر یہ ہوتا ہے کہ ہم مسرت کی تلاش میں اکثر و بیشتر غلط سمت قدم بڑھاتے رہتے ہیں۔ اور ناواقفیت کی بناء پر اپنے لئے ایسا راستہ انتخاب کر لیتے ہیں جس میں تاریکی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ ہم جب زندگی کا تجزیہ کرتے ہیں تو ہمارے سامنے یہ بات آتی ہے کہ زندگی کے روز و شب اور ماہ و سال آدھے سے زیادہ آزردگی اور مایوسی میں گزر جاتے ہیں۔ ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ ہم نہیں جانتے کہ وہ کون سا راستہ ہے جس راستے میں مسرت کے روشن قندیل اپنی روشنی بکھیر رہے ہیں۔ ہم ناخوش اور غیر مطمئن اس لئے ہوتے ہیں کہ ہمارے اندر جو خواہش پیدا ہوتی ہے وہ غیر شعوری ہے اور ہم خواہش کے پس پردہ ضرورت سے ناواقف ہیں۔

انسان دو تقاضوں سے مرکب اور محرک ہے۔ ایک تقاضہ جبلی ہے اور ایک فطری۔ جبلی تقاضہ پر ہم با اختیار ہیں اور فطری تقاضہ پر ہمیں کسی حد تک تو اختیار حاصل ہے مگر ہم اس تقاضے کو کلیتاً رد کرنے پر قادر نہیں ہیں۔

ایک ماں اپنے بچے سے محبت کرتی ہے بچہ مر جاتا ہے۔ ماں رو دھو کر بالآخر صبر کر لیتی ہے عرف عام میں ماں کی محبت کو فطری تقاضہ کہا جاتا ہے اس مردہ جسم کو ایک طرف ڈال دیجئے' کچھ بھی کیجئے' جسم کی طرف سے اپنی کوئی مدافعت' کوئی حرکت عمل میں نہیں آئیگی۔ اس میں زندگی کا کوئی شائبہ کسی لمحہ بھی پیدا ہونے کا امکان نہیں ہے۔

اب ہم اسی بات کو دوسری طرح بیان کرتے ہیں:

آپ نے قمیض پہنی ہوئی ہے۔ اگر آپ یہ چاہیں کہ قمیض بذاتِ خود جسم سے الگ بھی حرکت کرے تو یہ بات ناممکن ہے جب تک قمیض جسم کے اوپر ہے' جسم کی حرکت کے ساتھ اس کے اندر بھی حرکت موجود ہے۔ اگر آستین ہاتھ کے اوپر ہے تو ہاتھ ہلانے سے آستین کا ہلنا بھی ضروری ہے۔ ہاتھ سے الگ آستین کی حرکت بعید از قیاس ہیں۔ آپ یہ چاہیں کہ ہاتھ تو حرکت کرے لیکن آستین حرکت نہ کرے' ایسا نہیں ہوتا۔ جب تک ہاتھ کے اوپر آستین ہے ہاتھ کی حرکت کے ساتھ آستین کا ہلنا ضروری ہے۔ بالکل یہی حال جسم کا ہے۔ جسم کو جب ہم لباس کہتے ہیں تو اس سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ خاکی جسم روح کا لباس ہے۔ جب تک روح (انسان) موجود ہے جسم بھی متحرک ہے۔ اور اگر رُوح موجود نہیں ہے تو رُوح کے لباس (جسم) کی حیثیت قمیض کی طرح ہے۔

ہر انسان کی یہ طبعی خواہش ہوتی ہے کہ وہ یہ جان لے کہ خیالات کیوں آتے ہیں اور کہاں سے آتے ہیں اور خیالات کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے مل کر کس طرح زندگی بنتے ہیں۔ زندگی میں خواہشات کی حیثیت کیا ہے۔ یہ بات ہمارے سامنے ہے کہ دراصل یہ تقاضہ فطری نہیں جبلی ہے۔

بھوک کا تقاضہ اُبھرتا ہے۔ زندگی میں سونے اور بیدار رہنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ کوئی آدمی بھوک کو رفع کرنے کے لئے خوراک میں کمی بیشی کر سکتا ہے لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ کبھی کچھ نہ کھائے یا پیاس کا تقاضا پورا کرنے کے لئے پانی نہ پئے' یا ساری عمر جاگتا رہے یا ساری عمر سوتا رہے۔ ماں کی محبت کو اگر فطری جذبہ قرار دیا جائے تو ماں بچے کی جدائی کے غم

میں بچہ کے ساتھ مر جائے گی یا بچہ کی یاد اس کے حواس کا شیرازہ بکھیر دے گی لیکن ایسا نہیں ہوتا۔

دنیا میں رائج علوم کی اگر درجہ بندی کی جائے تو ہم انہیں تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں؟ وہ یہ ہیں:۔

۱۔ طبیعات (Physics)

۲۔ نفسیات (Psychology)

۳۔ مابعد النفسیات (Parasychology)

علم طبیعات کے ضمن میں زندگی کے وہ اعمال و اشغال آتے ہیں جن سے کوئی آدمی محدود دائرے میں رہ کر مستفیض ہوتا ہے۔ یعنی اس کی سوچ کا محور مادّہ (Matter) اور صرف مادّہ ہوتا ہے۔ مادّی دنیا کے اس خول سے وہ باہر نہیں نکلتا۔

نفسیات وہ علم ہے جو طبیعات کے پس پردہ کام کرتا ہے۔ خیالات و تصورات اور احساسات کا تانا بانا اسی علم سے مرکب ہے۔ خیالات اگر تواتر کے ساتھ علم الطبیعات کے دائرے میں منتقل ہوتے رہیں تو آدمی صحت مند خیالات کا پیکر ہوتا ہے اور اگر خیالات کے اس لامتناہی سلسلے میں کوئی رخنہ در آئے اور علم طبیعات کا دائرہ اس خیال میں مرکوز ہو جائے تو آدمی نفسیاتی مریض بن جاتا ہے۔

علم مابعد النفسیات علم کی اس بساط کا نام ہے جس کو روحانیت میں مصدر اطلاعات یعنی (Source of Information) کہا جاتا ہے۔ علمی حیثیت میں یہ ایک ایسی ایجنسی ہے جو لاشعور کے پس پردہ کام کرتی ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہوئی کہ آدمی تین دائروں سے مرکب ہے۔ شعور، لاشعور اور ورائے لاشعور۔ جب ہم کسی مظاہراتی خدوخال میں داخل ہوتے ہیں تو ہمیں ان تین دائروں میں سفر کرنا پڑتا ہے۔ یعنی پہلے ہمیں کسی چیز کی اطلاع ملتی ہے، پھر اس اطلاع میں تصوراتی نقش و نگار بنتے ہیں اور پھر یہ تصوراتی نقش و نگار مظہر کا روپ دھار کر ہمارے سامنے آ جاتے

ہیں۔ اسی بات کو ہم دوسری طرح بیان کرتے ہیں تاکہ بات پوری طرح واضح ہو جائے۔

کائنات میں پھیلے ہوئے مظاہر میں اگر تفکر کیا جائے تو یہ بات سامنے آ جاتی ہے کہ خیالات یعنی اطلاع (Information) تمام موجودات میں قدر مشترک رکھتی ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ پانی کو ہر آدمی، ہر حیوان اور نباتات و جمادات پانی سمجھتے ہیں اور اسی طرح اس سے استفادہ کرتے ہیں جس طرح ایک آدمی کرتا ہے۔ جس طرح پانی کو پانی کہا جاتا ہے اسی طرح آگ ہر مخلوق کے لئے آگ ہے آدمی اگر آگ سے بچنے کی کوشش کرتا ہے تو بکری، کبوتر، شیر اور حشرات الارض بھی آگ سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک آدمی میٹھا پسند کرتا ہے، دوسرا طبعاً میٹھی چیزوں کی طرف مائل نہیں ہوتا، لیکن یہ ہر دو اشخاص میٹھے کو میٹھا اور نمک کو نمک کہنے پر مجبور ہیں۔ پتا یہ چلا کہ جہاں آدمی خیالات اور تصورات میں قدر مشترک رکھتے ہیں وہاں وہ خیالات میں اپنی مرضی اور منشاء کے مطابق معانی پہنانے پر قدرت رکھتے ہے۔ آپ کا یہ سوال کہ کیا ہم اپنے خیالات دوسروں تک پہنچا سکتے ہیں اور کیا دوسروں کے خیالات معلوم کر سکتے ہیں؟ کے جواب میں عرض ہے کہ آپس میں خیالات کی منتقلی کا نام ہی زندگی ہے۔ ہم اپنے سے علاوہ دوسرے فرد کو صرف اس لئے پہچانتے ہیں کہ اس کے تشخص کے خیالات ہمیں منتقل ہو رہے ہیں۔ اگر زید کے خیالات اور خیالات کا مجموعہ زندگی، بکر کے دماغ کی اسکرین پر منتقل نہ ہو تو بکر زید کو نہیں پہچان سکتا درخت کی زندگی میں کام کرنیوالی وہ لہریں جن کے اوپر درخت کا وجود قائم ہے۔ اگر آدمی کے اندر منتقل نہ ہوں تو آدمی درخت کو نہیں پہچان سکے گا۔

دیکھنے اور سمجھنے کی طرزیں دو رُخ پر قائم ہیں ایک براہ راست اور دوسری بالواسطہ۔ بالواسطہ دیکھنے کی طرز یہ ہے کہ ہم علمی اعتبار سے دو وجود کا تعین کرتے ہیں۔ ایک وجود شاہد یعنی دیکھنے والا دوسرا وجود مشہود جو دیکھا جا رہا ہے۔ ایک آدمی جب بکری کو دیکھتا ہے کہ یہ بکری ہے۔ بالفاظ دیگر وہ یہ کہہ رہا ہے کہ میں بکری کو دیکھ رہا ہوں۔ یہ بالواسطہ دیکھنا ہے۔ دوسری طرز یہ ہے کہ بکری ہمیں دیکھ رہی ہے اور ہم بکری کے دیکھنے کو دیکھ رہے ہیں۔ یعنی

بکری کی زندگی کو قائم کرنیوالی لہریں ہمارے دماغ کی اسکرین پر بصورت اطلاع وارد ہوئیں۔ دماغ نے ان لہروں کو نقش و نگار میں تبدیل کیا اور یہ نقش نگار جب شعور کی سطح پر نمودار ہوئے تو بکری کی صورت میں مظہر بن گئے۔ قانون روحانیت کی رُو سے فی الواقع براہ راست دیکھنا ہی صحیح دیکھنا ہے اور بالواسطہ دیکھنا محض مفروضہ (Fiction) ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بہت زیادہ توجہ طلب ہے۔ اللہ تعالیٰ حضورﷺ سے ارشاد فرماتے ہیں۔

''اور تُو دیکھ رہا ہے کہ وہ دیکھ رہے ہیں، تیری طرف، وہ کچھ نہیں دیکھ رہے۔''

آیت مقدسہ کے مفہوم پر غور کیجئے۔ اللہ تعالیٰ یہ فرما رہے ہیں کہ وہ دیکھ رہے لیکن باوجود دیکھنے کے وہ کچھ نہیں دیکھ رہے۔ حاصل کائنات فخر موجودات سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قدسی نفس تشخص میں اللہ تعالیٰ کی جو تجلیات اور انوار کام کر رہے ہیں۔ وہ لوگوں کی آنکھوں سے مخفی ہیں اور تجلّیات اور انوار کو نہ دیکھنا اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق کچھ نہ دیکھنا ہے۔

اپنی حدود میں رہتے ہوئے براہ راست دیکھنے کی طرز رکھنے والے جن بندوں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اندر موجود انوار وتجلیات کا مشاہدہ کیا۔ وہ حضورﷺ کے ہم خیال بن گئے، یہ بات الگ ہے کہ براہ راست دیکھنا کسی بندے میں قلیل تھا اور کسی بندے میں زیادہ۔

ٹیلی پیتھی کا مفہوم یہ ہے کہ انسان جدوجہد اور کوشش کر کے براہ راست دیکھنے کی طرز سے قریب ہو جائے۔ جن حدود میں وہ براہ راست طرز نظر سے وقوف حاصل کر لیتا ہے۔ اسی مناسبت سے وہ لہریں جو خیال بنتی ہیں اس کے سامنے آ جاتی ہیں۔ یہ عجیب سربستہ راز ہے کہ پوری کائنات کے افراد اطلاعات اور خیالات میں ایک دوسرے سے ہم رشتہ ہیں۔ البتہ اطلاعات میں معانی پہنانا الگ الگ وصف ہے۔ بھوک کی اطلاع شیر اور بکری دونوں میں موجود ہے، لیکن بکری اس اطلاع کی تکمیل میں گھاس کھاتی ہے اور شیر بھوک کی اس اطلاع کو پورا کرنے کے لئے گوشت کھاتا ہے۔ بھوک کے معاملے میں دونوں کے اندر قدر مشترک ہے۔ بھوک کی اطلاع کو الگ الگ معانی پہنانا دونوں کا جداگانہ وصف ہے۔

آپ کا یہ سوال کہ ٹیلی پیتھی کو جاسوسی میں کیوں استعمال نہیں کیا جاتا اور یہ کہ ٹیلی پیتھی کے ذریعے سربستہ راز کیوں معلوم نہیں کئے جاتے، اس کے بارے میں ایسے شواہد موجود ہیں کہ ہپناٹزم کے ذریعے یورپ میں بڑے بڑے آپریشن کر دیئے جاتے ہیں اور مریض کو تکلیف کا احساس بالکل نہیں ہوتا وغیرہ وغیرہ۔ ہپناٹزم اور ٹیلی پیتھی ایک ہی قبیل کے دو علم ہیں۔ ان کا منبع اور مخزن ایک ہے یعنی خیالات کے اوپر، گرفت کا مضبوط ہونا۔

ایسے صاحب روحانیت جو ٹیلی پیتھی کے قانون سے واقف ہیں وہ آزاد ذہن ہوتے ہیں، انہیں کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ جاسوسوں کو پکڑتے پھریں اور پولیس کا کردار انجام دیں البتہ یہ بات عام طور پر مشاہدے میں آئی ہے کہ کوئی بندہ کسی صاحب روحانیت کی خدمت میں حاضر ہوا اور اگر اس بندے کے دماغ میں جو کچھ تھا وہ انہوں نے دانستہ یا غیر دانستہ طور پر بیان کر دیا۔

اہرام مصر کب اور کیوں قائم ہوئے اور ان کو تیس (۳۰) لاکھ تراشے ہوئے پتھروں سے کس طرح بنایا گیا جب کہ ہر چٹان کا وزن ستر (۷۰) ٹن ہے اور یہ زمین سے تیس سے چالیس فٹ کی بلندی پر نصب ہیں اور ان اہرام کا فاصلہ کم سے کم پندرہ (۱۵) میل اور زیادہ سے زیادہ پانچ سو میل ہے یعنی جن پتھروں سے اہرام مصر کی تعمیر ہوئی وہ پانچ سو میل دور سے لائے گئے تھے۔

میرے بھائی! کسی صاحب مراقبہ کے لئے یہ بات معلوم کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے لیکن ان کے سامنے اس سے بہت زیادہ ارفع و اعلیٰ اللہ تعالیٰ کے رموز ہوتے ہیں اور وہ ان رموز تجلیات میں محو استغراق رہتے ہیں۔

ایک بزرگ رمپا (Rampa) خیالات کی لہروں کے علم سے وقوف رکھتے ہیں۔ انہوں نے ماہرین آثار قدیمہ کے اصرار پر یہ انکشاف کیا ہے کہ بیس (۲۰) ہزار سال پہلے کے وہ لوگ جنہوں نے اہرام مصر بنائے ہیں آج کے سائنسدانوں سے زیادہ ترقی یافتہ تھے اور وہ ایسی ایجادات میں کامیاب ہو گئے تھے جن کے ذریعے پتھروں میں سے کشش ثقل ختم کر دی

جاتی تھی۔ کشش ثقل ختم ہو جانے کے بعد پچاس (۵۰) یا سو (۱۰۰) ٹن وزنی چٹان ایک آدمی اس طرح اٹھا سکتا ہے جیسے پروں سے بھرا ہوا ایک تکیہ۔ اس طرح سائنس کی اس دنیا میں ایک اور بزرگ جناب ایڈگر کیسی کے مطابق ان پتھروں کو ہوا میں تیرا (Float) کر موجود جگہ بھیجا گیا ہے۔

اہرام مصر کے سلسلے میں ان دانشور بزرگوں نے جو کچھ فرمایا ہے وہ لہروں کی منتقلی کے اس قانون کے مطابق ہے جس کو ٹیلی پیتھی کہا جاتا ہے۔

فلپائن میں آپریشن کی دنیا میں یہ حیرت انگیز اضافہ ہوا ہے کہ ایک ڈاکٹر اور ان کی ساتھی انگلی کے اشارے سے بڑے سے بڑا آپریشن کر دیتے ہیں۔ اور بڑی سے بڑی رسولی انگلی کے اشارے سے جسم سے باہر آ جاتی ہے یہ کوئی توہماتی بات نہیں۔ مووی کیمرہ سے اس کی باقاعدہ فلم لی گئی ہے اور بڑے بڑے دانشوروں نے اسکرین پر اس فلم کو دیکھا ہے۔

ہمارے اسلاف میں ایک بزرگ شاہ ولی اللہؒ گزرے ہیں جن کے ہاتھ اس جرم میں توڑ دیئے گئے کہ انہوں نے قرآن پاک کا ترجمہ کیا تھا۔ انہی بزرگ نے تحریری طور پر یہ بتایا ہے کہ انسان کے جسم سے اوپر ایک اور انسان ہے جو روشنیوں کی لہرون سے مرکب ہے۔ جس اصطلاحی نام انہوں نے نسمہ رکھا ہے اور جسے ڈاکٹر رمپا نے (Lura) کا نام دیا ہے۔

شاہ ولی اللہؒ نے یہ بات واضح دلیل کے ساتھ بتائی ہے کہ اصل، انسان نسمہ یعنی (Aura) ہے جتنی بیماریاں یا الجھنیں اور پریشانیاں انسان کو درپیش ہوتی ہیں، وہ نسمہ میں ہوتی ہیں۔ گوشت پوست سے مرکب خاکی جسم میں نہیں ہوتیں۔ البتہ نسمہ کے اندر موجود کسی بیماری یا پریشانی کا مظاہرہ جسم پر ہوتا ہے یعنی جسم دراصل ایک سکرین ہے اور نسمہ فلم ہے۔ فلم میں سے اگر داغ دھبہ دور کر دیا جائے تو اسکرین پر تصویر واضح اور صاف نظر آتی ہے۔ بالفاظ دیگر اگر نسمہ کے اندر سے بیماری کو نکال دیا جائے تو جسم خود بخود صحت مند ہو جائے گا۔

شاہ ولی اللہؒ نے اس بات کی بھی تشریح کی ہے کہ آدمی اطلاعات، انفارمیشن یا خیالات کا مجموعہ ہے۔ صحت مند خیالات پرسکون زندگی کا پیش خیمہ ہیں۔ اس کے برعکس اضمحلال،

پریشانی، اعصابی کشاکش، دماغی کشمکش اور نت نئی بیماریاں خیالات میں پیچیدگی، پراگندگی اور تخریب کی وجہ سے وجود میں آتی ہیں۔ ٹیلی پیتھی چونکہ انفارمیشن، خیالات یا اطلاع کو جاننے کا علم ہے اس لئے یہ علم سیکھ کر کوئی آدمی خود بھی الجھنوں اور پریشانیوں سے محفوظ رہتا ہے اور اللہ کی مخلوق کی خدمت کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

کسی چیز سے فائدہ اٹھانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس چیز کے اندر کام کرنیوالے اوصاف، اس کی حقیقت، اور اس کی ماہیت سے وقوف حاصل ہو۔ وقوف سے مراد یہ ہے کہ ہم نہ صرف یہ کہ لہروں کے علم سے واقفیت ہو بلکہ ہم یہ بھی جانتے ہوں کہ لہریں منجمد نہیں ہوتیں اور متحرک ہیں اور ان کی ہر حرکت زندگی کے اندر کام کرنیوالا ایک تقاضا ہے اور ان تقاضوں سے زندگی کے اجزاء مرتب ہوتے ہیں۔ ہر لہر اپنے اندر ایک وصف رکھتی ہے اور اس وصف کا نام ہم طاقت (Frequency) رکھتے ہیں۔ کسی طاقت سے فائدہ اٹھانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم اس طاقت کے استعمال سے واقف ہوں۔ اسی وقوف کو اللہ نے حکمت کا نام دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”اور ہم نے لقمان کو حکمت دی تا کہ وہ اسے استعمال کرے اور جو لوگ اس سے استفادہ کرتے ہیں۔ انہیں فائدہ پہنچتا ہے اور جو لوگ اس کا کفران کرتے ہیں وہ خسارے میں رہتے ہیں۔“

قرآن پاک پوری نوع انسانی کے لئے منبع ہدایت ہے جو لوگ حکمت کے قانون میں تفکر کرتے ہیں اور اس کی ماہیت میں اپنی تمام ذہنی صلاحیتیں مرکوز کر دیتے ہیں ان کے اوپر طاقت کے استعمال کا قانون منکشف ہو جاتا ہے اور نئی سے نئی ایجادات مظاہر بن کر سامنے آتی رہتی ہیں۔ کبھی استعمال کا یہ قانون ایٹم بم جاتا ہے اور کبھی ریڈیو اور ٹی وی کے رُوپ میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ایک ارشاد ہے۔ ”اور ہم نے لوہا نازل کیا اور اس کے اندر لوگوں کے لئے بے شمار فوائد رکھ دیئے۔“

غور و فکر کا تقاضا ہے اور اپنی بے بضاعتی پر آنسو بہانے کا مقام ہے کہ موجودہ سائنس کی

ہر ترقی میں لوہے کا وجود زیر بحث آتا ہے۔ جن لوگوں نے لوہے کی خصوصیات اور اس کے اندر کام کرنیوالی لہروں کی طاقت کو تلاش کر لیا ان کے اوپر یہ راز منکشف ہو گیا کہ بلاشبہ لوہے میں نوع انسانی کے لئے بے شمار فوائد مضمر ہیں۔

المیہ یہ ہے کہ ہم نے قرآن مجید کو محض ایصالِ ثواب اور حصول برکت کا ذریعہ بنا لیا ہے۔ اور قرآن پاک میں تسخیر کائنات سے متعلق جو فارمولے بیان ہوئے ہیں ان کو ہم سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ جن لوگوں نے تسخیر کائنات سے متعلق فارمولوں کے رموز و نکات پر ریسرچ کی اس کوشش میں اپنی زندگی کے ماہ و سال صرف کر دیئے انہیں اللہ تعالیٰ نے کامیابی عطا کی۔

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

☆☆☆

باب دھم

تلاوت اور توجہ

سوال: قرآن پاک کو پڑھنے کے ظاہری اور باطنی آداب کون کون سے ہیں۔

جواب: **فاقرؤ ماتیسّر من القرآن**۔ "جتنا آسانی قرآن پڑھ سکو اتنا پڑھ لیا کرو۔"

مقصد تلاوت صرف یہ نہیں کہ زبان پر الفاظ قرآن جاری ہو جائیں بلکہ اصل مقصد یہ ہے کہ ان الفاظ کے ذریعہ قرآن کی تعلیمات دل و دماغ میں محفوظ ہو جائیں اور اخلاقی اور روحانی افادیت اور علمی و عملی بصیرت کا باعث ہوں اور زندگی کو حق و صداقت کے سانچے میں ڈھال دیں اس لیئے ضرورت ہے کہ تلاوت کلام پاک کے موقع پر ان آداب و شرائط کو ملحوظ رکھا جائے جو اس مقصد کے حصول میں معین ثابت ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہ آداب کچھ ظاہر سے متعلق ہیں اور کچھ باطن سے۔ ظاہری آداب یہ ہیں کہ تلاوت کے وقت باوضو اور روقبلہ ہو۔ ادب واحترام کے ساتھ قرآن مجید کو کھول کر سامنے رکھے اور تلاوت پہلے **اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم** کہے اور آواز کو نہ زیادہ اونچا کرے اور نہ دھیما البتہ اگر نمود و ریا کا اندیشہ ہو تو پھر چپکے چپکے پڑھے مخارج حروف کا لحاظ رکھے وقف کے محل پر وقف کرے ٹھہر ٹھہر کر اس کے جملے ادا کرے اور ممکن ہو تو خوش الحانی سے تلاوت کرے مگر آواز میں اتار چڑھاؤ اور غنا کی کیفیت نہ ہونے پائے ارشاد پیغمبر اکرمؐ ہے "قرآن کو عرب کے لحن اور لب و لہجہ میں پڑھو اور فاسقوں اور گنہگاروں کے طرز لحن میں نہ پڑھو۔"

جب دوران تلاوت ایسی آیت پر نظر پڑے جو عذاب و وعید پر مشتمل ہو تو اللہ تعالیٰ کے غضب سے پناہ مانگے اور عالم آخرت کی کسی نعمت و آرام آرائش کا ذکر آئے تو اس کے لیئے اللہ تعالیٰ کے سامنے دامن پھیلائے دعا و استغفار کے سلسلہ میں کوئی آیت آئے تو دعا اور استغفار کرے۔ آیہ سجدہ پڑھے تو فوراً سجدہ کرے اور تین دن سے کم عرصہ میں پورے قرآن

کو ختم نہ کرے اور جب کوئی سورۃ ختم کرے تو یہ کہے صَدَقَ اللّٰہُ العلی العَظِیم وَ بَلَغَ رَسُولِہِ الکَرِیمَ اَللّٰھُمَّ انفَعنَا بِہ وَ بَارِک لَنَا فِیہِ اَلحَمدُ لِلّٰہِ رَبِّ العٰلَمِین. اور جب پورے قرآن کو ختم کرے تو دعائے ختم القرآن پڑھے یہ آداب وہ ہیں جن کا تعلق صرف ظاہر سے ہے اور وہ آداب جن کا تعلق ضمیر و وجدان اور باطن سے ہے یہ ہیں۔

پہلے یہ کہ قرآن مجید کی عظمت و تقدیس کو نظر میں رکھے اور اس کا عام کتابوں کی طرح مطالعہ نہ کرے بلکہ اپنے ذہن میں یہ تصور قائم کرے کہ یہ کتاب جو اس وقت ایک مجموعہ کی صورت میں اس کی نگاہوں کے سامنے ہے ایک وقت لوح محفوظ کی زینت تھی جو جبرائیل امین کے ذریعے نبی اکرم ﷺ کے قلب مبارک پر نازل ہوئی اور پھر ان کی زبان سے نکل کر فصحائے عالم کو گنگ کرتی ہوئی ہم تک پہنچی ہے۔ یہ عظمت و جلال کا تصور کرے کہ جو عرش و لوح زمین و آسمان چاند و سورج دریا پہاڑ غرض کائنات کی ہر چیز پر محیط ہے اور ہر عظیم سے عظیم تر ہر عظمت سے اس کی عظمت بالاتر ہے اور جب اس کی عظمت سے متاثر ہو کر اس کی تلاوت کی جائے گی تو اس کے قصص و مثال اور حکم و نصائح پوری طرح دل و دماغ کو متاثر کریں گے امام جعفر صادق کا ارشاد ہے "جو شخص قرآن کی تلاوت کرے اور اس کے دل میں انکساری اور رقت کے جذبات اور ضمیر میں حزن و خوف کی کیفیات پیدا نہ ہوں تو اس نے اللہ تعالیٰ کی عظمت و منزل کو نہیں سمجھا اور سراسر نقصان میں رہا۔"

یہ تصور کرے کہ یہ خطاب اسی سے ہے لہٰذا اس سے اسی طرح اثر لے جس طرح کسی فرمانروا کے فرمان کو پڑھ کر اثر لیا جاتا ہے اور اس پر ہر ممکن طریقہ سے عمل کیا جاتا ہے تاکہ سلطانی قہر و غضب کی زد میں نہ آئے۔

چوتھے یہ کہ شیطانی وساوس و خطرات اور فاسد خیالات کو اپنے دل سے دور رکھے تاکہ توجہ اور حضور قلب حاصل ہو سکے کیونکہ توجہ و انہماک نہ ہو تو تلاوت کی افادیت کمزور و مضمحل ہو جاتی ہے۔

پانچویں یہ کہ تلاوت کے وقت قرآن مجید کے ہر گوشہ پر نظر رکھے اس کے مطالب و

مقاصد کو سمجھے اور سمجھنے کے بعد انہیں ذہن نشین کرے تاکہ معانی معارف کا سرمایہ دل و دماغ میں فراہم ہوتا رہے اور فہم و تدبر کی راہیں کھلتی رہیں اور جب غور و فکر کا سرا ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے اور طبیعت اس طرف متوجہ نہیں ہوتی تو صلاحیت مردہ اور دل زنگ آلود ہو جاتا ہے چنانچہ ارشاد الٰہی ہے **افلا یتدبرون القرآن ام علی قلوب اقفالھا** قرآن میں کچھ بھی تو غور نہیں کرتے یا یہ کہ ان کے دلوں پر تالے لگے ہوئے ہیں۔

چھٹے یہ کہ صرف ظاہری معنی جاننے پر اکتفا کرے اس طرح کہ خالق کے معنی پیدا کرنے والے اور رازق کے معنی رزق دینے والے کے ہیں بلکہ جن آیتوں میں اس کے اسماء صفات اور مختلف افعال کا تذکرہ ہے ان میں غور و تدبر کرے کہ وہ خالق ہے تو اس کی خالقیت کی نوعیت کیا ہے اور کس طرح بغیر کسی مواد اور بغیر کسی نمونہ کے مختلف الانواع پیکر خلق کیئے اور رازق ہے تو اس کی رزافیت کا دائرہ کتنا وسیع ہے کہ سمندر کی تہ میں رہنے والے فضا میں اڑانے والے پہاڑوں کی کھوؤں میں بسنے والے سب ہی کو رزق مل رہا ہے اور شکم مادر میں کروٹیں بدلنے والے اور مفلوج و بے دست و پا تک کو روزی حاصل ہو رہی ہے جوں جوں انسان اس کی صفات میں غور و فکر کرے گا اس کا تصور و ادراک اپنی درماندگی کا اعتراف کریگا۔ اور یہ اعتراف معرفت کی حدود سے قریب کر دے گا۔

ساتویں یہ کہ جو امور فہم قرآن سے مانع ہوتے ہیں ان کا قلع قمع کرے ان مواقع میں چند یہ ہیں۔

"تقلید و تعصب۔ جب انسان کورانہ تقلید و تعصب کا شکار ہو جاتا ہے تو اس کے نتیجہ میں ایک مسلک کی جانبداری چاہے وہ کتنا ہی غلط کیوں نہ ہو اس کا وطیرہ بن جاتی ہے اور قرآن کو کھینچ تان کر اپنی رائے کے مطابق کرنے کی کوشش کرے گا اور قرآن کے واضح مفہوم کو نظر انداز کر کے خود ساختہ مطلب کو ثابت کرنے کے لیئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دے گا اور یہ کج فکری اس کی طبیعت میں اس طرح رچ بس جائے گی کہ طبیعت ثانیہ بن جائے گی اور اب اسے ٹیڑھی بات بھی سیدھی دکھائی دے گی۔

فکری جمود۔ اس سے ذہن کی انجینی کیفیت ختم اور فکر وکاوش کی قوت معطل ہو جاتی ہے اور وہ یہ سمجھ لیتا ہے کہ بس جو مفسرین نے لکھ دیا ہے وہی صحیح ہے اور اس کے علاوہ اور کوئی تفسیر نہیں ہو سکتی اور وہ غور وخوض سے ہاتھ اٹھا کر انہی کے قول پر قائل ہو جاتا ہے۔

اصرار معاصی۔ یہ بھی ایک بڑی رکاوٹ ہے کیونکہ گناہوں کے پیہم ارتکاب سے صفا نورانیت ختم ہو جاتی ہے اور دل پر تاریکی اور ظلمت کی ایسی تہیں چڑھ جاتی ہیں کہ حقائق و مصائب کی روشنی کا ان میں گزر نہیں ہو سکتا۔

سطحی انہماک۔ اس طرح کہ حروف اور ان کے مخارج وغیرہ کی تحقیق ہی پر اپنی توجہ کو منحصر کر دے اور جب توجہ انہی چیزوں کی طرف ہو گی تو معانی و مطالب کی طرف توجہ مبذول کرنے کا موقع نہ ملے گا یہ لوگ سطح دریا کے دلکش مناظر میں اس طرح کھو جاتے ہیں کہ انہیں یہ یاد نہیں رہتا کہ اس کی تہ میں کتنے خزانے مخفی ہیں کہ وہ موجوں سے کھیلیں اور لہروں سے ٹکرائیں اور اپنے دامن کو موتیوں سے بھریں۔

آٹھویں۔ یہ کہ قرآن نے حکم و مواعظ اور قصص و امثال پر غور کرے اور اس کے عبرت و نصیحت کے پہلوؤں کو دیکھے تو ان سے عبرت حاصل کرے اور ایسے امدار میں خطاب ہے جنہیں یہ تنبیہ اور سرزنش کی جا رہی ہے ان میں ایک فرد وہ بھی ہے اس لیئے اللہ تعالیٰ سے توبہ و انابت کرے گناہوں سے مغفرت چاہے اور عمل کی توفیق مانگے تا کہ خداوند عالم اسے قرآن پر عمل کرنے والوں میں شمار کرے اور شفاعت قرآن اسے نصیب ہو۔ قرآن مجید پند و نصائح حکم و مواعظ عبر و امثال اور احکام شریعت کا سرچشمہ ہے اس لیئے پڑھنا سننا اور اس میں غور و فکر کرنا ہماری زندگی کا معمول ہونا چاہیئے۔

نویں۔ یہ کہ جب کسی ایسی آیت کی تلاوت کرے جس میں تہدید و سرزنش ہو تو اس پر خوف و ہراس چھا جائے اور جب ایسی تلاوت کرے جس میں رحمت و مغفرت اور نعیم جنت کا تذکرہ ہو تو اس کے اندر امید و رجاء اور مسرت و انبساط کی روح دوڑنے لگے۔

دسویں۔ یہ کہ تلاوت کے موقع پر یہ سمجھے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حضور کھڑا ہے اگرچہ یہ اسے

نہیں دیکھ سکتا مگر وہ اسے دیکھ رہا ہے اور گوش بر آواز ہے جب اس تصور کے قائم کرنے میں کامیاب ہو جائے تو پھر یہ تصور کرے کہ خداوند کریم اس قرآن کے ذریعہ اس سے مخاطب ہے اور اسے اچھائیوں کا حکم دے رہا ہے اور برائیوں سے روک رہا ہے جب اس منزل تک پہنچ جائے تو پھر اسی کو اپنے تصورات و خیالات کا مرکز بنائے اس حد تک کہ فکر و خیال میں اس کے علاوہ اور کوئی گنجائش نہ رہے نہ اپنی ذات کی طرف نہ اپنے مال کی طرف اور نہ اہل و عیال کی طرف اور کلام کے پردہ میں متکلم سے لو لگائے کیونکہ اس کا کلام اس کا آئینہ دار ہے صادق آل محمد کا ارشاد ہے خدا کی قسم قدرت اپنے کلام کے اندر اپنی مخلوقات کے لیئے جلوہ گر ہے۔ لیکن وہ دیکھتے نہیں ہیں۔

گیارہویں۔ یہ کہ جب کسی آیت میں نیکو کاروں کا تذکرہ اور ان کی مدح اور توصیف ہو تو اپنے کو ان میں شمار نہ کرے اور نہ ان صفتوں کو اپنے پر منطبق کرنے کی کوشش کرے بلکہ اس موقع پر اللہ تعالیٰ سے دعا کرے کہ وہ مومنین کی صفات سے متصف ہو اور اللہ تعالیٰ اسے اہل صدق و صفا میں سے قرار دے اور خشوع کے ساتھ اس کی تلاوت کرے اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب دل اللہ تعالیٰ اور اس کے کلام کی عظمت سے متاثر ہو۔



”روحانیت اور قلب“

سوال: آپ نے اپنی تحریروں میں بے شمار جگہ فرمایا ہے کہ انسان ایسا پتلا ہے جو اندر سے کھوکھلا ہے اور روح نے اس کے اندر حرکت پیدا کی ہے۔ آپ ذرا تفصیل سے بیان فرمادیں کہ درحقیقت انسان کیا ہے۔ یہ نفس کیا چیز ہے اور لطائف ستہ جن کا ذکر بے شمار اولیاء نے اپنی تحریروں میں کیا ہے کیا ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے جزا سزا کا دارو مدار نیت کو قرار دیا ہے۔ ایک خیال آتا ہے اور انسان اس خیال کی بناء پر نیت کر لیتا ہے۔ اب اس کا نیت کرنے پر کس قدر اختیار ہے۔ اگر نیت پر کوئی اختیار نہیں تو جزا سزا کیا بیان فرمادیں۔ شکریہ

جواب: انسان کیا ہے؟ یہ معلوم کرنے کیلئے کہ انسان کس چیز کا نام ہے! مختلف ماہرین نے ہر زمانہ میں تحقیق کا دعویٰ کیا ہے۔ کسی نے کہا انسان بدن کا نام ہے کسی نے کہا روح کا نام ہے۔ انسان بہت سے اوصاف کا مالک ہے۔ جب انسان کہتا ہے کہ ”میں ایسا ہوں میں کیا کر سکتا ہوں یا میں نے یہ کام کیا اس ”میں“ یا ”ہم“ میں مکمل انسان کی نمائندگی ہوتی ہے۔ جو مرکب ہے روح، قلب، نفس اور جسم کا۔ ہر فرد اپنی شخصیت سے پہچانا جاتا ہے شخصیت فرد کی مکمل اکائی کا نام ہے۔ جس میں ظاہر و باطن دونوں شامل ہیں۔ ارث اپنی جگہ اور ماحول اپنی جگہ، بچہ بہت سے اوصاف اپنے ساتھ لیکر آتا ہے ان میں کچھ اوصاف ایسے ہوتے ہیں جو تمام انسانوں میں پائے جاتے ہیں۔ کچھ بچے میں انفرادی طور پر موجود ہوتے ہیں۔ ان سب پیدائشی خصوصیات کو ارث کہا جاتا ہے۔ خارجی دنیا میں ماحول اپنا اثر دکھاتا ہے داخلی اور خارجی پہلوؤں میں یکجہتی بنانے کیلئے ایک اور قوت کارفرما ہوتی ہے اس قوت میں روحانیت کا دخل ہوتا ہے۔ یہ ہی انسان کی تخلیقی قوت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اچھی سی مٹی کے ایک پتلے میں روح پھونکی اور انسان سامنے آیا۔ جب انسان کو زمین پر بھیجا گیا تو آدم بن گیا۔ اس دنیا میں پہلا تہذیب یافتہ انسان آدم علیہ السلام ہیں۔

حدیث رسولؐ ہے ”جسم انسانی میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے اور اگر وہ ٹھیک ہو گیا تو سارا جسم درست ہو گیا۔ اور اگر وہ بگڑ گیا تو سارا جسم بگڑا“ سو وہ ”قلب ہے۔ جس کی درستگی کے لیئے عضویاتی طب کی درستگی ضروری قرار دی گئی ہے۔ اس گوشت کے ٹکڑے کے علاوہ اس کے ساتھ ساتھ ایک اور قوت ہے اس کو بھی قلب کا نام دیا جاتا ہے۔ آسانی کے لیئے روحانی قلب کہہ لیجئے۔ اس کی نشوونما شخصیت کی نشوونما میں بڑی مددگار ثابت ہوتی ہے غزالیؒ کے نزدیک قلب روح، نفس اور عقل، قلب ہی کے زیر اثر ہیں۔ یہ سب قوتیں جن کا منبع دراصل قلب ہے، ایک ساتھ ایک نہج پر پروان چڑھتی ہیں تو شخصیت کی صحیح تعمیر ہوتی ہے۔

انسان دس اجزاء سے مرکب ہے۔ پانچ مادی اور پانچ فریادی۔ مادی اجزاء میں عناصر اربع اور نفس شامل ہیں فریادی اجزاء قلب، روح، سر، خفی، اخفیٰ ہیں۔ ان غیر مادی مجرد اجزاء کو لطائف خمسہ کہا جاتا ہے بعض صوفیاء نے اپنی اصطلاح میں نفس کو بھی شامل کیا ہے اور اس مجموعہ کو لطائف ستہ کہا جاتا ہے یہ اصطلاح عوام و خواص میں مشہور ہے۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ لکھتے ہیں کہ نفس کو لطائف میں شامل کرنا بوجہ اس کے مادی ہونے کے تغلیباً ہے مادی کے دو معنی ہیں۔ ایک یہ کہ مادہ اس کا جزو ہے۔ جیسے بدن انسانی دوسرے یہ کہ خود مادہ حلول کر رہا ہو۔ یہاں پر نفس کو دوسرے معنوں میں مادی کہا جاتا ہے کیونکہ نفس جو قوت داعیہ الی الشہوت منبع فی جمیع البدن ہے لہٰذا مادی ہے۔



نفس کا لفظ نفاست یا پھر تنفس سے ہے۔ کسی شخص کی ذات کو اس کا نفس کہتے ہیں۔ علامہ ابوالقاسم نے ”روضی الانفس“ میں لکھا ہے کہ روح اور نفس ایک ہی واحد شے ہے۔ فرق صرف اوصاف کی وجہ سے ہے۔ جو چیز فرشتہ ماں کے پیٹ میں پھونکتا ہے روح ہے۔ جب بچہ پیدا ہوتا ہے کسب اخلاق و اوصاف حمیدہ یا زمیمہ کرتا ہے۔ بدن سے عشق و محبت پیدا کر لیتا ہے اور مصالح بدن میں مشغول ہو جاتا ہے تو اس پر لفظ نفس بولا جاتا ہے۔ نفس اور روح کے درمیان فرق باعتبار صفات کے لیئے ہے نہ کہ باعتبار ذات کے لیئے پس نفس انسان کے اندر

ایک قوت ہے، جس سے وہ کسی چیز کی خواہش کرتا ہے خواہ وہ خواہش خیر کی ہو یا شر کی انسان نفس کے قبضہ میں نہیں بلکہ نفس انسان کے قبضہ میں ہے۔

بچہ سلیم فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ معصوم ہوتا ہے۔ ماحول، اس میں اچھائی، برائی نیک و بد کے اثرات اجاگر کرتا ہے، نفس کی نشوونما ہوتی ہے۔ تصور کے تین درجات ہیں ورنہ اولیٰ میں نفس کا نام مطمئنہ ہے۔ یہ درجہ اطمینان نفس کا ہے اس میں سکون کامل یا تام پیدا ہو جاتا ہے۔ درجہ ثانی میں لوامہ ہے۔ یہ غیر کامل وغیرہ تام ہے کشمکش ہے درجہ ثالثہ میں امارہ بالسو ہے یہ عدم سکون (ملق) ہے۔ نفس مطمئنہ امور خیر میں مقاومت تو نہیں کرتا لیکن وساوس وخطرات پیش آ جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کے ہر عضو کو کمال بخشا ہے۔ اگر وہ کمال حاصل نہ ہو تو اسے بے چینی اور اضطراب رہتا ہے۔ مثلاً آنکھ کا کام دیکھنے کا ہے اور کان کا کمال سننے پر، جب ان اعضاء کے وہ قویٰ سلب ہو جائیں جن سے کمالات وابستہ تھے تو ان کے جاتے رہنے سے کمی اور بے چینی پائی جاتی ہے۔ قلب کا کمال قلب کا سرور، عیش اور اسکی لذت و شگفتگی حق تعالیٰ کی معرفت پر، اس کی محبت وانابت پر اور اس کی طرف شوق اور توجہ پر ہے۔ جب قلب اس دولت سے محروم ہو جاتا ہے تو سخت عذاب اور بے چینی میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ جیسے آنکھ اپنا نور کھو کر اور زبان اپنی گویائی کھو کر۔

جب شک سے یقین کی طرف، جہالت سے یقین کی طرف غفلت سے ذکر، کی طرف گناہوں سے توبہ کی طرف، ریا سے خلوص، جھوٹ سے سچ کی طرف سستی سے چستی کی طرف، غرور سے عاجزی کی طرف، اکڑ سے فروتنی کی طرف اور بے عملی سے عمل کی طرف آ کر اطمینان حاصل ہو جاتا ہے تو روح کو چین مل جاتا ہے۔ ان تمام باتوں کی بنیاد نیکی اور خود آگہی پر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو تخلیق کیا، اپنا نائب بنایا۔ علم سکھایا، اس کو دنیا میں اپنی عبادت اور تسخیر کائنات کے لیئے بھیجا۔ فرد جسم اور روح کا مرکب ہے۔ فرد اور خدا ایک ہی عمل کے حصے

ہیں۔ انسان کا انسان سے، انسان اور فطرت کا فاصلہ دراصل مترادف ہے انسان اور خدا سے دوری کا۔ یہ بعد امراض ذہنی کا پیشرو ہے۔ ذات میں مکمل یکجہتی یک رنگی۔ قول وفعل میں ہم آہنگی ذہنی صحت کی علامت ہے وہ شخص جو اللہ کے احکام کو صدق دل سے مانتا ہے۔ وہ اپنی ذات دیگر افراد اور خلق خدا سے خائف نہ ہوگا۔ دنیا میں رہنے والے بندوں سے محبت کرے گا، ان کا برا نہیں چاہے گا اس کو اپنی ذات پر اعتماد ہوگا۔ اس اعتماد کے لیئے یقین کی ضرورت ہے اور یقین عقیدہ سے پیدا ہوتا ہے عقیدہ خدا کی وحدت سے پیدا ہوتا ہے وحدت اور کائنات میں رابطہ پیدا ہوتا ہے۔ راز و نیاز گفتگو کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے قرب، ذہن صحت اور اللہ تعالیٰ سے دوری، ذہنی امراض کا سبب ہے۔

قرب کے مختلف درجات ہیں۔ ایک قرب تو حقیقی ہے جس کا ترجمہ ''لمجانا'' کیا جاتا ہے۔ یا ادراک، حقیقت یا اس کے ہم معنی جس لفظ سے چاہیں کر لیں یہ حق تعالیٰ کے ساتھ حقیقی قرب تو کسی کو نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ حق تعالیٰ جسم ومکاں سے پاک ہے۔ لامتناہی کو متناہی محط نہیں کر سکتا۔ دوسرے قرب کا تعلق خصوصیت سے ہے۔ جیسے اردو میں ہم کبھی یوں کہتے ہیں کہ ''میں پاس ہوں، کہو کیا کہنا ہے؟'' یعنی میں سن رہا ہوں۔ اس میں پاس ہونے سے قرب علمی اور قرب سماع کا بیان مقصود ہے۔ کبھی ہم یوں کہتے ہیں کہ فلاں ہمارے قریب ہے۔ یعنی اس کو ہم سے خاص تعلق ہے نیز کہتے ہیں کہ تم دور رہ کر بھی پاس ہی ہو یعنی تم سے ہمارے دل کو خاص تعلق ہے۔ اللہ تعالیٰ کے قریب کون لوگ ہوتے ہیں؟ وہ ہیں ''ہاں! مگر جو ایمان لائے اور اچھے کام کرے۔''

اللہ تعالیٰ سے قریب کے ذرائع ایمان اور عمل صالح ہیں۔ قرب نام ہے کامل ایمان، عمل صالح اور باکمال دین کا خصوصاً جب وہ اس طبیعت کا حامل بن جائے کہ دینی زندگی ادد دینی احکام کی اطاعت طبیعت میں راسخ ہو جائے۔ زندگی کی ہر حرکت وسکون میں وہی بات بالطبع رغوبت وپسندہ وارادا کرنے کو جی چاہے جو خدا اور رسول کو پسند ہو اور اس کی مرضی ہو۔ علم اور عمل اور حال کا جمع کرنا طریقہ ہے قرب ورضا کا

ذہنی امراض کو باطنی امراض بھی کہا جاتا ہے۔ انہیں قوت عقلیہ، شہویہ اور غضبیہ کے افراط و تفریط والے درجوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے نمبر۱ جزیرہ نمبر۲ سفاہت نمبر۳ فجور نمبر۴ جمود نمبر۵ تہور اور نمبر۶ جبن۔ ان میں جہل۔ غرور ونخوت، حسد، ریا، حرص، طمع، شک، امل اور وسواس وغیرہ شامل ہیں۔

ان بیماریوں کا بنیادی سبب انسان کا اپنے رب کائنات اور اپنی ذات سے فرار ہے۔ اس فرار میں ماحول کا بہت عمل دخل ہے۔ اگر بچے کی نشوونما فطری طور پر نہ کی جائے تو وہ اپنے اندر مستقل طور پر ایک طرح کا خلاء محسوس کرتا ہے اور اگر معاشرہ اس خلاء کو پر کرنے کے لیئے صحت مندانہ ذرائع فراہم نہیں کرتا تو پھر منفی رجحانات پروان چڑھتے ہیں نیت میں فتور آ جاتا ہے اخلاص ختم ہو جاتا ہے۔ فرد اس قسم کی بیہودہ حرکات ظاہر کرتا ہے کہ اس کا یا تو اپنے آپ کو بہت کمتر یا پھر کسی ملک کا حکمران سمجھنا، دنیا سے الگ تھلگ ہو جانا یا پھر دنیا کا ہی ہو جانا۔ خوراک ولباس سے بے زادی۔ دوسرے کو اپنا دشمن سمجھنا۔ اپنے آپ کو سب سے زیادہ نیک سمجھنا یا پھر سب سے بڑا گناہ گار گردانا اس کے علاوہ بے چینی بے یقینی اور بے حس کی علامتیں بھی ذہنی امراض کی غمازی کرتی ہیں۔

☆☆☆

نیت! دل کا ایسی چیز کی طرف مائل ہو جانا جس کو اپنی غرض ونفع کے موافق سمجھتا ہے نیت کہتے ہیں اور اس کے معنی ارادہ وقصد کے ہیں۔ ہر کام کیلئے پہلے علم کی ضرورت ہوتی ہے اور علم کے بعد اس کے عمل میں لانے کا قصد ارادہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد ہی ہاتھ پاؤں ہلانے اور کام کرنے کی قدرت پیدا ہوگی۔ اس طرح وہ عزم اور پختہ میلان جس نے ہاتھ پاؤں ہلانے پر آمادہ کیا نیت کہلاتا ہے۔ رسول پاکؐ کا ارشاد ہے۔

”حق تعالیٰ تمہاری صورتوں اور مالوں کی طرف نظر نہیں فرماتے۔ لیکن تمہاری نیتوں اور اعمال پر نظر فرماتے ہیں“

اپنی طرف سے صرف اللہ تعالیٰ کے قرب ورضا کا قصد رکھنا اور مخلوق کی خوشنودی ورضا

مندی یا اپنی کسی نفسانی خواہش کی آمیزش نہ ہونے دینا اخلاص ہے۔ اخلاص کے وجوداً اور عدماً تین درجے ہیں۔ ایک یہ کہ فعل کے وقت غایت صحیح کا قصد ہو۔ یہ تو غایت اخلاص ہے اور یہی مقصود اور مرتبہ کمال ہے۔ دوسرے یہ کہ غایت فاسدہ کا قصد ہو۔ یہ اخلاص کے بالکل خلاف ہے۔ تیسرے یہ غایت صحیح یا غایت فاسدہ کچھ بھی قصد نہ ہو۔ بلکہ یونہی معمول کے مطابق ایک کام کر لیا جائے۔ اس کی اخلاص سے اتنا بعد نہیں جتنا دوسرے درجے کو ہے۔ نیت میں خلوص ذہنی صحت اور نیت میں فتور عدم اخلاص اور ذہنی بیماری کی علامت ہے۔

دوسرے مسلمان مفکرین کی طرح مولانا اشرف علی تھانویؒ ذہنی امراض کی بات اخلاق کی نسب سے کرتے ہیں کہتے ہیں ”اخلاق کے تین اصول ہیں۔ اصل میں تین قوتیں ہیں جن سے اخلاق پیدا ہوتے ہیں۔

۱۔ قوت عقلیہ
۲۔ قوت شہویہ
۳۔ قوت غضبیہ

بھلائی اور برائی کو سمجھنے کیلئے چاہے وہ دینوی ہو یا دنیاوی دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک وہ قوت جس سے منفعت ومضرت کو سمجھے وہ قوت ”مدرک عقلیہ“ ہے اور ایک یہ کہ منفعت کو سمجھ کر اس کو حاصل کرے۔ یہ ”قوت شہویہ“ کا کام ہے اور ایک یہ کہ مضرت کو سمجھ کر اس کو دفع کرے۔ یہ قوت ”قوت غضبیہ“ ہے۔ پھر ان تینوں سے مختلف اعمال صادر ہوتے ہیں۔ ان اعمال کے تین درجے ہیں۔

الف......افراط
ب......تفریط
ج......اعتدال

قوت عقلیہ کا افراط یہ ہے کہ اتنی بڑھے کہ وحی کو بھی نہ مانے۔ تفریط یہ ہے کہ اتنی گھٹے کہ جہل وسفہ (کمینہ پن) تک اتر آئے۔ اس طرح قوت شہویہ کا ایک درجہ افراط ہے کہ حلال

وحرام کی بھی تمیز نہ رہے۔ بیوی' ماں اور بہن سب برابر ہو جائیں۔ اور ایک درجہ تفریط یعنی ایسا پرہیز گار بنے کہ بیوی اور بچوں سے بھی پرہیز کرنے لگے اور مال کا ایسا حریص ہو کہ اپنا پرایا سب ہضم کرنے لگے یا ایسا زاہد بنے کہ ضرورت کی چیزیں بھی چھوڑ دے۔ قوت غضبیہ کا افراط یہ ہے کہ بالکل بھیڑیا بن جائے اور تفریط یہ ہے کہ ایسی نرم طبیعت کا مالک ہو کہ کوئی جوتے بھی مارے یا دین کو برا بھلا کہے تب بھی غصہ نہ آئے۔ گویا کہ جذبات کا وجود نہ ہو۔

قوت غضبیہ کے افراط کا درجہ ''جزیرہ'' اور تفریط کا درجہ ''سفاہت'' کہلاتا ہے۔ قوت شہویہ کا افراط کا درجہ ''فجور'' اور تفریط کا درجہ ''جمود'' ہے۔ قوت غضبیہ کا درجہ افراط ''تہور'' اور اور حد سے گھٹا ہوا درجہ ''جبن'' ہے۔ یہ سب ذہنی بیماری کی نشاندہی کرتے ہیں۔ قوت عقلیہ کے اعتدال کا درجہ ''حکمت'' قوت شہویہ کا ''عفت'' اور قوت غضبیہ کے اعتدال کا درجہ ''شجاعت'' کہلاتا ہے۔ یہ اعتدال کا درجہ ذہن صحت کی علامت ہے۔

یہ تو چیزیں تمام اخلاق حسن وسینہ کا احاطہ کرتی ہیں۔ ان میں تین درجے اعتدال کے یعنی حکمت' عفت اور شجاعت کے مجموعے کا نام عدالت ہے۔ باقی سب رزائل ہیں۔ انسان وہ ہے جس میں اعتدال ہے۔ یوں تو رزائل فطری محرکات بھی نفس کی ساخت میں شامل ہیں۔ لیکن جب تک وہ ان رزائل کی قوت سے عمل میں نہ لائے۔ اور ان کا ظہور بذریعہ صدور اعمال نہ ہو کوئی مواخذہ نہیں۔



''قرآن کانفرنس''

میرے مقالہ کا موضوع ہے ''قرآن پاک میں قصص الانبیاء اور اللہ تعالیٰ کے بیان کردہ ان قصوں میں حکمت اور روحانی علوم......''

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اس میں کوئی سورۃ' کوئی آیۃ اور کوئی نقطہ مفہوم ومعانی سے خالی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں انبیائے کرام کے جو قصے بیان کئے ہیں وہ کوئی کہانی بیان نہیں کی ہے کہ کہانی سنا کر اللہ ہمیں مرغوب کرے۔ اللہ تعالیٰ کو ہمیں مرغوب کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہماری حیثیت اور حقیقت ہی کیا ہے...... اللہ کے علوم لامتناہی ہیں۔ اللہ کا منشاء یہ ہے کہ ہم لوگوں کو آگے بڑھتا دیکھ کر خود بھی قدم بڑھائیں اور اللہ کی نعمتوں کے معمور خزانوں سے فائدہ اُٹھائیں۔ قرآن پاک میں انبیاء سے متعلق جتنے بھی واقعات بیان ہوئے ہیں ان میں ہمارے لئے اور تمام بنی نوع انسانی کے لئے ہدایت اور روشنی ہے۔ آج کی نشست میں ہم حضرت موسیٰؑ اور حضرت سلیمانؑ کے واقعات میں روحانی نقطہ نظر سے اللہ تعالیٰ کی حکمت بیان کریں گے۔

حضرت موسیٰؑ اپنے اہل وعیال سمیت بکریاں چراتے چراتے جب مدین سے بہت دور نکل گئے تو سردی کافی بڑھ گئی۔ سردی کی شدت اور اس سے بچاؤ کے لئے انہیں آگ کی ضرورت پیش آئی۔ رات کے وقت جس جگہ قیام تھا وہاں سامنے کوہ سینا کا سلسلہ نظر آ رہا تھا۔ حضرت موسیٰؑ نے چقماق استعمال کیا۔ مگر سخت سردی کی بنا پر چقماق سے چنگاری نمودار نہیں ہوئی۔ وادی ایمن کی طرف نگاہ اٹھی تو حضرت موسیٰؑ کو چمکتا ہوا ایک شعلہ نظر آیا۔ بیوی سے کہا تم یہاں ٹھہرو میں آگ لے آؤں۔

وادی ایمن میں پہنچے تو دیکھا کہ ایک درخت پر روشنی ہے مگر یہ روشنی نہ درخت کو جلاتی ہے اور نہ بجھتی ہے۔ حضرت موسیٰؑ جیسے جیسے آگے بڑھے یہ روشنی ان سے دور ہوتی چلی گئی۔ یہ دیکھ کر حضرت موسیٰؑ کے دل میں خوف پیدا ہوا اور انہوں نے ارادہ کیا کہ واپس چلے جائیں۔

جوں ہی وہ واپس جانے کے لئے مڑے' آگ قریب آ گئی۔ حضرت موسیٰ رک گئے آواز آئی ''اے موسیٰ! میں ہوں' میں اللہ رب العالمین'' .... پس موسیٰ اس کے قریب آئے تو پکارے گئے ''اے موسیٰ! میں ہوں تیرا پروردگار' اپنے جوتے اتار دے' تو طویٰ کی مقدس وادی میں کھڑا ہے اور دیکھ' میں نے تجھے اپنی رسالت کے لئے چن لیا ہے' پس جو کچھ وحی کی جاتی ہے اس کو کان لگا کر سن!''

خدا کے فضل کا موسیٰ سے پوچھے احول
کہ آگ لینے کو جائیں پیغمبری مل جائے

آواز کو سنا اور ان کو معلوم ہوا کہ ان کے نصیب میں وہ دولت آ گئی ہے جو انسانی شرف کا طرۂ امتیاز ہے تو والہانہ فریفتگی میں محو حیرت کھڑے رہ گئے۔

پھر پوچھا گیا ''اے موسیٰ! تیرے داہنے ہاتھ میں کیا ہے؟''

موسیٰؑ نے کہا ''یہ میری لاٹھی ہے۔ اس سے میں اپنی بکریوں کے لئے پتے جھاڑتا ہوں اور اس سے اپنی دوسری ضروریات بھی پوری کرتا ہوں۔''

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ''موسیٰ! اپنی اس لاٹھی کو زمین پر ڈال دے۔''

موسیٰؑ نے لاٹھی کو زمین پر ڈال دیا۔ پس ناگاہ وہ اژدہا بن کر دوڑنے لگا۔ موسیٰؑ گھبرا گئے۔ پیٹھ موڑ کر چلے ہی تھے کہ آواز آئی:۔

موسیٰ! اس کو پکڑ لو اور خوف نہ کھاؤ۔ ہم اس کو اصلی حالت پر لوٹا دیں گے۔''

موسیٰؑ نے بے خوف ہو کر اژدھے کے منہ پر ہاتھ ڈال دیا اور فوراً ہی وہ اژدہا لاٹھی بن گیا۔ اب موسیٰؑ کو دوبارہ پکارا گیا:

''اپنے ہاتھ کو گریبان میں لے جا کر بغل سے مس کر اور باہر نکال' تیرا ہاتھ روشن ہو جائے گا۔'' اور فرمایا ''یہ دو روشن نشانیاں ہیں تیرے رب کی طرف سے فرعون اور اس کے درباریوں کے سامنے پیش کرنے کے لئے وہ بڑے نافرمان لوگ ہیں۔''

حضرت موسیٰؑ نے عرض کیا ''میں تو ان کا ایک آدمی قتل کر چکا ہوں۔ ڈرتا ہوں کہ وہ

مجھے مار ڈالیں گے اور میرا بھائی ہارون مجھ سے زیادہ زور بیان رکھتا ہے۔ اسے میرے ساتھ مددگار کے طور پر بھیج تا کہ وہ میری تائید کرے مجھے اندیشہ ہے کہ وہ لوگ مجھے جھٹلائیں گے۔''

ارشاد باری تعالیٰ ہوا:

''ہم تیرے بھائی کی اعانت سے تیرا ہاتھ مضبوط کریں گے اور تم دونوں کو ایسی قوت بخشیں گے کہ وہ تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔ ہماری نشانیاں تمہارے پاس ہیں' تم اور تمہارے پیروکار فرعون اور اس کی جماعت پر غالب رہیں گے۔''

حضرت موسیٰؑ منصب نبوت سے سرفراز' کلام ربانی سے فیض یاب' تبلیغ کی دعوت میں کامیابی و کامرانی کا مژدہ پا کر مقدس وادی سے اترے اور اپنی بیوی کو لے کر مصر روانہ ہو گئے۔ مصر پہنچے تو حضرت ہارونؑ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے منصب رسالت عطا ہو چکا تھا۔

حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ نے باہم مشاورت سے طے کیا کہ خدائے تعالیٰ کا حکم فرعون کو سنانا چاہیئے۔ غرض دونوں بھائی فرعون کے دربار میں پہنچے اور بے خوف و خطر اندر داخل ہوئے۔ فرعون کے تخت کے قریب پہنچ کر حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ نے اپنے آنے کی وجہ بیان کی اور فرمایا۔''

''اے فرعون! ہم کو خدا نے اپنا پیغمبر اور رسول بنا کر تیرے پاس بھیجا ہے' ہم تجھ سے دو باتیں چاہتے ہیں۔ پہلی یہ کہ تو خدا پر یقین لاؤ اور کسی کو اس کا شریک نہ بنا اور دوسری یہ کہ ظلم سے باز آ جا۔ اور بنی اسرائیل کو اپنی غلامی سے آزاد کر دے۔ خدا نے ہمیں دو زبردست نشانیاں عطا فرمائی ہیں۔''

فرعون نے جب یہ سنا تو کہا۔ ''موسیٰ! آج تو پیغمبر بن کر میرے سامنے بنی اسرائیل کی رہائی کا مطالبہ کرتا ہے۔ وہ دن بھول گیا جب تو نے میرے ہی گھر میں پرورش پائی اور اسی گھر میں اپنا بچپن گزارا تو یہ بھی بھول گیا کہ تو نے ایک مصری کو قتل کیا اور یہاں سے بھاگ گیا۔''

حضرت موسیٰؑ نے فرمایا ''یہ صحیح ہے کہ میں نے تیرے گھر میں پرورش پائی اور ایک مدت تک شاہی محل میں رہا مجھے یہ بھی اعتراف ہے کہ مجھ سے نادانستگی میں ایک شخص قتل ہو گیا

لیکن کیا یہ عدل وانصاف کا تقاضہ ہے کہ مجھ ایک اسرائیلی کی پرورش کا بدلہ یہ قرار پائے کہ تو بنی اسرائیل کی تمام قوم کو غلام بنائے رکھے؟"

فرعون نے اپنی شیطنت سے بھری سرشت کے مطابق حضرت موسیٰؑ کو پیغمبر خدا ماننے سے انکار کر دیا' انکی تحقیر کی اور ان سے بحث شروع کر دی۔ ان کو خوف زدہ کرنے کی کوشش کی مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اوپر کوئی اثر نہ ہوا۔ انہوں نے فرمایا "تو نے جو کچھ کہا میری شخصیت اور ذات سے متعلق ہے لیکن کیا یہ باتیں اس بات کا جواز پیدا کرتی ہیں کہ تو پورے بنی اسرائیل کو غلام بنالے؟"

حضرت موسیٰؑ نے جب خدائے واحد کی پرستش کی دعوت دی اور دیوتاؤں کی پوجا کے خلاف آواز اٹھائی اور فرمایا اِنِّی رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعَالَمِیْنَ تو فرعون نے کہا "موسیٰ! تو یہ نئی بات کیا سناتا ہے' کیا میرے علاوہ بھی کوئی رب ہے جس کو تو رب العالمین کہتا ہے؟ اور درباریوں کی طرف مخاطب ہو کر تعجب اور حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "کیا تم سنتے ہو؟ یہ کیسی عجیب بات کہہ رہے ہے! مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود کو پیغمبر اور رسول کہتا ہے اور پھر حضرت موسیٰؑ سے مخاطب ہو کر کہا "اگر تو نے میرے سوا کسی کو معبود بنایا تو میں تجھے ضرور قید کر دوں گا۔"

حضرت موسیٰؑ نے کہا "اگر میں تجھے اپنے رب کی نشانیاں دکھا دوں تب بھی تو مجھ کو قید کرے گا؟"

فرعون نے کہا۔ "اگر تو سچا ہے تو مجھے نشانیاں دکھا۔"

حضرت موسیٰؑ آگے بڑھے اور بھرے دربار میں فرعون کے سامنے اپنی لاٹھی کو زمین پر ڈال دیا۔ اسی وقت اس نے اژدہے کی شکل اختیار کر لی۔ پھر حضرت موسیٰؑ نے اپنے ہاتھ کو گریبان میں ڈال کر باہر نکالا تو وہ ایک روشن ستارے کی طرح چمک رہا تھا۔

فرعون کے درباریوں نے جب اس طرح ایک اسرائیلی کے ہاتھوں اپنی قوم کے بادشاہ کی شکست کو دیکھا تو وہ جھنجلا کر کہنے لگے کہ بلاشبہ یہ ایک بڑا ماہر جادوگر ہے اور اس نے یہ

سب ڈھونگ اس لئے رچایا ہے کہ تم پر غالب آ کر تم کو تمہاری سرزمین مصر سے باہر نکال دے۔ ہم کو سوچنا ہے کہ کیا کرنا چاہیئے۔ بالآخر فرعون اور اس کے درباریوں کے باہمی مشوروں سے یہ طے پایا کہ مملکت مصر کے تمام ماہر جادوگروں کو دارالسلطنت میں جمع کیا جائے تا کہ وہ حضرت موسیٰؑ کا مقابلہ کریں۔ اس فیصلہ کے بعد فرعون نے حضرت موسیٰؑ سے کہا۔ "موسیٰ! ہم اچھی طرح سمجھ گئے ہیں کہ تو ہم کو سرزمین مصر سے بے دخل کرنا چاہتا ہے لہٰذا اب تیرے اور ہمارے درمیان مقابلے کے دن کا معاہدہ ہو جانا چاہیئے۔

حق و باطل کا معرکہ:

یوم جشن آ پہنچا۔ میدان میں فرعون تمام شاہانہ کروفر کے ساتھ تخت نشیں ہے۔ لاکھوں کا مجمع ہے۔ ایک جانب مملکت مصر کے مشہور جادوگروں کا گروہ اپنے سحر کے لوازمات کے ساتھ کھڑا ہے اور دوسری جانب خدا کے رسول' حق کے پیغامبر' سچائی اور راستی کے پیکر حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کھڑے ہیں۔ فرعون بہت مسرور اور شاداں ہے۔ اسے یقین ہے ساحرین ان دونوں بھائیوں کو شکست دے دیں گے۔ وہ ساحروں کی حوصلہ افزائی کر رہا ہے۔ انعام و اکرام کا لالچ دے رہا ہے۔ ساحرین کو بھی اپنی کامیابی کا یقین ہے اور انعام کے حصول کے تصور سے نہایت مسرور اور خوش ہیں۔

حضرت موسیٰؑ تقریر کرنے کھڑے ہوتے ہیں تو مجمع پر سناٹا چھا جاتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں "تمہاری حالت پر سخت افسوس ہے۔ تم کیا کر رہے ہو۔ ہم کو جادوگر کہہ کر خدا پر جھوٹا الزام نہ لگاؤ۔ ڈر ہے خدا تم کو اس بہتان تراشی کی سزا میں نیست و نابود نہ کر دے کیوں کہ جس کسی نے خدا پر بہتان باندھا وہ نامراد ہی رہا۔"

جادوگر آگے بڑھ کر حضرت موسیٰؑ سے کہتے ہیں "موسیٰ! ان باتوں کو چھوڑ و اور یہ بتاؤ کہ ابتدا تیری طرف سے ہوگی یا ہم پہل کریں؟"

حضرت موسیٰؑ نے فرمایا "پہل تمہاری طرف سے ہوگی اور تم اپنے کمال فن کی پوری پوری حسرت نکال لو۔"

چنانچہ ساحروں نے اپنی رسیاں' بان اور لاٹھیاں زمین پر پھینک دیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ان میں حرکت پیدا ہوئی اور سانپ اور اژدہے کی شکل اختیار کر کے دوڑنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ پورا میدان ان سے بھر گیا۔

حضرت موسیٰؑ نے جب یہ حال دیکھا تو ان کو تردد ہوا۔ فوراً وحی نازل ہوئی ''موسیٰ! خوف نہ کھاؤ۔ ہمارا وعدہ ہے کہ تم ہی غالب رہو گے۔ اپنی لاٹھی زمین پر ڈال دو۔''

حضرت موسیٰؑ نے جوں ہی لاٹھی کو زمین پر ڈالا اور وہ ایک بڑا اژدہا بن گئی اور اس نے ساحروں کے تمام شعبدوں یعنی ان گنت سانپوں اور اژدہوں کو نگل لیا اور میدان صاف ہو گیا۔

حکمت:

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں کوئی تذکرہ ایسا نہیں کیا جو محض کہانی یا تاریخ ہو۔ جو کچھ ارشاد کیا ہے اس کے پس پردہ نوع انسانی کے لئے ایک حکمت ہے۔ مثلاً فرعون کے زمانہ میں مصر کے رہنے والے بنی اسرائیل کی عورتوں سے' مردوں سے اور بچوں سے خدمتیں لیتے تھے لیکن ان کے رہنے کے لئے ایسی جگہ مقرر کی تھی جہاں گوڑیاں پڑتی تھیں۔ تنگ دستی کا یہ عالم تھا کہ انہیں روٹی تک میسر نہ تھی۔ کپڑا پھٹا پرانا انہیں مصریوں سے مل جاتا تھا۔ انہیں اس بات کی بھی اجازت نہ تھی کہ وہ اپنی مرضی سے شہر میں داخل ہو سکیں بجز ان اوقات کے جس میں وہ مصریوں کی خدمت کرتے تھے۔ ایک طرف بنی اسرائیل کی یہ حالت تھی اور دوسری طرف مصریوں کی شان و شوکت کا یہ حال تھا کہ آج تک لوگوں کے پیش نظر ہے۔ ان کے وہ کمالات' ان کا وہ فن اور ان کے جادوگروں کی عظمت اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ آج بھی ان کی یادگاریں اور ان کے جادو کے اثرات فراعین کے مقابر سے نمایاں ہیں۔

جو تختیاں قبطی زبان میں لکھی ہوئی ملی ہیں ان کو پڑھنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ فرعون اور اس کی اولاد نے اپنے مقبروں کو بنانے میں ایسا فن استعمال کیا جو کمال کے درجہ تک پہنچ جاتا ہے۔ انہوں نے تختیوں پر لکھ دیا تھا ''اگر ہماری کوئی چیز خراب کی گئی یا کسی نے ہاتھ لگایا یا کوئی

سامان چرایا تو وہ تباہ و برباد ہو جائے گا۔''

اس قسم کے حالات پیش آتے رہے ہیں کہ جس زمانہ میں بھی مقبروں کو کھولا گیا' اس کام میں پیش پیش لوگ اور ان کے خاندان تباہ و برباد ہو گئے۔ آج بھی ان کے فن اور ان کے جادو میں اثر موجود ہے اور ان کی لکھی ہوئی تحریر کے مطابق عمل درآمد ہوتا ہے۔

اندازہ لگایئے کہ ایک طرف غربت زدہ اور اچھوت قوم اور دوسری طرف فرعون اور اس کا جاہ و جلال اور وہ جادوگر جو پیغمبر کے مقابلے میں آ گئے۔

بظاہر اگر کسی شخص کو بنی اسرائیل اور فرعون کے حالات بتائے جائیں تو وہ کیسے یقین کرے گا کہ بنی اسرائیل کے لوگ فاتح ہوئے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ایک طرف ان کو سر بلند کیا اور دوسری طرف فرعون کو قعر مذلت میں پھینک دیا۔ مقصد صرف اتنا ہے کہ لوگ اس کو محض کہانی یا تاریخ سمجھ کر نہ پڑھیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ پر غور کریں۔ جو نوع انسانی کے لئے راہ ہدایت ہے۔ فراعین کے زمانہ کے علوم اور کمال آج بھی لوگوں کے سامنے ہیں۔ یہ علوم انہیں کہاں سے ملے؟ ظاہر ہے کہ یہ علوم بھی انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ودیعت ہوئے اللہ کا کرم دیکھئے کہ اس نے ہماری زمین پر ایسے آدمی بنائے جنہوں نے اس قسم کے کمرے وضع کئے جس میں ممی رکھی گئی اور وہ ممی آج تک ویسی کی ویسی موجود ہے۔ ایسے زبردست علوم و فنون کے ماہر اور شان و شوکت کے حامل لوگوں کو بنی اسرائیل جیسے خستہ حال لوگوں نے ملیا میٹ کر دیا۔

فراعین مصر کے مقبروں کا ایک کمال یہ ہے کہ کسی ایک مقبرے میں جتنے کمرے ہیں وہ نہ چوکور ہیں اور نہ گول بلکہ ایک خاص وضع کی ایجاد ہیں۔ وہ کمرے جو ممی کی حفاظت کرتے ہیں انہی آدمیوں کے بنائے ہوئے ہیں۔ جن کو اللہ نے تخلیق کیا۔ اور علم سے نوازا۔ اس علم کے ذریعہ انہوں نے مقبرے تعمیر کئے۔ آپ ایک طرف ان کے حال پر اللہ کا کرم دیکھئے اور دوسری طرف اس قوم کی سرکشی ملاحظہ کیجئے' جس کو ہزاروں سال گزرنے کے بعد بھی فرعونیت کہا جاتا ہے۔ غور طلب یہ ہے کہ ان کی نگاہوں پر اس ہی عقل نے جس پر مصریوں کا تکیہ تھا

اور جس عقل سے مصر کو سر بلندی اور تہذیب حاصل تھی وہی عقل ان کے لئے گمراہی کا سبب بن گئی اور نتیجہ میں انہوں نے اللہ تعالیٰ کو ناراض کر دیا۔ یہ ناراضگی ان کے اوپر عذاب در عذاب بن کر نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے انہیں اس قوم کے ذریعہ عذاب میں مبتلا کر دیا جو خستہ حال، کوڑیوں پر رہنے والی، ننگی، بھوکی اور اچھوت قوم تھی...... ایسی قوم جس کا نہ کوئی معیار زندگی تھا، نہ اس کے پاس کوئی طاقت تھی اور نہ ہی وہ مصریوں کی طرح علوم وفنون میں مہارت رکھتے تھے۔

بنی اسرائیل میں اللہ تعالیٰ نے ایک شخص کو پیدا کر دیا اور اس شخص نے مصریوں کا تختہ الٹ دیا۔ یہ بھی فکر طلب ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے پرورش بھی فرعون کے گھر میں پائی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا اور ان کے دماغوں کو بے کار کر دیا اور اس بات کو چھپا لیا کہ یہ بچہ بنی اسرائیل کا ہے۔ اہل فن، ذہین اور یکتائے روزگار ساحروں کی نگاہوں سے بھی وہ بچہ پوشیدہ رہا۔ یہ دوسرا پردہ تھا جو اللہ تعالیٰ نے ان کی نگاہوں پر ڈال دیا۔

کیا آج وہ اللہ ایسا کرنے پر قادر نہیں ہے؟ یا وہ اللہ بدل گیا ہے؟ یا وہ اللہ پردہ کے اندر نہیں دیکھتا یا آج کوئی انسان ہے جو اللہ کے بنائے ہوئے پردوں میں جھانک سکے؟ حضرت موسیٰؑ کے ان معجزات پر غور کرنے سے یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ جن چیزوں کو لوگوں کی نظر سے چھپا دیتا ہے وہی چیزیں سرکش لوگوں کے لئے عذاب بن جاتی ہیں...... آج کا دور بھی علوم وفنون اور عقل کا دور ہے اور یہ علوم وفنون اور عقل انسان کے لئے ایک آزمائش اور ابتلا بن گئی ہے جیسا کہ مصریوں کے لئے ان کے علوم وفنون اور عقل عذاب بن گئی تھی۔

آج جن علوم وفنون اور عقل کا تذکرہ عام ہے اس پر غور کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ عقل جس میں اللہ کے ساتھ تفکر شامل نہ ہو اور روحانی قدریں نہ ہوں وہ انسانوں کو تباہی کی طرف لے جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا ہے:

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَّ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ. یعنی مہر لگادی اللہ نے اس کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر اور ان کی آنکھوں پر پردہ

ڈال دیا اور ان کے لئے بہت بڑا عذاب ہے۔

یہ تذکرہ ان لوگوں کا ہے جو ہدایت سے محروم ہیں یعنی جن کے دل شکوک وشبہات سے بھرے ہوئے ہیں اور جو علوم وفنون اور عقل پر تکیہ کرتے ہیں۔ ایسی عقل جس کو یہ پتہ نہیں کہ ایک لمحہ کے بعد ہمارے ساتھ کیا پیش آنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق ہدایت یافتہ وہ لوگ ہیں جن کا یقین غیب پر قائم ہے۔ اور جو قائم کرتے ہیں صلوٰۃ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیئے ہوئے مال میں سے خرچ کرتے ہیں اور یقین رکھتے ہیں قران پاک پر اور ان کتابوں پر جو قرآن سے پہلے نازل ہوئیں اور یوم آخرت پر۔

سائنس کی ترقی کے اس دور میں طرز فکر کے لئے دو اصطلاحیں وضع کی گئیں۔ ایک کا نام فکر جدید اور دوسری کا نام فکر قدیم رکھا گیا۔ فکر جدید سے مراد یہ ہے کہ وہ باتیں جو عقل و شعور کے احاطہ میں آسکیں اور جو علم، عقل وشعور کے دائرے میں نہیں آتے اور جن کے رموز و نکات واضح نہیں ہوتے اس طرز کا نام فکر قدیم ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ علم حصولی کے ذریعہ جو فہم پیدا ہوئی اس کا نام فکر جدید رکھا گیا اور وہ فہم وادراک جو اس علم حصولی کے دائرہ کار سے باہر ہے یعنی ایسی بات جو عقل کے دائرہ میں نہ آئے وہ فکر قدیم قرار پائی۔ ہمارے ساتھ مشکل یہ ہے کہ ہم نے اپنے اسلاف کے علوم وفنون کو چھوڑ کر جدید دور کے علمائے فن کے رموز ونکات کو ہی سب کچھ سمجھ لیا ہے۔ فکر جدید کی نت نئی ترقیوں نے ہم مسلمانوں کو بھی اس ہی عقل کی دلدل میں لا پھینکا ہے جس میں فراعین مصر کے علماء گرفتار بلا تھے۔ آج کے لاسلکی دور میں فاصلے مٹ گئے، آواز ہزاروں میل کو محیط ہوگئی اور اس کی علمی توجیہہ بھی ہمارے سامنے آئی وہ یہ کہ آواز کے قطر بہت چھوٹے اور بہت بڑے ہوتے ہیں جنکو ویولینگھ (Wavelength) کا نام دیا گیا۔

سائنس دانوں نے اندازہ لگایا ہے کہ ۴۰۰ قطر سے نیچے اور ۱۶۰۰ قطر سے اوپر کی آوازیں آدمی نہیں سن سکتا لیکن یہ آوازیں برقی رو کے ذریعہ سننا ممکن ہے۔ ہم جب اپنے اسلاف کی طرف نظر اٹھاتے ہیں تو ہمارے سامنے یہ بات آجاتی ہے کہ یہ آوازیں برقی رو یا

آلہ سماعت کے بغیر بھی سنی جا سکتی ہیں...... حضرت عمرؓ مدینہ منورہ میں خطبہ دے رہے تھے۔ دوران خطبہ بلند آواز میں فرمایا یَا سَارِیَةَ الجَبَل' حضرت عمرؓ کے ہونٹوں سے نکلی ہوئی یہ آواز مصر میں سنی گئی اور حضرت ساریہؓ نے اس آواز کا پورا پورا مفہوم سمجھ کر عمل کیا۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق زمان و مکان (Time And Space) کی نفی کی مثال حضرت سلیمانؑ کے واقعہ میں بھی مذکور ہے۔ حضرت سلیمانؑ نے اپنے درباریوں سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''میں چاہتا ہوں کہ ملکہ سبا کے پہنچنے سے پہلے اس کا تخت شاہی اس دربار میں موجود ہو۔ تم میں سے کون اس خدمت کو انجام دے سکتا ہے۔''

عفریت نے جو قوم جنات میں سے تھا کہا۔ ''اس سے پہلے کہ آپ دربار برخاست کریں میں یہ تخت لا سکتا ہوں۔''

جن کا یہ دعویٰ سن کر ایک انسان جس کے پاس کتاب کا علم تھا یوں گویا ہوا ''اس سے پہلے کہ آپ کی پلک جھپکے میں یہ تخت آپ کی خدمت میں پیش کر سکتا ہوں۔''

حضرت سلیمانؑ نے رخ پھیر کے دیکھا تو ملکہ سبا کا تخت موجود تھا۔ غور طلب بات یہ ہے کہ یمن سے بیت المقدس کا فاصلہ تقریباً ۱۵۰۰ میل ہے اور یہ فاصلہ پلک جھپکتے طے ہو گیا۔ محض خیالی بات نہیں بلکہ ایک مرصع اور منقش تخت شاہی بغیر کسی وسیلہ کے ایک ملک سے دوسرے ملک میں منتقل ہو گیا۔

یہ وہ فکر ہے جس کا نام فکر قدیم رکھا گیا۔ فکر جدید نے ہمیں اس سے دور بہت دور کر دیا۔ حضرت سلیمانؑ کے اس واقعہ میں یہ بات فکر طلب ہے اور اس میں یہ حکمت پوشیدہ ہے کہ زمان و مکان کی نفی کا یہ عمل ایک ایسے انسان سے سرزد ہوا جس کے پاس علم کتاب تھا۔ یعنی وہ کتاب کے علوم اور رموز سے باخبر تھا۔ دوسری حکمت اس میں یہ ہے کہ قرآن پاک میں ہر وہ علم موجود ہے جس کا پہلے تذکرہ ہو چکا ہے یا آئندہ کبھی تذکرہ ہوگا۔ اللہ جل شانہٗ نے فرمایا ہے۔ ہم نے داؤدؑ اور سلیمانؑ کو ایک علم دیا۔ یعنی یہ علم اللہ تعالیٰ کی طرف سے Inspire ہوا۔ (Inspiration) خواہ سن کر خواہ کوئی منظر دیکھ کر ہو' بہرحال وہ اللہ تعالیٰ کی طرف

سے ہوتا ہے۔ اللہ کے پیغمبروں کے پاس وحی آتی ہے اور وحی کے ذریعہ نزول علم ہوتا ہے۔

قانون یہ ہے کہ جب کہ اللہ کی طرف سے کوئی بات ذہن میں آتی ہے تو وہاں اللہ ہی کا علم ہوتا ہے کسی انسان کا علم نہیں ہوتا جیسا کہ آج کل دیکھا جا رہا ہے۔ جہاز' ٹیلی فون' ٹیلکس جن لوگوں نے بنائے وہ اللہ ہی کی طرف سے (Inspire) کئے گئے۔ وہ کیا تھے' وہ کیا ہیں اس سے ہمیں بحث نہیں۔ ہم صرف اللہ کی ذات کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں اور اللہ قادر مطلق ہے۔ دوسری بات یہ کہ انسان کو وہ چیز مل جاتی ہے جس کی اسے تلاش ہوتی ہے لیکن شرط قانون یہ ہے کہ آدمی اپنی پوری صلاحیتوں کے ساتھ تن من' دھن سے کسی چیز کی تلاش میں لگ جائے۔ اور تلاش کو زندگی کا مقصد قرار دے۔ یہ اللہ کی سنت ہے۔ پہلے بھی جاری تھی' اب بھی جاری ہے۔ اور آئندہ بھی جاری رہے گی۔ اس بات کو ہمارے بزرگوں نے دو الفاظ میں بیان کیا ہے...... جوئندہ یابندہ۔

قرآن پاک میں ارشاد ہے...... ''اور نازل کیا ہم نے لوہا اور اس میں انسانوں کے لئے بے شمار فوائد رکھ دیئے ہیں۔'' سائنس کی کون سی ایسی ایجاد ہے جس میں کسی نہ کسی طریقہ سے لوہا استعمال نہ ہوتا ہو...... کتاب ہماری ہے فائدہ غیر اٹھا رہے ہیں۔ ہم نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد کی قدر نہیں کی اور تفکر کو زندگی کا مقصد قرار نہیں دیا۔ نتیجہ میں ہم اللہ تعالیٰ کے اس انعام سے محروم ہو گئے...... قانون اپنی جگہ قانون ہے...... لوہے میں بے شمار فوائد موجود ہیں۔ جس نے ان فوائد کو تلاش کرنے میں اپنی صلاحیتیں صرف کیں اس نے ان فوائد کو حاصل کر لیا۔

چند اشخاص نے زمین کے اندر اس دھات کو تلاش کیا جس کو یورانیم (Uranium) کہتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ لوگ ان کا مذاق اڑاتے تھے لیکن جب سائنسدان کو یورانیم مل گیا تو لوگ حیرت زدہ رہ گئے۔ اور ان کو قابل تعریف سمجھ کر ان کی پیروی کی جو کامیاب تھے۔

اب سوال یہ ہے کہ ہم قرآن پاک کی طرز فکر کو کس طرح حاصل کر سکتے ہیں؟ کیا یہ بات ہم نہیں جانتے کہ ایک مسلمان کے لئے یہ ضروری ہے کہ قرآن کے ایک ایک حرف پر یقین رکھتا ہو' ایسا یقین جو شکوک و شبہات سے پاک ہو۔ اگر ہم اپنے دل میں ایمان اور یقین کو

جگہ دیں اور دل کی حدود تک لے جائیں اور دل کے احاطہ میں رکھیں اور اللہ تعالیٰ کے ارشادات پر پورا پورا یقین کرلیں تو ہمارے اوپر وہ تمام رموز جو قرآن پاک میں موجود ہیں منکشف ہو سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی دعوت دی ہے، جگہ جگہ فرمایا ہے "تفکر کرو۔" یہ بھی فرمایا ہے "کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے۔ اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے، تم ایمان نہیں لائے، مسلمان ہو لیکن ابھی تمہارے دل میں ایمان داخل نہیں ہوا۔"

دیکھیئے!...... یہاں مسلمان اور مومن کا فرق سمجھنا ضروری ہے۔ مسلمان ہونا الگ بات ہے اور دل میں ایمان کا داخل ہونا الگ بات ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق ہم مسلمان ہیں لیکن ابھی ہمارے دلوں میں ایمان داخل نہیں ہوا۔ جس وقت ہمارے دلوں میں ایمان اتر جائے گا یقیناً ہم تسخیر کائنات کے فارمولوں سے واقف ہو جائیں گے۔ کتنی ستم ظریفی ہے کہ ہم ہر معاملہ میں یورپ کی تقلید کرتے ہیں اس لئے کہ ان کے علوم پر ہمیں اعتماد اور یقین ہے لیکن قرآن کریم کے بتائے ہوئے فارمولوں پر ہمیں یقین نہیں ہے۔ قرآن پاک میں جو فارمولے تسخیر کائنات سے متعلق بیان ہوئے ہیں ان کی تشریح کرنا اس مختصر وقت میں ممکن نہیں لیکن میں آپ کی توجہ ایک بار پھر حضرت سلیمانؑ کے واقعہ کی طرف مبذول کراتا ہوں۔ اس واقعہ میں یہ بات ہمارے سامنے آئی کہ جو بندہ ۱۵۰۰ میل کے فاصلہ سے پلک جھپکنے سے پہلے ملکہ سبا کا تخت لے آیا اس بندہ نے پہلے کہا کہ میرے پاس علم کتاب ہے۔ علم کتاب کو حاصل کرنا تفکر کے ذریعہ ممکن ہے۔ تفکر کا اصل اصول معلوم کرنے کے لئے اپنی روح سے وقوف ضروری ہے۔ جو لوگ اپنی روحانی صلاحیتوں سے واقفیت نہیں رکھتے ان کا یقین کمزور ہوتا ہے۔ اور ان کا شمار ہدایت یافتہ لوگوں میں نہیں ہوتا اور جو لوگ ہدایت یافتہ نہیں ہیں ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی جاتی ہے اور آنکھوں پر پردے ڈال دیئے جاتے ہیں۔

حضرت حاجی امداد اللہؒ مہاجر مکی نے روحانی صلاحیتوں سے واقف ہونے کے لئے اسباق تجویز فرمائے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ روح کی صلاحیتوں سے واقفیت حاصل کرنے کے

لئے مراقبہ ضروری ہے۔ مراقبہ کا قانون بیان کرتے ہوئے اَللّٰہُ نُورُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْض کی تشریح اس طرح کرتے ہیں کہ اللہ سماوات اور ارض کی روشنی ہے اور ارض پر موجود تخلیق روشنی کے ہالہ میں بند ہے اور یہ روشنی روح ہے اور روح کے علم کو چھ حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ تصوف میں اس کا اصطلاحی نام لطائف ستہ ہے۔

(۱) لطیفۂ اخفیٰ (۲) لطیفۂ خفی (۳) لطیفہ سری (۴) لطیفۂ روحی (۵) لطیفۂ قلبی (۶) لطیفہ نفسی

زندگی کے تاروں پر نظر ڈالی جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ زندگی کے تقاضے اور زندگی میں کام آنے والے اعمال واشغال اور تحریکات سب کا سب علم ہیں...... ہم زندہ ہیں یہ بھی علم ہے۔ بھوک، پیاس اور زندگی کے سارے تقاضے علم سے باہر کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ زندگی سے متعلق اس علم کو مظہر بننے تک چھ دائروں سے گزرنا پڑتا ہے۔ جب کوئی علم مظہر بنتا ہے تو پہلے اس کا ایک واہمہ ہمارے دماغ میں وارد ہوتا ہے۔ جہاں یہ وارد ہوتا ہے اس کا نام لطیفۂ اخفیٰ ہے۔ پھر یہ واہمہ خیال بنتا ہے۔ جہاں پر خیال بنتا ہے اس کا نام لطیفۂ خفی ہے۔ خیال کے اندر جب روشنی کا ہجوم ہوتا ہے تو یہ تصور بن جاتا ہے اور اس کا مقام لطیفۂ سری ہے۔ تصور جب احساس کے خدوخال میں ڈھلتا ہے تو اس کا نام لطیفۂ روحی ہے اور جب یہ احساس لطیفۂ قلبی پر وارد ہوتا ہے تو نگاہ بن جاتا ہے۔ نگاہ مشاہدہ بن کر عمل بن جاتی ہے۔ یہی لطیفۂ نفسی ہے۔

اس حقیقت سے کوئی فرد واحد بھی انکار نہیں کرسکتا کہ ایک انسان کی زندگی میں خوشی اور غم کا تعلق براہ راست خیالات اور تصورات سے قائم ہے۔ کوئی خیال انتہائی کربناک ہوتا ہے اور کوئی خیال ہمارے لئے مسرت آگیں ہوتا ہے۔ ڈر، خوف، شک، حسد، طمع، نفرت وحقارت، غرور وتکبر، خودنمائی وغیرہ وغیرہ خیالات کی پیداوار ہیں اور محبت، ایثار، یقین، انکساری اور حزن و ملال کا نہ ہونا بھی خیالات کی کارفرمائی ہے۔ بیٹھے بیٹھے یہ خیال بجلی کی طرح کوندتا ہے کہ ہمارے یا ہماری اولاد کے ساتھ حادثہ نہ پیش آجائے۔ جیسے ہی خیال کی یہ رو دماغ سے ٹکراتی

ہے آدمی اپنے اندر حادثات سے متعلق پوری پریشانیاں کڑی در کڑی محسوس کرنے لگتا ہے اور وہ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ یہی حال خوشی اور خوش حال زندگی کا ہے۔ جب انسانی تصورات ایسے نقطہ پر مرکوز ہو جاتے ہیں جن میں شادمانی اور خوش حالی کی تصویریں موجود ہوں، انسان خوش ہو جاتا ہے۔

خیالات میں اگر بے یقینی، شک اور وسوسوں کی بھرمار ہوتی ہے تو اس کے اندر روشنیاں مدھم ہو جاتی ہیں اور تصورات الجھن، اضطراب اور پریشانی کا جامہ پہن لیتے ہیں۔ ان کی افراط آدمی کو روح سے دور کر دیتی ہے اور روح سے دوری واقع ہونے پر آدمی کے اندر ایک متعفن پھوڑا بن جاتا ہے۔ اور جب یہ پھوڑا پھوٹ جاتا ہے تو اس کی سڑاند پھیلنے لگتی ہے۔ اللہ ہمیں اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ جب یہ صورت واقع ہو جاتی ہے تو یہ آدمی اس گروہ میں شامل ہو جاتا ہے جس گروہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ وَعَلٰی سَمْعِھِمْ وَ عَلٰی اَبْصَارِھِمْ غِشَاوَۃٌ وَّ لَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ مہر لگا دی اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر اور ڈال دیا پردہ ان کی آنکھوں پر اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے۔

کتاب ''لوح و قلم'' مصنف حضرت قلندر بابا اولیاءؒ میں درج ہے کہ انسان چھ لطیفوں سے مرکب ہے اور ہر دو لطیفوں سے ایک دائرہ بنتا ہے۔ یعنی انسان کی ذہنی اور روحانی صلاحیتوں کا دارومدار ان تین دائروں پر ہے۔ پہلے دائرے میں اللہ تعالیٰ کی مشیت اور تسخیر کائنات کے فارمولے نقش ہیں۔ دوسرے دائرے میں حیات بعد الممات کی تشریح ہے اور تیسرا دائرہ ان اعمال و حرکات کی تشریح کرتا ہے جن سے زندگی سرگرم عمل ہے۔ روح کے دائرے کی وضاحت کرتے ہوئے حضرتؒ لکھتے ہیں:۔

''اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ انسان ناقابل تذکرہ شئے تھا۔ پس ہم نے اس کے اندر اپنی روح ڈال دی اور یہ دیکھتا، سنتا، چکھتا، محسوس کرتا اور عمل حرکت سے مرکب انسان بن گیا۔''

روح کیا ہے؟......قرآن حکیم میں اس کی وضاحت موجود ہے:

''تجھ سے سوال کرتے ہیں کہ روح کیا ہے، تو کہہ دے روح میرے رب کے امر سے ہے۔''

امر کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''اس کا امر یہ ہے کہ جب وہ ارادہ کرتا ہے کسی چیز کا تو کہتا ہے ''کُن'' اور وہ ''فیکون'' ہو جاتی ہے۔''

قرآن کریم کی ان آیات میں تفکر کیا جائے تو یوں کہا جائے گا:

انسان ناقابل تذکرہ شئے تھا۔ اس کے اندر روح ڈال دی گئی تو زندگی دوڑنے لگی اور روح امر رب ہے اور امر رب یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے کن اور وہ فیکون ہو کر مظہر بن جاتی ہے۔ زیادہ آسان الفاظ میں اس بات کو اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے:

انسان روح ہے۔ روح امر رب ہے اور امر رب اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہے اور یہ ارادہ وجہ تخلیق کائنات ہے۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے فرمانے کے مطابق اللہ تعالیٰ کی روح ہے لیکن بظاہر کتنا مجبور و لاچار ہے۔ مجبور و لاچار ہونے کی وجہ بجز اس کے کچھ نہیں کہ ہم علم کتاب سے ناواقف ہیں۔ یہی ناواقفیت وہ متعفن پھوڑا ہے جس نے ہمیں تسخیر کائنات کے فارمولوں سے محروم کر دیا ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم قرآن پاک میں تفکر کر کے اس گم کردہ راہ کو تلاش کریں اور اللہ تعالیٰ کے انعامات و اکرام سے فیض یاب ہو کر سرفرازی اور سربلندی حاصل کریں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اُسوۂ رسول مقبول ﷺ پر گامزن رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔

امین یارب العالمین!

☆☆☆

”کمزور بچے کیوں“

سوال: دنیا میں بہت سارے بچے معذور پیدا ہوتے ہیں۔ پیدائشی طور پر معذور بچوں میں نقص کیوں ہوتا ہے۔ کیا ان کی روح میں کمی ہوتی ہے......؟ یا ماں کے اندر کوئی کمزوری ہوتی ہے۔ اگر ماں کی کمزوری سے بچوں میں نقص ہوتا ہے تو بہت کمزور اور بیمار ماؤں کے بچے کیوں صحت مند ہوتے ہیں...... ایسا بھی ہوتا ہے کہ ماں ہڈیوں کا ڈھانچہ ہوتی ہے اور بچے خوب موٹے ہوتے ہیں۔

جواب: ابدال حق حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے ”تذکرہ بابا تاج الدین ناگپوری“ میں اپنے نانا صاحبؒ کی ایک کرامت کی توجیہہ بیان کی ہے۔

”ایک لنگڑا نوجوان شفا خانے میں آ کر ٹھہر گیا یہ شفاخانہ بھی مسجد اور مدرسے کی طرح پھونس کی جھونپڑیوں پر مشتمل تھا۔ لنگڑا صبح کھا پی کر شفاخانے سے چلتا اور نانا تاج الدین کے سامنے آ بیٹھتا۔ سلام کر کے لنگڑی ٹانگ پھیلا کر اپنا ہاتھ پھیرنے لگتا اور ایسا منہ بناتا کہ جیسے بڑی تکلیف میں ہے۔ نانا ”ہوں“ کہہ کر چپ ہو جاتے۔ اس طرح دو مہینے گزر گئے۔ لنگڑا تھا بڑا اڑیل، اپنے معمول پر قائم رہا۔ ایک روز غصے میں بھرا ہوا آیا اور نانا کی طرف دیکھ کر بڑبڑانے لگا۔ ”خدا نے مجھے لنگڑا کر دیا جن کی ٹانگیں ہیں ان کو کچھ احساس نہیں ہوتا۔ سنا تھا کہ خدا کے یہاں انصاف ہے۔ انصاف کو بھی جھنجوڑ کر دیکھ لیا۔ لوگ خدا خدا پکارتے ہیں لیکن ......خدا والوں کو بھی دیکھ لیا۔ یہ بھی سب گونگے بہرے ہیں۔ خدا اور خدا والوں سے تو میری بیساکھی اچھی ہے سہارا تو دیتی ہے۔“

نانا اس کی باتیں سن کر جھنجھلا گئے۔ اور چیخ کر بولے ”جادفان ہو جا۔ بھلا چنگا ہو کر لنگڑا بنتا ہے۔ جھوٹا کہیں کا“ اور یہ کہہ کر لنگڑے کو مارنے کے لئے دوڑے۔ لنگڑا بیساکھی چھوڑ کر بھاگا۔ اب اس کی لنگڑی ٹانگ بالکل ٹھیک ہو چکی تھی۔

انسان علی شاہ، نانا تاج الدینؒ کے فیض یافتہ تھے۔ ان کو روحانی علوم پر عبور تھا اور سوچنے

کی طرزیں بھی نانا سے ملتی تھیں۔ انہوں نے نانا کی حیات میں ترک وطن کر کے شکر درہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ایک دن لنگڑے کا واقعہ زیر بحث آ گیا۔

انسان علی شاہ کہنے لگے ”اس واقعہ کی توجیہہ مشکل نہیں۔ یہ سمجھنا کہ کائنات ارتقائی مراحل طے کر رہی ہے غلط ہے۔ یہاں ہر چیز صدوری طور پر ہوتی ہے۔ وقت صرف انسان کی اندرونی واردات ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کوئی شے اندرونی واردات کی حد سے باہر نہیں۔ تغیر اور ارتقاء کے مرحلے اندرونی واردات ہی کے اجزاء ہیں۔ یہ واردات ہی نوعی سراپا کی نقلیں افراد کی شکل و صورت میں چھاپتی ہیں۔ چھپائی کی رفتار معین ہے۔ اسی رفتار کا نام وقت ہے۔ اگر اس رفتار میں کمی بیشی ہو جائے تو لنگڑا، لولا، اندھا چھپنے لگتا ہے۔ حوادث اس طرح رونما ہوتے ہیں۔ جب عارف کا ذہن ایک آن کے لئے صدوری کیفیت میں داخل ہو جاتا ہے تو یہ بے اعتدالیاں دور ہو جاتی ہیں اور لولے لنگڑے بھلے چنگے ہو جاتے ہیں۔

